

مارشل لا دور میں جس کی اشاعت ممنوع تھی !!

اگر مجھے قتل کیا گیا....

ذوالفقار علی بھٹو



شہید ذوالفقار علی بھٹو کی کتاب جو پھانسی کی کوٹھڑی میں لکھی گئی !

جنرل ضیاء الحق کے مارشل لا اور سیاسی حالات کا چونکا دینے والا تجزیہ اور انکشافات !!!

SUPPORT US!
TO HELP US IMPROVE
KITAABIYAT

“

[Ads by Google](#)

[Urdu Novels](#)

[Funny SMS](#)

[K187](#)

[Send SMS](#)

[Urdu Poems](#)

JAN 21, 2010

”

visit <http://urdulibrary.paigham.net/>

for all type of books

and visit <http://quraniscience.com/>

to read scientific Facts in Quran

YEAH ONLY YOU CAN DO IT...

TELL OTHERS ABOUT US & KEEP VISITING FOR
DOWNLOADING THE BEST URDU LITERATURE, ON THE NET.

visit <http://quraniscience.com/> to read scientific Facts in Quran



اگر مجھے
قتل
کیا گیا ...!

Kitaabiyat.blogspot.com

ذوالفقار علی بھٹو شہید

اگر مجھے قتل کیا گیا۔!

فہرست

vii

پیش لفظ

- 1 (۱) قرطاس امیض یا سفید جھوٹ
- 2 پیرا II تعارف
- 9 (۲) جھوٹ کا طومار
- 15 خانہ جنگی کا سایہ
- 19 دی رول ملٹری پر اہم
- 25 (۳) وار فیئر — انتخابی دھاندلی اور فراڈ
- 29 ڈس کوالی فیکشن ٹریبونلز
- 34 پنجاب کا منظر نامہ
- 37 (۴) الیکشن کمیشن
- 43 موجودہ چیف
- 61 (۵) حکومتی مشین
- 66 انٹیلیجنس ایجنسیز
- 75 ایج بنانے والے
- 81 (۶) لاڑکانہ پلان
- 90 ایک صاف ستھری، منصفانہ لڑائی
- 101 (۷) انتخابات میں بدعنوانی یا منصفانہ رویہ
- 108 استقام کی بو
- 115 پختون خواہ
- 121 چاندیو سردار

پیش لفظ

بھٹو کی کتاب ”مگر مجھے قتل کیا گیا.....“ کا اردو ترجمہ آپ کے ہاتھوں میں ہے۔
میں چاہتا ہوں کہ اس ترجمے سے پہلے قارئین کرام میری چند ضروری معروضات کو ضرور پڑھ
لیں۔

ایک عرصے سے اس کتاب کا شہرہ رہا ہے۔ یہ کتاب بھٹو مرحوم نے جیل کی اس کوٹھڑی
میں لکھی جو ان لوگوں کے لئے مخصوص کی ہوئی ہے جنہیں موت کی سزا دی گئی ہو اور اوپنڈی جیل
میں موت کی وہ کوٹھڑی جہاں شہید بھٹو نے اپنی زندگی کے آخری ایام گزارے اور یہ کتاب
کاغذوں کو گھٹنوں پر رکھ کر مکمل کی کہ انہیں وہاں لکھنے پڑھنے کی سہولتیں حاصل نہیں تھیں۔
سمسار کی جابجی ہے لیکن یہ موت کی کوٹھڑی لازوال ہو چکی ہے۔ مٹی اور اینٹوں سے بنی ہوئی وہ
کوٹھڑی تو مارشل لاء کے حکمران نے اپنی زندگی کے آخری دنوں میں سمسار کروادی۔ لیکن
اس کوٹھڑی میں لکھی گئی یہ کتاب موت کی اس کوٹھڑی کو ہمیشہ زندہ رکھے گی۔

اردو اور غیر ملکی زبانوں میں جیل میں لکھی جانے والی کتابوں کی تعداد خاصی ہے اور ان
میں سے بعض کو دائمی اہمیت اور شہرت بھی حاصل ہوئی ہے۔ جیسا کہ حوالے سے بھٹو
مرحوم کی یہ کتاب ان زندہ رہنے والی کتابوں میں ایک پیش بہا اضافہ ہے۔

ایک عرصے تک اس کتاب کو دیا گیا۔ پاکستان میں یہ کتاب جنرل ضیا الحق کے حکم سے
ممنوع قرار دی گئی۔ اسے شائع کرنا جرم تھا۔ اسے فوٹو سٹیٹ اور دستی شعل کی صورت میں
رکھنا پڑھنا اور شائع کرنا ایسا جرم تھا جس کی سزا کوڑے اور جیل کی کوٹھڑی ہو سکتی تھی۔ ایک دو
ایسے پریس جہاں اسے شائع کرنے کی کوشش کی گئی وہاں چھاپے پڑے۔ ان کے مالکوں کو
گرفتار کر کے تشدد کا نشانہ بنایا گیا اور پریس بھی ضبط کر لئے گئے۔

جنرل ضیا کے مارشل لاء کے دور میں مرحوم بھٹو کی زندگی میں مرحوم بھٹو کی کردار کشی اور
سپریم کورٹ میں ان کی اپیل کی سماعت کو متاخر کرنے کے لئے فوجی ٹولے نے یہ منصوبہ بنایا کہ
فوجی حکومت کی طرف سے ان کے اور ان کی حکومت کے خلاف وائٹ پیپر شائع کئے جائیں۔ یہ
ایک گھناؤنی چال تھی۔ جان لیوا دشمنی بھڑی ہوئی نہیں تھی بلکہ اس کے ذریعے سپریم کورٹ کے

131	(۸) اندر کا سرطان
136	فوج سیاست میں
147	(۹) خارجی بحران
148	(۱) پاکستان افغانستان تعلقات
156	(ب) پاکستان بھارت تعلقات
155	(ج) غیر جانبدار کانسفرنس
158	(د) نیوکلیر ری پروسیسنگ
167	(۱۰) موت کی گھنٹی
174	دو غلطیوں سے ایک سچ نہیں بنتا
187	(۱۱) غیر ملکی ہاتھ
207	بختیار فارمولا
223	(۱۲) پھانسی کی کوٹھڑی اور تاریخ
228	سبق جو سیکھا جاسکتا ہے
239	(۱۳) وقت ختم ہو چکا ہے
248	قصور کا قتل
256	عظیم ترین کامیابی
262	خدا کرے یہ غلط ثابت ہو
267	نتیجہ

جوں پاکستان کے عوام اور عالمی رائے عامہ کو بھی گمراہ کرنا مقصود تھا۔ بھٹو مرحوم نے مارشل لاء حکومت کی طرف سے شائع، جاری اور تقسیم کئے جانے والے دواوائٹ پیپرز کا جواب اس کتاب میں دیا ہے۔ اس کے بعد تین جلدیں مزید شائع ہوئیں۔ بن کا جواب بھٹو مرحوم نہ دے سکے کیونکہ ان کی زندگی کی ڈوری پھانسی کے پھندے کے ذریعے کاٹ دی گئی تھی۔

بھٹو مرحوم نے مارشل لاء حکومت کی طرف سے مرتب کردہ ان واٹ پیپرز کی ان دو جلدوں کا جواب سپریم کورٹ میں پیش کرنے کے لئے لکھا تھا۔ سپریم کورٹ نے اس اہم دستاویز کو کوئی اہمیت نہ دی۔ ایسا کیوں ہوا یہ ایک الگ موضوع ہے اور اس کے مضمرات بھی اب ڈھکے چھپے نہیں رہے۔ بہر حال مارشل لاء حکومت کی پوری مشینری حرکت میں آگئی کہ بھٹو مرحوم کے اس جواب کو دیا اور نیست و نابود کر دیا جائے اپنی جگہ پر طرز عمل کتنا گھٹاؤنا ہے اس کے بارے میں کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ قدم قدم پر اسلام کا نام لینے والے اور قرآنی آیات پڑھنے والے جنرل ضیا الحق کو یہ سیدھا سادہ انسانی اخلاقی، مذہبی اور قانونی اصول یاد رہا کہ ملزم کو جواب دینے کا ہر طرح کا حق حاصل ہوتا ہے اور اسے اس حق سے محروم کرنے والا دین و دنیا دونوں لحاظ سے خود بہت بڑا مجرم اور گناہگار ہوتا ہے۔

تمام تر باندیوں کے باوجود بھٹو مرحوم کی اس آخری تحریر کے حصول کے لئے پاکستانی عوام جدوجہد کرتے اور متجسس رہے۔ فوٹو سٹیٹ کاپیوں کی صورت میں یہ خفیہ طور پر پڑھتی جاتی رہی۔ یہ فوٹو سٹیٹ کاپیاں نامکمل اور ناقص تھیں دوسری طرف پڑوسی ملک بھارت میں اس کتاب کو موقع پرستوں اور تاجروں نے اپنے انداز میں استعمال کیا۔ اس اہم ترین تحریر کے ناقص اور نامکمل اردو ترجمے ہوئے انہیں بڑے ناقص انداز میں شائع کیا گیا۔ انگریزی میں بھی اسے بہت سے ناشرین نے ادھر ادھر ہی شائع کر کے پڑھنے والوں کے تجسس اور ذوق کا مالی استحصال کیا۔

اس ترجمے کی صورت میں پہلی بار بھٹو مرحوم کی اور جنرل تحریر کا مکمل اور پورا اردو ترجمہ پیش کیا جا رہا ہے۔ یہ ترجمہ مستند کتاب سے کیا گیا ہے جو بھٹو مرحوم کی ہی اپنی تحریر تھی اس میں کوئی شبہ نہیں کیا جاسکتا۔

جب بھٹو مرحوم نے یہ تحریر راولپنڈی جیل کی موت کی کوٹھڑی میں لکھی اور اب جب اس کا پہلا ترجمہ آپ تک پہنچ رہا ہے تو وقت کے پلوں کے نیچے سے بہت سے پانی تیزی سے بہہ چکا ہے۔

جنرل ضیا الحق اپنے خوفناک انجام سے درچار ہو چکا ہے۔ ملک میں جمہوریت کی حکمرانی ہے اور بھٹو مرحوم کی صاحبزادی محترمہ بے نظیر بھٹو کے ہاتھوں میں ملک کی قیادت آچکی ہے۔

یہ ایک علیحدہ موضوع ہے کہ محترمہ بے نظیر بھٹو کو پاکستان کی قیادت 1988 میں ملی تو اس وقت کا پاکستان اس وقت 1970 کے پاکستان سے بھی زیادہ شکستہ اور کمزور حالت میں ہے جب جناب بھٹو نے ملک کی قیادت سنبھالی تھی۔ بہر حال ایک عظیم چیلنج ہے۔ جس کا سلنا محترمہ بے نظیر بھٹو کرنا پڑ رہا ہے۔

بھٹو مرحوم کی اس آخری طویل اور مکمل تحریر کا ترجمہ بذات خود ایک کرنٹنگ تجربے کی حیثیت رکھتا ہے۔ قارئین بھی جب بھٹو مرحوم کی اس تحریر کو پڑھیں گے تو بہت درد کرب اور بے چینی محسوس کئے بغیر نہ رہ سکیں گے۔

”مگر مجھے قتل کیا گیا....“ ایک عہد تاریک کا آئینہ ہے۔ جس میں ایک دور اپنی تمام تر بھینٹیں شہیدوں کے ساتھ نظر آتا ہے۔ ہم تصور کر سکتے ہیں کہ بھٹو مرحوم یہ کتاب لکھتے ہوئے کس کرب سے گزر رہے ہوں گے۔ لکھنے پڑھنے کی سہولتوں کے فقدان کے باوجود انہوں نے یہ کتاب جس انداز میں لکھی ہے۔ یہ اپنی جگہ بڑا اہم کارنامہ ہے۔ بھٹو مرحوم اپنے ہی الفاظ کے مطابق ہمیشہ سے ایک شاعر اور انقلابی تھے یہ کتاب اس کا طرز اسلوب، اس کی تشریحات کرتے ہیں کہ بھٹو واقعی ایک شاعر اور انقلابی ہے۔ اس کتاب میں شہریت اور انقلاب کا ایک ایسا امتزاج ملتا ہے جس کی بہت کم مثالیں ملتی ہیں۔ طرز اسلوب۔ کسی مصنف کی اصل پہچان اور روح ہوتا ہے۔ اس میں انفرادیت حاصل کرنا۔ سب سے بڑی کامیابی سمجھی جاتی ہے۔ بھٹو مرحوم اس کتاب کی تشر اور طرز اسلوب کے حوالے سے اس کامیابی سے ہمکنار ہوتے ہیں۔

یہ کتاب پاکستان کی تاریخ کے نازک ترین دور کا تجزیہ ہے۔ اس سازش کا قصہ ہے جس نے ایک جمہوری حکومت کا تختہ الٹ دیا۔ اس میں ہمیں بہت سے چہرے دکھائی دیتے ہیں وہ چہرے جو اب بساط ہستی سے غائب ہو چکے ہیں اور اب بھی موجود ہیں۔ اس کتاب میں ایسے ایسے انکشافات ہوئے ہیں جن کا مطالعہ لرزاؤں کا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس کتاب کو ضیا الحق کے دور میں اس لئے بڑی سختی سے دیا گیا کہ بھٹو مرحوم نے جو انکشافات کئے تھے اس کا جواب نہیں دیا جاسکتا تھا۔

اس کتاب میں بھٹو کی عاقبت پوری شان سے جھلکتی ہے۔ ان علم تجربہ بے پناہ حافظہ اور بات کہنے کا اسلوب پورے عروج پر ملتا ہے ایک قانون دان اور عظیم عوامی سیاست دان کی حیثیت سے بھی یہ کتاب ان کا روشن پہلو جارے سامنے لاتی ہے۔ یہ کتاب ان کی بے پناہ ذہانت اور ذکاوت، ملک عوام کے ساتھ دردمندی کا ظاہر کرتی ہے۔ حالات اور آنے والے دنوں کا جس انداز سے وہ تجزیہ کرتے ہیں۔ اس پر میں اس لئے کچھ نہیں کہوں گا کہ 1978 میں لکھی جانے

(۱)

قرطاس ایض یا سفید جھوٹ

فوجی نوٹے کو اقتدار میں آنے ایک برس اور بیس دن ہو چکے ہیں (۵ جولائی ۱۹۷۷ء سے ۲۵ جولائی ۱۹۷۸ء تک جو قرطاس ایض کے جاری کئے جانے کی تاریخ ہے) اقتدار میں ظلم و تشدد کی تین سو پچاسی راتوں کے بعد نتیجے کے طور پر ایک ہزار پوا لیس صفحات پر مشتمل یہ دستاویز سامنے لائی گئی ہے۔ جس کے ساتھ تین سو بیالیس ضمیمہ جات شامل ہیں۔ قرطاس ایض کا جسم چار سو صفحات پر مشتمل ہے باقی تمام صفحات ان ضمیمہ جات پر صرف کئے گئے ہیں جن کے بارے میں کہا گیا ہے کہ یہ ریاستی / حکومتی دستاویزات ہیں اصل جسم اور متن انہی ضمیمہ جات کے ایک بد نما خاکے پر مشتمل ہے تعصب اور عناد پر مشتمل آراء دے کر اپنی مرضی سے استخراجی نتائج نکالے گئے ہیں۔

قرطاس ایض کے مطابق ۵ جولائی ۷۷ء کو حکومت کی تبدیلی کے فوری بعد چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر نے ایک انکوائری کمیٹی کا تقرر کیا تاکہ مارچ میں ہونے والے انتخابات کا گہرا جائزہ لے۔ کمیٹی مندرجہ ذیل افراد پر مشتمل تھی۔

(۱) بریگیڈیئر مسٹر عبدالنعیم۔۔ اتفاق دیکھیے کہ انہی کے بارے میں انٹیلی جنس بیورو کے سابق ڈائریکٹر راول محمد الرشید نے اپنے ایک بیان لکھی میں بتایا ہے، جو سپریم کورٹ میں پیش کیا تھا۔ ان سے اسی بریگیڈیئر نعیم نے پوچھا تھا۔

”کیا تمہارے خیال میں فوج یہ برداشت کر سکے گی کہ مسٹر بھٹو دوبارہ اقتدار میں آجائیں۔“

مسٹر رشید نے خاموشی اختیار کی تو بریگیڈیئر نعیم نے خود ہی اپنے سوال کا جواب یوں دیا۔

”یقیناً، فوج اسے نہیں چاہتی“

الوداعی طور پر اس نے راول رشید کو یہ مشورہ دیا پھر فرج کے ساتھ تعاون کیجیے یقیناً بریگیڈیئر نعیم کو علم تھا کہ اس طرف سے ان کی روٹی کو مکھن لگ سکتا ہے۔

والی اس کتاب نے آج 1989 تک بھٹو کے تجزیے اور بصیرت پر صداقت کی کئی مہر بس مثبت کر دی ہیں۔ بھٹو مرحوم نے معروضیت کو ہمیش نظر رکھا ہے۔ اپنی حکومت کی خامیاں بڑی دلیری سے ہمیش کی ہیں۔ خود احتسابی کا اظہار بے پناہ ہے ملتا ہے اور پاکستان کے مستقبل کے حوالے سے وہ ایک عظیم رہنما ہی نہیں بلکہ ایک سچے محب وطن پاکستانی کی حیثیت سے سامنے آتے ہیں۔ یہ کتاب سچے واقعات اور کرداروں کا دلچسپ لارزہ خیز اظہار کرتی ہے۔ جب بھٹو عوامی اور فلسفیانہ دانش کے امتزاج سے طرز کرتے ہیں تو ان کی تحریر کا حسن نگار کو موثر ہو کر سامنے آتا ہے۔ بھٹو کی طنز۔ بڑی طاقتور ہے۔ کیونکہ یہ طرز حقائق پر مشتمل ہوتی ہے۔

اس کتاب کا مطالعہ ایک بڑے تجربے کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کا ترجمہ کرتے وقت میں نے پوری کوشش کی ہے کہ بھٹو کا طرز اسلوب بھی میں جس حد تک ممکن ہو سکے اردو میں منتقل کر دیا جائے۔ اس کے علاوہ بعض ایسے امور جو بعد میں سامنے آئے ان کی بھی وضاحت کر دی گئی ہے۔ تاکہ قاری اس کتاب کے آئنے میں پوری تصویر دیکھ سکے۔

اس میں مجھے کس حد تک کامیابی ہوئی ہے اس کا فیصلہ پڑھنے والے ہی کر سکیں گے!!

22۔ اپریل 1989

لاہور۔

ستار طاہر

ہوں۔ بعض امیدواروں صوبائی حکومت کے ایک وزیر اعلیٰ نے مجھے اطلاع دی کہ ایسی انکوائریاں کئی مقامات پر بڑے پیمانے ہوئے انداز میں کی جارہی ہیں۔

ان اطلاعات کے حوالے سے جو مجھے مختلف اطراف سے مل رہی تھیں میں نے یہ سوال اقتدار اعلیٰ کی مینٹنوں میں اٹھایا۔ جن میں کچھ وفاقی وزراء چیف آف آرمی سٹاف کورپس کمانڈرز نے شرکت کی تھی۔ کورپس کمانڈرز صاف دکھائی دینے والی بے چینی کے ساتھ خاموش رہے چیف آف آرمی سٹاف نے بڑبڑاتے ہوئے کچھ مبہم اور پوری طرح نہ سنائی دینے والے الفاظ میں ایسی اطلاعات کی تردید کی جو مجھے ملی تھیں۔ اس کا حوالہ میں نے اپنے بیان حلفی میں دیا جو سپریم کورٹ میں منظم نصرت بھٹو کی آئینی درخواست کے ساتھ منسلک ہے جس میں مارشل لاس کے خفاذ کو پہنچایا گیا ہے۔

یہاں یہ نکتہ پیرا ہوتا ہے۔

(الف) گھیا فوج نے انتخابات کے بارے میں جو ابتدائی انکوائریاں کیں ان کا آغاز مارچ ۱۹۷۷ء کے فوراً بعد ہوا تھا؟

(ب) کیا اس انکوائری کمیٹی کا تقریباً ۵ جولائی ۱۹۷۷ء کی تبدیلی کے فوری بعد ہوا تھا؟

(ج) کیا کمیٹی نے ایک عہدہ کام واقعی مختصر عرصے میں مکمل کیا؟

کیا ”واقعی یہ قرطاس ایض دستاویزات پر مشتمل ہے جو حکومت کے ریکارڈز سے حاصل کی گئی جن کے بارے میں قرطاس ایض کا دعویٰ ہے کہ یہ اپنا اظہار خود کرتی ہیں اور یہ کہ یہ ان کی بنیادی کہانی ہے اور کہ صرف چند وضاحتوں کی ضرورت ہی محسوس ہوتی ہے۔ اگر ایسا ہے تو پھر ۲۰۰۰ قرطاس ایض کو چکا چوند کر دینے والی پبلشنگ کے ساتھ عوام کی آنکھوں میں جھونکنے کے لئے ۳۸۵ فوٹوں کا طویل عرصہ ۲۹ جولائی ۱۹۷۸ء تک انتظار کیوں کیا گیا؟ جس کا عربی ترجمہ بھی کرایا گیا۔ ۲۳ جولائی ۱۹۷۸ء کی رات کو ریڈیو نیلی ویژن پر قرطاس ایض کا ڈھنڈورا اس طرح پیشا گیا کہ پاکستانی پاکستان کے ہر گھر انے میں پوری سرعت کے ساتھ پہنچ جائے۔

وقت کا یہ مسئلہ مشکوک اور سازشناک ہے۔ میں پھر پوچھتا ہوں کہ آخرا ب کیوں؟ جبکہ سامرا مواد مہینوں پہلے دسترس اور فراہمی میں تھا تو اب کیوں؟ جبکہ ۵ جولائی ۱۹۷۷ء کو فوج کے ذریعے حکومت کا تختہ الٹنے کی کوئی وضاحت موجود تھی نہ ہی اس سلسلے میں کوئی جواز پیش کیا گیا کہ مارچ ۱۹۷۷ء کے انتخابات میں دھاندلی کی گئی تھی اس کے برعکس مختلف النوع وجوہات کو پہلے سامنے لایا گیا تھا۔

وزیراعظم کی تعریف کوٹھانکی گئی۔ جنرل ضیاالحق نے خود اپنی پہلی پریس کانفرنس ۱۴

(۱) مسٹر عبدالعزیز خاں، سیکرٹری پولیس فاؤنڈیشن۔

(۲) مسٹر لبن ہمایوں خان اولیس ڈی ایکشن کمیشن۔

(۳) لیفٹیننٹ کرنل محمد اسلم راجہ۔

اس کمیٹی کو چارج دیتے ہوئے یہ ذمہ داری طے کی گئی تھی کہ انتخابات کے درمیان جو بدعنوانیاں ہوتی ہیں ان کا جائزہ لے۔ قرطاس ایض اس کمیٹی کو یہ خراج تحسین پیش کرتا ہے کہ کمیٹی نے ”ایک عہدہ اور نفیس کا مختصر سے وقت میں کر دکھایا۔“

قرطاس ایض میں اگرچہ کمیٹی کے ارکان کے نام دیئے گئے ہیں۔ لیکن یہ نہیں بتایا گیا کہ اس کا سربراہ کون تھا۔

قرطاس ایض میں بیان کیا گیا ہے ”بنیادی طور پر قرطاس ایض کا ان دستاویزات پر انحصار کیا گیا ہے جو مسٹر زیڈ اے بھٹو، مسٹر رفیع رضا، بیپلز پارٹی کے انتخابات کے کئی انچارج سردار محمد حیات تمن سلیق وزیراعظم کے سیاسی مشیر وزیراعظم سیکرٹریٹ کے افسران انتہیلی جنس لیگنٹلٹوز، صوبائی وزراء اعلیٰ/چیف سیکرٹریوں کے دستخطوں سے پان کی طرف سے جاری کی گئی تھیں۔“

پیرا (II) تعارف

قرطاس ایض کے مطابق ”یہی ان کی بنیادی کہانی ہے دستاویزات اور فوٹو سٹیٹ خود ہی اپنا اظہار کرتی ہیں۔ محض چند وضاحتوں کی ہی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔“ جبکہ حقیقت یہ ہے کہ ۵ جولائی ۱۹۷۷ء کو حکومت پر طاقت سے قبضہ کرنے سے پہلے ہی چیف آف آرمی سٹاف نے فوجی افسروں پر مشتمل ٹیمیں ہر صوبے میں تشکیل دی تھیں کہ وہ مارچ ۱۹۷۷ء کے انتخابات کے بارے میں تحقیقات کریں اس کی اطلاع کم از کم مجھے ایک وزیر اعلیٰ نے خود دی تھی۔

ایسی ہی اطلاعات مجھے دوسرے ذرائع سے بھی ملی تھیں مثلاً وفاقی سیکرٹریٹ کے ایک ایڈیشنل سیکرٹری نے مجھے مطلع کیا کہ ایک صحافی مسٹر آئی، ایچ برنی، جو کبھی انگریزی ہفت روزہ ”آؤٹ لک“ کے ایڈیٹر تھے کی خدمات جنرل بیڈ کوآرٹرز نے حاصل کی ہیں کہ انتخابات کے امور میں تحقیق کریں قومی اسمبلی کے متعدد ارکان نے مجھ سے شکایت کی کہ فوجی افسران سے انتخابات کے بارے میں ہر طرح کے سوال کر رہے ہیں جیسے وہ کوئی خاص قسم کی انکوائری کر رہے

جولائی ۱۹۷۷ء کو کہا کہ میں ایک جرنیل اور بہادر لڑاکا ایک عظیم سیاست دان ہوں، اگر میں ایک ایسا آدمی ہوں جو تاریخ کا گہرا شعور رکھتا ہے اس نے مجھے ایک محب وطن ایک بہادر انسان قرار دیا اور کہا کہ اس کے دل میں میرے لئے بڑا احترام اور وقار ہے۔

چیف مارشل لائیڈ منسٹر نے واضح اور پر زور الفاظ میں بیان کیا کہ وزیراعظم نے مارچ ۱۹۷۷ء کے انتخابات میں کوئی دھاندلی نہیں کی اس لئے کہا وہ ایسے تمام الزامات کو بے معنی قرار دیتے ہیں کہ تمام حقوق میں دھاندلی ہوئی تھی۔ انہوں نے کہا کہ فوج کے پاس ثبوت موجود ہے کہ مسٹر بھٹو اس دھاندلی کے ذمے دار نہیں تھے۔ اس کے علاوہ یہ کہنا بھی غلط ہے کہ پی پی پی کی فتح دھاندلی کی وجہ سے ہوئی۔ اگر دھاندلی نہ بھی ہوتی تو بھی پارٹی جیت جاتی۔ اگر کوئی دھاندلی ہوئی تھی تو اس لئے کہا تھا یہ انفرادی سطح پر کی گئی تھی۔

(پاکستان ٹائمز، ۱۹۷۷ء - ۱۳)

آپریشن فیر پلے کا مقصد اور نصب العین یہ تھا کہ دونوں فریقین کی محاذ آرائی ختم کی جائے اور نوے دنوں کے اندر عام انتخابات کا انعقاد کسی قسم کے الزامات یا غلط کاموں کے بغیر کیا جائے (کیونکہ یہ ذمے داری انتخاب میں حصہ لینے والے، اور ووٹ دینے والے کی تھی، مسلح افواج کی نہیں) نیوز ویک بی بی سی اور یو پی آئی کو انٹرویوز دینے کے بعد یہ رپورٹ کیا گیا کہ جنرل ضیا الحق نے کہا تھا کہ میں نے بطور وزیراعظم پوری منصفاںد کوشش کی تھی کہ حزب اختلاف کے ساتھ معاہدہ ہو جائے اور حقیقت یہ ہے کہ مسٹر بھٹو جس حد تک رضامند ہو گئے تھے اس سے زیادہ کسی سیاست دان سے رضامندی ممکن نہیں جنرل ضیا الحق نے یہ بھی کہا کہ میرا واحد مقصد آزاد اور منصفاںد انتخابات کا انعقاد ہے جو اس برس اکتوبر میں ہوں گے۔ میں پختہ یقین دلاتا ہوں کہ میں اپنے اس پروگرام سے سرگردانی نہیں کروں گا۔ سرکاری انتظامیہ کے وہ افراد جو کسی طرح بھی اپنے مستقبل کے بارے میں پریشان ہیں میں یہاں انہیں یقین دلاتا ہوں کہ انہیں کسی انتقام کا نشانہ نہیں بنایا جائے گا۔

اس سے یہ صاف دکھائی دیتا ہے کہ پی پی پی اور پی این اے کے مذاکرات اور مفاہمت میں جو ڈیڈ لاک پیدا ہوا۔ وہی فوج کے ذریعے حکومت کا تختہ الٹنے کی وجہ بھی بتائی گئی۔ جبکہ حقیقت یہ ہے کہ معاہدہ ہونے والا تھا۔ پی این اے کی طرف سے اٹھائے جانے والے معمولی نکلت اگلے دن طے ہونے والے تھے یعنی۔۔۔ حکومت کا طاقت سے تختہ الٹنے کا دن۔ ۵۔

جولائی ۱۹۷۷ء بالآخر بات کہاں ختم کی گئی۔۔۔ یہ کہ پی پی پی پر الزام لگایا گیا کہ اس نے جانبری حربے اختیار کئے۔ جب کہ سچائی یہ ہے کہ دو ماہ سے کم عرصے ہی میں حکومت نے انتہائی اچھے ہوئے مسائل کو طے کر لیا جس میں نئے انتخابات کرانے کے لئے نئی مشینری کا اہتمام نظر بندوں کی رہائی اور دوسرے اہم انتظامی مسائل، پالیسی سے متعلق سوالات میں آئینی امور بھی شامل تھے۔ یہ مسائل چیف آف دی آر می مشاف کی طرف سے بلوچستان اور ٹیپ ٹرائل کے بارے میں ناراضماندی کے باوجود حل کئے گئے۔

اس کے برعکس اس واضح تضاد کو دیکھنے کہ ایک برس سے زائد عرصہ گزر چکا ہے اور پی این اے ابھی تک چیف مارشل لا کے موجودہ سیٹ اپ میں شرکت کے لئے رضامند نہیں ہوئی۔

جوں جوں وقت گزر گیا غیر قانونی طور پر اقتدار پر قبضے کے لئے نئے نئے جواز دریافت کئے جانے لگے۔ جن میں کچھ یوں ہیں

(i) خانہ جنگی کا خطرہ

(ii) اسلامی قوانین کا نفاذ

(iii) معیشت کی بحالی

(iv) مثبت نتائج کی یقین دہانی کی ضرورت وغیرہ

لیکن آخراں کیوں؟

میں ایک بار پھر یہ بات دہراؤں گا کہ آخراں ۲۴/۲۵ جولائی ۱۹۷۸ء کو یہ دستاویز کیوں جاری کی گئی ہے؟ یہی مواد تو جنوری ۱۹۷۸ء کے اوائل میں بھی شائع کیا جاسکتا تھا۔ اس وقت مواد زیادہ ہر محل اور مستند سمجھا جاتا لیکن بعد میں اس وقت کیوں؟ جیسا کہ متذکرہ بالا امور سے ظاہر ہوتا ہے کہ حکومت کا فوج کے ذریعے تختہ الٹنے کا یہ جواز ہی نہیں بنتا تھا کہ مارچ ۱۹۷۷ء کے انتخابات میں دھاندلی ہوئی تھی اور پھر بطور خاص۔۔۔۔۔

(ا) جبکہ مارچ ۱۹۷۷ء کے انتخابات دیگر واقعات کی بنا پر خارج ہو چکے تھے۔

(ب) جبکہ فوجی ٹولے نے ۱۸ اکتوبر ۱۹۷۷ء کو جو انتخابات کرائے تھے وہ بھی منسوخ ہو چکے تھے۔

(ج) جبکہ پوری دنیا کے مطالبات کے باوجود فوجی ٹولے نے نئے انتخابات کے انعقاد کے لئے کسی تاریخ کے اعلان سے انکار کر دیا تھا۔

(د) جبکہ فوجی ٹولہ بنیادی چھوڑی راہ سے اغوا کر کے ملحقہ عوام دشمن پالیسیوں کی طرف

کامزن ہے۔

(ر) جبکہ فوجی ٹولہ انتخابات کو صرف یہ اہمیت دیتا ہے کہ اس کے ذریعے مثبت نتائج حاصل کئے جائیں۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس موقع پر یہ سب کچھ ہونے کے بعد مارچ ۱۹۷۷ء کے انتخابات کی نام نہاد دھاندلی پر استعصا رکھیں کیا جا رہا ہے خود اپنے زخم کا علاج کیوں نہیں کر رہا؟ اس کا عمل اس کا گناہ اگر میں نے کوئی گناہ کیا ہے تو اس کے مقابلے میں زیادہ بڑا گناہ ہے۔ آخر جنرل اپنے آپ کو انتخابات سے بری الزمہ قرار دے رہا ہے وہ انتخابات کیوں نہیں کراتا؟ کیا اس نے مارشل لا نافذ کر کے یہ ظاہر کر دیا ہے کہ وہ ایک بہتر انسان ہے؟ آئین معطل کر کے ریپبلکنٹ اور صوبائی اسمبلیوں کو توڑ کر ۱۸ اکتوبر ۱۹۷۷ء کے عام انتخابات منسوخ کر کے اور انتخابات کے لئے کوئی تاریخ دینے سے انکار کر کے عوام کے ساتھ اس نے جو غموس وعدے کئے تھے انہیں توڑ کر سیاسی غائبانہ رویوں پر کڑی اور مکمل پابندی عائد کر کے جن میں ٹریڈ یونین سرگرمیاں بھی شامل ہیں کیا وہ یہ سمجھتا ہے کہ اس نے بہتر کارکردگی کا مظاہرہ کیا اور وہ بہتر انسان ہے؟ اس نے الزام تو لگایا ہے لیکن اس کا کوئی حل پیش نہیں کیا۔ جو حل اس نے پیش

قرطاس ایض کا موضوع ہے۔ دی کنڈیکٹ آن جنرل الیکشن مارچ ۱۹۷۷ء لیکن اس کا اصل مقصد زہریلے انداز میں مجھے ڈسنا ہے۔ اس صورت میں جبکہ اس کا موضوع انتخابات میں یہ بھی دیکھئے کہ

(ا) اگر تمام نہیں تو بیشتر دستاویزات، خواہ سچی ہیں یا جعلی ۳۴۲ ضمیموں کی صورت میں مارچ کے انتخابات سے تعلق رکھتی ہیں اور آغاز لاڈلہ پلان کے تحت کیا گیا ہے جو لندن پلان کے الٹ تازی اختراع ہے۔

(ب) اس بنا پر ہمایوں خان جو الیکشن کمیشن میں افسر بحار خاص ہیں کو اس انکوائری کمیٹی کے چار ارکان میں شامل کیا گیا۔ اس کمیٹی کے چیئرمین کے نام کو حذف کیا گیا ہے۔ دراصل یہ تین افراد پر مشتمل کمیٹی تھی کیونکہ خود قرطاس ایض کے بیان کے مطابق اس کے چوتھے رکن مسٹر عبدالعزیز خان سیکریٹری پولیس فاؤنڈیشن زیادہ عرصے تک اس کمیٹی کے ساتھ علی صورت میں شامل نہیں رہے۔

(ج) چونکہ قرطاس ایض کا موضوع انتخابات ہیں اس لئے الیکشن کمیشن کے لئے یہ ضروری تھا کہ واضح اور برتر صورت میں اس انکوائری میں شریک کیا جاتا۔

(د) قرطاس ایض کا باب دوئم الیکشن کمیشن کے چارٹر اور آئینی فرائض و امور اور چیف

الیکشن کمیشن کی ذمہ داریوں کا احاطہ کرتا ہے۔

(ر) الیکشن کمیشن کے سیکرٹری مسٹر اے۔ زیڈ فاروقی کے بیانات بھی متعدد مقامات پر ملتے ہیں۔ حسن اتفاق سے مسٹر اے زیڈ فاروقی مسٹر امین اے فاروقی کے خالہ زاد ہیں جن کی بیوی مسعود محمود کی بیوی کی بہن ہے۔ یہ سب اچھی طرح جانتے ہیں کہ مسٹر مسعود محمود میرے خلاف مقدمہ قتل میں بنیادی وعدہ معاف گواہ کی حیثیت رکھتے ہیں میری اطلاعات کے مطابق امین اے فاروقی نے مارشل لا حکام اور مسعود محمود کے درمیان اس کے وعدہ معاف گواہ دہنے سے پہلے درمیانی آدمی کا کردار انجام دیا یہ تعلقات بہت زیادہ گہرے ہیں۔

(س) پریس کو دئے گئے بیانات میرے نام لکھے گئے خطوط، میرے وزراء اور افسروں کے ساتھ ملاقاتوں الیکشن کمیشن کو خصوصی اختیارات دیئے جانے کے فیصلے، مارچ ۱۹۷۷ء کے انتخابات کے بعد شکایتیں درخواستیں جو الیکشن کمیشن نے فائل کیں الیکٹرول رول کو لاحدود کرنے کے بارے میں واقعات کا بیان سیکرٹری آف الیکشن کمیشن کے ساتھ بات چیت کا الزام وہ حوالے ہیں جو براہ راست چیف الیکشن کمیشن سے تعلق رکھتے ہیں جو قرطاس ایض میں پھیلے ہوئے ہیں اس میں کچھ شک نہیں کہ ایض کا اختتام الیکشن کمیشن کے الفاظ سے ہی ہوتا ہے۔

تاہم یہ خاصی حیران کن حقیقت ہے کہ مسٹر سجاد احمد جان کے اپنے مشاہدات یا بیانات جو اس انکوائری کمیٹی یا کسی بھی دوسری ایجنسی کے سامنے، جو اس قرطاس ایض کو تیار کر رہی تھی براہ راست نہیں اس دستاویز میں غائب ہیں اہم نوعیت کے وہ بیانات جو مسٹر سجاد احمد جان سے منسوب کئے گئے ہیں وہ مسٹر اے زیڈ فاروقی کے منہ سے نکلتے ہیں جو الیکشن کمیشن کے سیکرٹری ہیں مسٹر اے زیڈ ایک ایک احمدی لاہوری ہونے کے ناطے سے میری اور میری حکومت کی اس وقت سے مخالفت کر رہے ہیں جب پاکستان کی قومی اسمبلی نے ستمبر ۱۹۷۳ء میں احمدیوں کے بارے میں اپنا فیصلہ دیا تھا۔

(۲)

جھوٹ کا طومار

- قرطاس امین کے مرتبین واضح طور پر کسی دوسرے محرک کے زیر اثر نظر آتے ہیں جو کہ انتخابات میں دھاندلی کے الزام کے علاوہ ہے، اس کا ثبوت مندرجہ ذیل امور سے ملتا ہے۔
- (۱) قرطاس امین میں میرے سینئر ویل صفائی اور سابق انارنی جنرل یحییٰ بختیار کے انتخابات میں دھاندلی کے الزام پر ایک پورا اور جداگانہ باب موجود ہے۔ یہ نواں باب ہے جس کا عنوان ہے ”یحییٰ بختیار کا کیس“ جو صفحہ ۳۴۱ سے شروع اور ۳۸۱ پر ختم ہوتا ہے۔ وزراء کی ایک بڑی فوج، جو وفاقی اور صوبائی وزراء پر مشتمل ہے، قومی اور صوبائی اسمبلیوں کے تمام ارکان اور سینٹ، جو لگ بھگ ایک ہزار افراد بنتے ہیں، ان سب کو چھوڑ کر، صرف اس ایک فرد کے لئے خصوصی طور پر چالیس صفحات پر مشتمل ایک باب وقف کیا گیا ہے جو سپریم کورٹ میں میرے مقدمے میں میرا پرنسپل ڈیفینس کونسل ہے۔ اگر یہ واقعات کے لمبے بازو کا پھیلاؤ نہیں ہے تو پھر یہ پھیلاؤ کیا ہے؟
- (ب) اس دستاویز میں بڑی غیر شائستگی سے کردار کشی کی کوششیں کی گئی ہیں، جن کا معمولی سا تعلق بھی انتخابات اور ان میں ہونیوالی دھاندلیوں سے نہیں ہے۔ یہ عناصر دانستہ اس دستاویز میں شامل کئے گئے ہیں۔ اور یہ اس غیر متنازعہ اور عالمی سطح پر شہرت یافتہ میرے خلاف نفرت و عناد کی مہم کا حصہ ہیں۔ اس کی ایک مثال صفحات ۷۹ اور ۸۰ پر ملتی ہے جس میں میرے مشیروں میں سے ایک مشیر کے بیٹے کی تقرری کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس تقرری کا کوئی بھی تعلق انتخابات سے نہیں ہے۔
- (ج) قرطاس امین کے صفحہ ۲۵ پر مرقوم ہے۔ ”ایک بکارڈ کی ہوئی ٹی وی تقریر میں اس نے اللہ کی قسم کھا کر بھی یہ کہا کہ اس کا انتخابات کی بے قاعدگیوں میں کوئی ہاتھ نہیں۔ حالانکہ اس کے نتیجے میں چار ماہ تک قومی سطح پر احتجاج کیا گیا۔ خاصی انسانی جانوں اور املاک کا نقصان ہوا اور مارشل لا نافذ کیا گیا۔ دھاندلیوں کے لئے تیار کردہ ماسٹر پلیہ

اس صورت حال کی وضاحت وفاقی وزیر قانون ایس ایم مسعود نے قومی اسمبلی میں کی تھی۔ الیکشن کمیشن کو جو اختیارات دئے گئے تھے ان کی واپسی کا ذکر کرتے ہوئے دوسری چیزوں کے علاوہ وفاقی وزیر قانون نے کہا تھا:

”سر، جیسے کہ آپ جانتے ہیں یہ ایک ایک طرفہ پرو سچر تھا جو کہ چیف الیکشن کمیشن یا الیکشن کمیشن کے سامنے ہو رہا تھا۔ اس میں دوسرے فریق کو نمائندگی نہیں مل رہی تھی۔ حتیٰ کہ ریٹرنڈ امیدوار کو بھی یہ موقع فراہم نہیں کیا گیا تاکہ وہ اپنا نقطہ نظر اپنے کیس میں پیش کرے اور اس قابل ہو سکے کہ جو بے قاعدہ گایاں ہوئی ہیں وہ اس نے نہیں کی تھیں۔ (قرطاس ایض صفحہ ۲۰۱)

قرطاس ایض کے صفحہ ۲۵ پر میری تقریر کا حوالہ اور تبصرہ تین وجوہات کی بنا پر دیا گیا ہے:

(۱) جنرل ضیا الحق نے آج تک عوام سے جتنے وعدے کئے وہ ایک ایک کر کے سب توڑ دیئے حالانکہ یہ وعدے اس نے قرآن پاک کی آیات کی تلاوت کر کے کئے تھے۔ اس کے دوران عوام میں جو شدید رد عمل پیدا ہوا اسے کم کرنے اور دبانے کے لئے میرا حوالہ دیا گیا۔

(ب) لاہور ہائی کورٹ کے اس فیصلے کے جواب میں کہ میں ”ایک برائے نام مسلمان ہوں“ میں یہ کہنا چاہوں گا کہ اگرچہ میں نے پاکستان کے عوام کے ساتھ آج تک جو وعدہ کیا ہے اس کی وعدہ خلافی نہیں کی لیکن چیف مارشل لائیڈ منسٹر نے جو تقریر ۲۹ جون ۱۹۷۸ء کو کی، اس کے بعد یہ بالکل فراموش کر دیا کہ اس نے بھی کوئی وعدہ کیا تھا۔

(ج) قرطاس ایض میں میرے خلاف کئی بے بنیاد بہتان الیکشن کمیشن کے احمدی سیکرٹری مسٹر اے۔ زیڈ۔ فاروقی نے لگائے ہیں۔ تاکہ پڑھنے والوں کے ذہنوں میں میرے خلاف تعصب اور عناد پیدا کیا جائے۔ اس سلسلے میں ایک پُر فریب بہتان کی مثال قرطاس ایض کے صفحہ ۱۵۰ پر دیکھی جاسکتی ہے۔ جس میں یہ کہا گیا ہے کہ اس زمانے کے چیف الیکشن کمیشن نے اسے میرے ساتھ ہونے والی ٹیلی فون پر بات پیت سے آگاہ کیا۔ جس میں میں نے الیکشن کمیشن کی تشہیری مہم کے محرکات و اسباب پر اپنے غصے اور ناپسندیدگی کا اظہار کیا تھا۔ یہ پیرا گراف یوں ہے:

”ایک اور واقعہ جو مجھے یاد آ رہا ہے وہ الیکشن کمیشن کی پبلسٹی سے تعلق رکھتا ہے جو الیکشن کمیشن آزادانہ کر رہا تھا اور عوام کو تحریک دے رہا تھا کہ وہ اپنے ووٹ صحیح طریقے سے کاسٹ کریں۔ گت بھگ فرودی کے وسط میں مسٹر سجاد احمد جان نے مجھے مطلع کیا

پرنٹ کا اور پرنٹل مسودہ دریافت کیا گیا جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اس نے خدا کی جھوٹی قسم کھائی۔ خدا کے نام کے تقدس کو سیاست کی پالیسی پر قربان کر دیا۔

میں اب بھی اپنے بیان پر قائم ہوں۔ میں نے انتخابات میں دھاندلی نہیں کروائی۔ میں ان افراد کا ذمہ دار نہیں ہوں جنہوں نے اپنی اشتراکی حیثیت میں انتخابات میں بدعنوانیاں کیں۔ الیکشن کمیشن، الیکشن ٹریبونلز اور انتخابات کے قوانین جن میں عدالت ہائے عالیہ کے دائرہ اختیار میں شامل رٹ درخواستیں شامل ہیں۔ ایسے تمام مقدمے ہیں اس کا جواب تلافی اور انصاف فراہم کرتی ہیں۔ یہ یوزیشن پاکستان میں طے شدہ سے اور ہر مغیر اور دوسرے تمام ممالک جہاں جمہوری انتخابات کرائے جاتے ہیں وہاں یہی عمل رائج ہے۔ میں نے تو الیکشن کمیشن کو غیر معمولی اختیارات دیئے تاکہ وہ افراد کو ڈس کوالیفائی کر سکیں۔ میں نے قانون میں شق رکھوائی کہ الیکشن پینشن کو چھ ماہ کے اندر اندر لازمی طور پر منشا دیا جائے۔

قرطاس ایض کے صفحہ نمبر ۲۵۹ پر یہ تسلیم کیا گیا ہے کہ جلد شکایات کی تعداد ۱۵۰ تھی۔ یہ اچھی طرح جانتے ہوئے کہ شکست خوردہ امیدوار ایسے نکلے مواقع جیسے سرسری ڈس کوالیفیکیشن سے کتنا غیر ضروری فائدہ اٹھاتے ہیں اس سے قطع نظر اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اس کی یہ شکایت یا درخواست جائز تھی۔ ان میں بیشتر درخواستوں کو کوئی بھی مجاز ٹریبونل مسترد کر دیتا۔

کچھ عرصے کے بعد میں نے یہ خصوصی اختیارات اس لئے واپس لے لئے کہ بے معنی مبالغہ آمیز اور فرضی شکایتیں درج کرائی جا رہی تھیں۔ الیکشن کمیشن کو جو اختیارات دئے گئے تھے انہیں ہائی کورٹ میں اس بنا پر چیلنج کر دیا گیا کہ یہ اختیارات آئینی شکوک کے ساتھ مطابقت نہیں رکھتے۔ جن میں یہ کہا گیا ہے کہ کسی بھی انتخابات کا سوال ایک ایسے ٹریبونل کے سامنے ہی الیکشن پینشن سے اٹھایا جاسکتا ہے جو آئین کے تحت قائم کیا گیا ہو۔ اس کے علاوہ چیف الیکشن کمیشن نے ایک شکایت تو پی این این اے کے امیدواروں کے خلاف پی پی پی کے امیدواروں نے پیش کی تھی، قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ اور اس سے بھی اہم نکتہ یہ ہے کہ پی این این اے اس فیاضانہ دعوت کے باوجود انکرات پر باہمی تبادلوں کے لئے تیار نہ تھی۔

مزید برآں الیکشن کمیشن کو دیئے جانے والے خصوصی اختیارات کو واپس لینے کی ایک اضافی وجہ یہ بھی تھی کہ انتخابات کے بعد ان اختیارات سے شاکی افراد نے عدالت ہائے عالیہ میں رٹ پٹیشن دائر کر دی تھیں۔ جن میں ان غیر معمولی سماعت کے اختیارات کو چیلنج کیا گیا تھا۔

کہ وزیراعظم کو ہماری یہ آراؤں پر تشہیری مہم ناپسند ہے۔ مسٹر جان نے کہا کہ وہ اپنے تشہیری پروگرام کو معطل کرنے کے لئے تیار نہیں لیکن اس کا لہجہ نرم کر دیا جائے۔ اس سلسلے میں جو کارروائی کی گئی اس کا ملاحظہ کمیشن کی نوٹیفکیشن (ضمیمہ ۲۳۲) سے کیا جاسکتا ہے۔

بہر حال، اس نرم مزاج کی پینلٹی سے بھی مسئلہ محسوس ہوا۔ ۲۶ فروری ۱۹۷۷ء کو مسٹر سجاد احمد جان نے مجھے لاہور سے فون کیا کہ تمام پینلٹیز روک دی جائے۔ اسی روز ۲۶ فروری کو مجھے میرے پبلک ریلیشنز افسر نے بھی مطلع کیا کہ اسے مسٹر سجاد احمد جان نے لاہور سے ٹیلی فون پر بھی ہدایت صادر کی ہیں۔ ٹیلی فون پر اپنی گفتگو میں مسٹر جان نے مجھے بتایا کہ وزیراعظم متعدد بار ٹیلی فون پر ہماری پینلٹی کے بارے میں شکایت کر چکے ہیں۔ برسائے وہ ان سے سختی اور ناراضگی سے بات کرتے اور کہتے ہیں ”کیا آپ اپنی پینلٹی سے ہمیں تباہ و برباد کرنا چاہتے ہیں۔ تم مسلسل قائداعظم اور علامہ اقبال کے حوالے دے رہے ہو۔“

یہ ایک سفید بے بنیاد اور انتہائی گھٹیا خود تراشیدہ جھوٹ ہے۔ دراصل یہ ایک سازش ہے جس کے تحت پاکستانی عوام کے ذہنوں میں میرے لئے نفرت پیدا کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ ذرا اندازہ کیجئے میں نے ایسے ریمارک چیف الیکشن کمشنر کو کہے اور عام ٹیلی فون پر ایسے وقت میں دیئے تھے جب انتخابات کی مہم اپنے عروج پر تھی۔ اور اس کے رد عمل میں وہ بھی یہ گفتگو کھلے اور عام ٹیلی فون پر اپنے سیکرٹری کو بتا رہے ہیں۔ مسٹر سجاد احمد جان زندہ ہیں اور پاکستان میں دستیاب ہیں۔ اگر میں نے ایسے ہی گھٹناؤں سے سیاسی ریمارکس کھلے ٹیلی فون پر دئے تھے تو حکومت نے اسے کیوں طلب نہ کیا۔

اور پھر سیاسیات کے کس اصول کے تحت قائداعظم اور علامہ اقبال کے حوالے پر مشتمل پینلٹی ہمیں تباہ و برباد کر سکتی تھی؟ قیاس کو چتنا مرضی پھیلا کر دیکھیں ہمیں اس سے کیا نقصان پہنچ سکتا تھا؟ مبالغہ آرائی اور جھوٹ کی انتہا کر دی گئی ہے۔ یہ کسی قسم کے گھٹیا بہتان کی آخری اور انتہائی مثال ہے۔ میری حکومت کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ اس نے پورے وقار اور شایان شان انداز سے قائداعظم اور علامہ اقبال کے صد سالہ یوم پیدائش کا اہتمام کیا۔ پاکستان کا ایک منتخب اور عوام میں مقبول رہنما ہمیشہ اپنے ملک کے بانیوں اور زعماء کا بھرپور احترام کرے گا۔ صرف حکومت کا تختہ الٹنے والے غاصب اور غیر ملکوں کے ایجنٹ ہی ان عظیم سیاسی رہنماؤں کی مقبولیت سے حسد کر سکتے ہیں۔

مزید برآں قرطاس انٹض کے صفحہ ۲۲۳ پر یہ بات درج ہے کہ میرے جیسے تجربے والا شخص ایسی غیر ذمے داری سے ٹیلی فون پر گفتگو نہیں کر سکتا۔ یوں لکھا گیا ہے۔۔۔
”مسٹر بھٹو نے تمام قانونی / غیر قانونی سفارشات، جو اس نوٹ میں پیش کی گئی تھیں، رضامندی کا اظہار کر کے مسٹر رفیع رضا کو ان ریمارکس کے ساتھ بھجوا دیں۔
”یہ بہت ضروری اور اہم ہیں۔ آپ تمام متعلقہ افراد سے رابطہ قائم کریں اور ایک واضح ہدایت خفیہ ٹیلی فونوں پر دیں۔“

یہ حوالہ واضح طور پر ظاہر کرتا ہے کہ اگر میں اپنے وزراء کو یہ مشورہ دیتا ہوں کہ وہ ٹیلی فون کے بارے میں محتاط رہیں خود اس کے برعکس خود عمل نہیں کر سکتا۔ میں نے اس دنیا میں سب کچھ دیکھا ہے کہ عام ٹیلی فون پر خود کشی کرنے والے الفاظ کہے جاتے ہیں۔
مجھے یہ بتانے اور یاد دلانے کی قطعی ضرورت نہیں کہ عام کھلے ٹیلی فون پر بات کرنا ایسا ہی ہے جیسے کوئی عوامی جلسے سے خطاب کر رہا ہو۔

لاہور میں مقدمہ قتل ہو یا یہ قرطاس انٹض، ٹیلی فون نے میرے لئے موت کے فرشتے کا کردار انجام دیا ہے۔ استغاثہ نے میرے خلاف جو بنیادی اور قابل اعتماد گواہ پیش کیا ہے وہ یہی ٹیلی فون ہے۔ اگر کوئی جعلی دستاویز پیش نہیں کی جاسکتی اگر کوئی اپنے مطلب کا گواہ نہیں مل سکا کہ جو سراسر جھوٹ بول سکے تو پھر یہ ترکیب اختیار کر لی گئی۔ اسی نے مجھے ٹیلی فون پر بتایا تھا کہ میں ”مہم گرا دوں گا۔“

میں نے جو ریمارک مسٹر رفیع رضا کو خوش مزاجی سے ”مولوی“ پر دیا تھا، اس سے کوئی ملابھی شخصی طور پر مشغول ہو سکتا ہے۔ قرطاس انٹض کے صفحہ ۱۱۲ پر یوں بیان کیا گیا ہے:
”مسٹر رفیع نے اسے ان ریمارکس کے ساتھ مسٹر رفیع رضا کو بھجوا دیا۔“ یہ ہمارے ایک بھلائی چاہنے والے کی کوشش ہے۔ ہم اس پر کسی دوسرے مسئلے کا کہاں تک انحصار کر سکتے ہیں۔“

لیکن اسے پڑھنے کے بعد انہوں نے اپنی اس رائے پر فوری نظر ثانی کرتے ہوئے مسٹر رفیع رضا کے نام نوٹ میں ترمیم کر کے یوں اضافہ کیا: ”ہمیں نے متن پڑھا ہے، یہ کسی ملا کا لکھا ہوا ہے۔ اس سے زیادہ میں کچھ کہنا نہیں چاہتا۔“ انہوں نے لفظ ملا کے نیچے دوبار لکیریں کھینچیں۔ نیچے کہ ضمیمہ ۱۱۷ میں ہے، یہ شاید مسٹر اکرام اعظم کی ان کوششوں کا خاتمہ تھا جو حکمران جماعت اور راہ راست پر لانا چاہتی تھیں۔“

جیسا کہ میں بیان کر چکا ہوں قرطاس انٹض ۲۳۲ ایسی دستاویزات پر مشتمل ہے جو

خانہ جنگی کا سایہ

قرطاس ایض کا آغاز ہی سفید جھوٹ سے ہوتا ہے۔ پہلے ہی یہ اگراف میں کہا گیا ہے: ”مسٹر زیڈ اسے بھٹو کو صدر پاکستان اور پہلے سولین چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کے عہدے پر ۲۰ دسمبر ۱۹۷۱ء کو فائز کیا گیا۔ اور ۵ جولائی ۱۹۷۷ء کو وزیر اعظم کے عہدے سے ہٹا دیا گیا۔ دونوں وقوع نصف شب کے وقت ہوئے۔ ایک جنگ کے نتیجے میں اور دوسرا خانہ جنگی کے سائے میں۔ ان دونوں کے درمیان انہوں نے ملک کو جو ”مضبوط“ حکومت دی اس سے ان کے انتہائی مداح اور ہمدرد بھی انتہائی نہیں کر سکے۔“ فوج نے شاید حکومت کا تختہ الٹنے کے لئے اپنا فائر ۴ جولائی ۱۹۷۷ء کی نصف شب کیا ہو جو غامی گن کوپ دتیاں کی سازشی فطرت کے تحت تھا لیکن میں نے منتخب سولین صدر پاکستان کی حیثیت سے حلف ۲۰ دسمبر ۱۹۷۱ء کو لگ بھگ ساڑھے گیارہ بجے دن کی روشنی میں ایوان صدر راولپنڈی میں اٹھایا تھا۔ اس حکومت کے ڈی فیکٹو وزیر اعظم غلام اسحاق نے اس تقریب میں کیبنٹ سیکرٹری کی حیثیت سے شرکت کی تھی۔ اس شام میں نے صدر پاکستان کی حیثیت سے قوم سے خطاب کیا تھا۔

مارچ ۱۹۶۹ء کے مارشل لاء کی وجہ سے ملک اب بھی مارشل لاء کے تحت تھا۔ اسی لئے میرے لئے یہ مجبوری بن گئی کہ میں چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کے اضافی چارج کو بھی سنبھالوں۔ میں اس خلاء میں جو نیکی خان کے کوپ دی دتیاں میں قدم نہیں رکھا تھا بلکہ اس وقت موجود اور رائج قانون کے تحت قدم اٹھایا تھا۔ اس رول کے تحت جو سپریم کورٹ نے دو

سولیس میں دیا تھا۔ چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر اس وقت واحد قانون کا محافظ تھا۔ چونکہ میں خود مارشل لاء کا مخالف تھا اس لئے بطور صدر پاکستان اپنا عہدہ سنبھالنے کے چار ماہ کے اندر اندر عبوری آئین نافذ کیا اور ملک سے مارشل لاء اٹھالیا۔ اس کی مستند وجہ یہ تھی کہ ہم یہ سمجھتے تھے کہ مارشل لاء کوئی لا نہیں ہوتا۔ اور آئین کوئی الفور بحال کیا جائے۔ ہمارا ملک کیا آج خانہ جنگی کے قریب ہے یا اس وقت ۵ جولائی ۱۹۷۷ء خانہ جنگی کے سائے میں تھا اس کا فاصلہ تاریخ کرے گی۔

اپنی عوام دشمنی اور اس کے اثرات کے نتیجے میں موجودہ حکومت نے طبقاتی کشمکش کو ایسے مقام پر لا کھڑا کیا ہے کہ واپسی ممکن نہیں۔ اگر قرطاس ایض کو معلوم نہیں کہ کس طرح بسم اللہ کیا

حکومت کے ریکارڈ اور قانونوں کے مختصر تصویر کو پیش کرنے کے لئے چنی گئی ہیں۔ صریحاً یہ اس ارادے کے ساتھ پیش کی گئی ہیں کہ یہ دستاویزات، میرے خلاف جھوٹے الزامات ثابت کریں اور ان کو غلط اور باطل انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ مجھے مطعون کرنے کے لئے ان خصوصی دستاویزات کا انتخاب کیا گیا لیکن یہ انتہائی غیر اخلاقی کوشش بھی بے کار گئی کیونکہ یہ دستاویزات ایک دوسرے کے تضادات کو پیش کرتی ہیں۔

یہ دستاویزات تقاضا کرتی ہیں کہ انہیں دوسری دستاویزات کے ساتھ ملا کر پڑھا جائے۔ اس کے باوجود یہ دستاویزات عیاں کرتی ہیں کہ ہجے کو دیا لکھا اور تباہ کیا گیا ہے۔ اس کی ایک مثال یوں ہے کہ میں نے تمام متعلقہ محکموں کو ایسے ڈائریکٹو جاری کئے ہیں میں ہر اہمیت دی گئی تھی کہ انتہائی میں مکمل غیر جانبداری کو ملحوظ رکھا جائے۔ میں نے یہ انتہاء بھی کیا تھا کہ ہر عنوانی کو کسی طرح برواشت نہیں کیا جائے گا۔ لیکن ان دستاویزات میں سے ایک دستاویز بھی یہاں پیش نہیں کی گئی۔ وہ تمام دستاویزات جو میری حکومت کے حق میں جاتی ہیں انہیں جلا دیا گیا۔

ان ضمیموں کے ذریعے جو گمراہ کن تشریح پیش کی گئی ہے۔ اسے آسانی سے سمجھنا کسی بھی قاری کے بس میں نہیں۔ قرطاس ایض کے مصنفین نے اپنی من مانی تشریح و تعبیر کی ہے۔ جو ان دستاویزات سے مطابقت نہیں رکھتی۔ جو خلاصہ بنتا ہے اس کا مقصد صرف اور صرف یہ ہے کہ پڑھنے والوں کے دلوں میں میرے لئے عناد پیدا کیا جائے۔ جیسا کہ قرطاس ایض میں دعویٰ کیا گیا ہے کہ یہ دستاویزات خود بولتی ہیں تو اگر ایسا ہوتا تو پھر ان منتخب دستاویزات کی گمراہ کن جھوٹی اور بے بنیاد تشریح کرنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ اور نہ ہی مسخ شدہ خلاصے پیش کرنے کی ضرورت محسوس ہوتی۔ اگر کوئی ضرورت پڑتی تو صرف اتنی کہ ان دستاویزات کو ہی پورے طور پر پڑھ لیا جاتا۔ لیکن ایسا دانستہ نہیں کیا گیا۔ یہ دہری مشقت اس لئے کی گئی کہ ان معذور اور نامکمل ضمیموں پر نقاب ڈالا جاسکے۔ قانون کی زبان میں اسے یوں کہا جائے گا کہ نیلی پنسل کا استعمال کیا گیا۔ اور انصاف کی زبان میں یوں کہا جائے گا کہ غیر قانونی مشکوک حرکت کی گئی۔

جاتا ہے اور ایک کافر نوٹ سے شروع ہوتا ہے تو پھر بہت پرستی میں منتقلی میں ناکام ہے۔ اسی کا آغاز ہی جھوٹ سے ہوا ہے اور یہ جھوٹ جاری دستاویز میں کارفرما ہے۔ ایسا کبھی نہیں ہو سکتا کہ آپ مذموم جھوٹ سے آغاز کریں اور اسے تابناک صداقت پر ختم کر سکیں۔

ایک اور جھوٹی، غیر ایماندارانہ اور گمراہ کن چال یہ چلی گئی ہے کہ تمام اطراف سے جمع کئے جانے والی جھوٹی باتوں کو اپنے انداز میں پیش کیا گیا ہے کہ پڑھنے والا یہ یقین کر سکے کہ یہ سب نظریات اور آراء میری ہیں۔ خوش قسمتی سے ایسے کافی اور مناسب تشادات اس غیر اخلاقی طرز عمل کو نمایاں کرنے کے لئے ہر سطح پر آگئے ہیں۔ جن سے یہ عاجز ذلیل ہو جاتا ہے۔ حتیٰ کہ وہ آراء و نظریات جنہیں میں نے یکسر رد کر دیا تھا اس میں تبدیلی کر کے میرے لکھائے والے لیا گیا ہے۔ ہماری زرخیز وادی سندھ کے سرکاری اور غیر سرکاری افراد کے ذہنوں میں جو بھی خیال پیدا ہوتا ہے میں نہ اس کا خالق ہوں اور نہ ہی اس کا ذمے دار ہوں۔ خود قرطاس ایضاً یہ بیعت پیش کرتا ہے کہ میں نے اپنے ہی سرکاری افسروں کی سفارشات کو یکسر رو کر دیا اور ان سے اتفاق نہیں کیا اور سیاسی تجاؤز اور سفارشات کو ناپسند کیا۔

چونکہ اس ضخیم جلد کو جھوٹ اور مخ شدد حقائق سے مزید ضخیم اور فرہ کیا گیا ہے۔ اس لئے اس کی غلط نمائندگی اور ترجمانی کے جواب میں کچھ مثالیں پیش کرنے کی ضرورت ہے۔ صفحہ ۱۶ پر شرق (M) میں بیان کیا گیا ہے کہ سب کچھ کرنے کے بعد انتخابات کے انعقاد کا اعلان ایسے وقت میں کیا جائے جبکہ اعلان اور انتخابات کے انعقاد کے مابین ممکن حد تک کم سے کم وقفہ ہو۔ یہ اس لئے ضروری ہے کہ ہماری جمہوریت ابھی طفولیت کے عالم میں ہے۔ اور کوئی بھی نہیں چاہے کہ درمیانی وقفہ دے کر ملک میں آگ لگا دی جائے۔

میں نے اس تجویز کے ساتھ اتفاق نہیں کیا تھا۔ حالانکہ حکمران جماعت اسے قبول کر کے سب کچھ حاصل کر سکتی تھی۔ اس کے برعکس میں نے وزارت خارجہ کو ہدایت دی کہ مجھے اطلاع دی جائے کہ بھارت میں انتخابات کے لئے کتنا وقت دیا گیا ہے۔ ضمیمہ ۱۰۔ ۲۰ A جو قرطاس ایضاً میں دیا گیا ہے اس میں وزارت خارجہ کا جواب شامل ہے۔ اس ضمیمے میں جو علی حصہ ہے اس کا متن درج ہے: ”انتخابات کے اعلان اور ان کے انعقاد کے مابین اوسط وقفہ تخمیناً چار سے بارہ ہفتوں کا ہے۔“

اگر بھارت جیسا بڑا ملک اپنے عام انتخابات چار سے بارہ ہفتوں کے اندر مکمل کر سکتا ہے تو میری حکومت نے مارچ ۱۹۷۷ء کے انتخابات کے لئے آٹھ ہفتوں کا جو وقفہ دیا اس پر اعتراض۔

نہیں کیا جاسکتا۔ حجم اور آبادی کے اعتبار سے ہمارا ملک بھارت کے صوبہ اتر پردیش کے برابر ہے۔ اگر چار ہفتوں کے اندر اندر بھارت جیسے طویل و عریض ملک میں منصفانہ انتخابات کے لئے وقفہ دیا جاسکتا ہے تو پاکستان میں انتخابات کے لئے آٹھ ہفتوں کے وقت پر کوئی اعتراض نہیں کر سکتا۔ آٹھ ہفتوں کی یہ انتخابی مہم اتنی آزادانہ منصفانہ تھی کہ جیسے جنم کے سب دروازے کھل گئے ہیں۔

”جب مجھے یہ مشورہ دیا گیا کہ میں ٹیکس نادہندگان اور زرعی اصلاحات کے نفاذ میں نرمی برتوں تو میں نے رد کیا میں یہ کہا تھا۔ ”وزیر خزانہ سے زبانی بات کریں لیکن نادہندگان کو بچھلنے کی اجازت نہ دی جائے۔“ قرطاس ایضاً کے صفحہ ۱۸ پر یہ حوالہ ظاہر کرتا ہے کہ میں نے نرمی سے اس تجویز کو رد کر دیا تھا۔

اور پھر صفحہ ۲۰ پر دیکھیں جہاں بتایا گیا ہے کہ جب میرے سپیشل سیکرٹری نے اطلاعات کے مشیر کے ساتھ اس نکتے پر اتفاق کیا کہ جہاں تک ممکن ہو سکے حزب اختلاف کے رہنماؤں کو ریشہ اور بی وی پر آنے کا موقع نہ دیا جائے۔ ”تو خود قرطاس ایضاً تسلیم کرتا ہے کہ: ”بہر حال مسٹر بھٹو نے فیاضی کا ثبوت دیتے ہوئے اس سے اختلاف کیا اور کہا ”ہمیں ان رہنماؤں کو بچھ وقت ضرور دینا چاہئے۔ معقول حد تک وقت۔“

یہاں اس حقیقت کا ظہار ضروری ہے کہ میرے سپیشل سیکرٹری کو یہ تجویز مسلم لیگ کے امیدواروں نے پیش کی تھی۔ وہی مسلم لیگ جو اب اس فوجی ٹولے کی حلیف بن گئی ہے۔ وہ کافی عرصے تک یہ ترغیب اس وقت تک دیتے رہے جب تک میں نے اسے مسترد نہیں کر دیا۔ میری جماعت بلغ سے سات نشستوں سے زیادہ سیٹیں دینے کے لئے آمادہ نہ تھی۔ جبکہ یہ تیس نشستیں مانگتے تھے۔ اور بعد میں ۱۵ نشستوں پر آگئے۔ ۱۹۵۴ء میں جب دستور ساز اسمبلی کو توڑا گیا تھا اس دن سے اس خود غرض جماعت نے آج تک ہر اصول کو دو گلوں میں بٹا دیا ہے۔

فوج میں ایک سچر جنرل کی حیثیت سے خدمات انجام دیتے ہوئے جہاں تک اس کا تعلق ہے میں اس سے متعلق مختلف حوالوں کے بارے میں کوئی تفصیلی رائے نہیں دوں گا کہ اس نے انتخابات میں کیا کردار ادا کیا۔ وہ ایک قابل افسر اور ایک بہادر سپاہی ہیں۔ چونکہ ہر شخص کو ایک دن خدا کے سامنے جواب دہ ہونا ہے اس لئے یہ میرا اخلاقی فرض ہے کہ میں اس کے ایسے تمام امور سے علیحدہ رہوں جو انتخابی مہم میں اس کی وابستگی کے بارے میں سوال پیدا کرتے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ میں قرطاس ایضاً کی نشاندہی کروں گا جہاں ایسے حوالے ملتے ہیں جن سے میں اخلاقی طور پر تمام ٹھوس اعتراضات کو قبول کرتا تھا۔

دی سول ملٹری پراہلم

راؤ عبدالرشید خان نے ۱۳ جولائی ۱۹۷۶ء کو ایک جامع نوٹ سابقہ وزیر اعظم کو بھیجا جو بلوچستان میں امن وامان کے مسئلے کے حوالے سے فوج کی موجودگی کے بارے میں تھا۔ اس کا متن شمیرہ 69/B میں دیکھا جاسکتا ہے۔ اس نوٹ کے مندرجات کا خلاصہ درج ذیل ہے۔

سپیشل سیکرٹری نے رپورٹ دی کہ عام صورت حال ابتر ہو رہی ہے۔ دو ماہ پیشتر اس کے اپنے بیان کے مطابق اس نے دورہ کیا تھا جبکہ قانونی سطح پر کئی خرابیاں پیدا ہوئی ہیں اور امن وامان خراب ہو رہا ہے۔ ہوں کے دہاکوں میں اضافہ ہوا ہے۔ سپیشل سیکرٹری کا بیان ہے: ”میں نے مجموعی طور پر سرکاری ملازموں میں پست بہتی اور انتہائی عدم تحفظ کا احساس پایا ہے۔ کیونکہ تمام سطحوں پر فوجی افسروں کی لہر آ رہی ہے۔ جس سے مقامی افسروں کی ترقی رک گئی ہے اور وہ اس پر ناراض اور ناخوش ہیں۔ جس کی وجہ سے میں فوج اور سول کے نازک تعلقات کے مسئلے تک پہنچا ہوں اس لئے میں اپنے مشاہدات کو پوری دیانتداری سے پیش کرنے کے لئے معذرت خواہوں۔“

بلوچستان جیسے پسماندہ صوبے میں، جس میں سیاسی اگھاڑ پگھاڑ کا عمل کئی بار برپا کیا گیا ہے۔ سرکاری ملازموں کی کارکردگی، عہدے کے وقار اور ذمے داری کا معیار، عمومی سطح پر پست ہے۔ رشوت کی عام شکایات ہیں۔ ترقیاتی عمل کے ساتھ غلط ہتھکنڈے اختیار کر کے اسے روک دیا گیا ہے۔ اگر امن وامان قائم کرنے میں قانون شکنی ہوئی ہے تو قانون نافذ کرنے والی ایجنسیوں کی کارکردگی معیاری نہیں ہے۔ اور وہ صورت حال سے نکلنے میں ناکام رہتی ہیں۔ انتہائی ”بدتر“ اور ”گھٹناؤں“ انداز میں فوج کو آخری سہارے کی صورت میں لایا گیا ہے۔ فوجی کارروائی اور مداخلت سے یہ جواز تو بنتا ہے کہ یہ عمل فوری اور فیصلہ کن ہو۔ لیکن اس کی موجودگی کی طوالت، جس سے اندرونی امور سے تشا جاسکے، اس کی بہر حال اپنی حدود ہیں۔ وقت کی طوالت کے ساتھ اس کا مقصد فوت ہو جاتا ہے اور فوج اپنے پاؤں جمانے کی کوشش کرتی ہے۔ بلوچستان میں بھی ایسی صورت رونما ہو رہی ہے۔ فوج کی صوبے میں بے جا موجودگی اور قیام مختلف شعبوں میں منفی اثرات پیدا کر چکی ہے۔

یہ انسانی فطرت ہے کہ اگر کسی شخص کا کام کوئی دوسرا شخص کرنے لگے تو وہ اپنی اچھی بھی بلائے کی زحمت گوارا نہیں کرتا۔ بلوچستان کی سول انتظامیہ بھی اس مرتلے تک پہنچ

قرطاس امضہ صفحہ ۲۲۲ پر بیان کرتا ہے ”سابق وزیر اعظم کے سیکرٹری میجر جنرل محمد امتیاز علی ان محلات کی تلاش میں تھے۔ اس سے ملحقہ حصہ صفحہ ۲۲۳ پر یوں بیان کرتا ہے۔

”ایک بار مسٹر رفیع رضائی نے اجماعی نیت سے اس تجویز کو رد کر دیا۔ وزیر اعظم سے گفتگو کے انہوں نے ایسا کیا۔ یعنی خود ناقابل قبول سمجھ کر نہیں۔“

یہ بات قطعی واضح ہے کہ رفیع رضائی نے اس تجویز کو ناقابل قبول قرار دیا تھا۔ اور میں نے اس سے اتفاق کیا تھا۔ اس سے ثابت ہوا کہ کیا میں ایک وطنی و لکھنوی تھا یا ایک جمہوری عزم کا رہنما تھا۔

مزید برآں اس تجویز میں جو سوال اٹھتا ہے اس کا خالق میجر جنرل امتیاز علی نہیں تھا۔ سیالکوٹ سے تعلق رکھنے والے ایک اہم امین اسے کے ذہن کا بچہ تھا۔ میرے ملٹری سیکرٹری نے یہ تجویز صرف میرے سامنے پیش کی تھی۔ جس کے نتیجے میں میں نے اسے متعلقہ وزیر کے پاس بھجوا دیا۔ میں نے اسے ناقابل قبول قرار دیا۔ اب چائے کی پیالی کے طوفان کی طرح اس بات سے طوفان اٹھانے کی کوشش کی گئی۔ یہ تھا اس حکومت کا طرز عمل۔ کہ پاکستان کے ارد گرد جو طوفان جمع ہو رہا ہے اس سے آنکھیں بند کر کے یہ حکومت اپنی تمام توجہ تینٹیوں کے گننے پر مرکوز کئے ہوئے ہے۔

قرطاس امضہ کے صفحہ ۷۱ پر بیان کیا گیا ہے کہ میرے سپیشل سیکرٹری راؤ عبدالرشید نے مجھے بتایا کہ گورنر بلوچستان، خان آف قلات پر انتخابات کے انعقاد کے سلسلے میں اعتماد نہیں کیا جاسکتا۔ خاص طور پر ایسے حالات میں جبکہ صوبے پر گورنر راج نافذ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ خان آف قلات گورنر بلوچستان کی حیثیت سے، جولائی ۱۹۷۷ء تک اس عہدے پر فائز رہے۔ جس سے یہ بات ظاہر ہے کہ میں نے اس ریکارڈ پر قطعاً کوئی توجہ نہ دی۔

اسی صفحے پر بتایا گیا ہے کہ میرے سپیشل سیکرٹری نے یہ تجویز پیش کی کہ ملک غوث بخش ریسمانی کو سفیر بنا دوں۔ میں نے یہ مشورہ قبول نہ کیا۔

قرطاس امضہ کے چار پانچ صفحے میرے سپیشل سیکرٹری کے بارے میں وقف کئے گئے ہیں کہ وہ بلوچستان میں فوج کی موجودگی اور سول سروسز میں فوجی افسروں کی تعیناتی کے امور میں دخیل تھا۔ راؤ عبدالرشید کے ایک جامع نوٹ مورخہ ۱۳ جولائی ۱۹۷۶ء جو سابقہ اور حالیہ اہم واقعات کے تجزیے پر مشتمل تھا، اس کے حوالے سے میں بے تکلفی سے قرطاس امضہ کے اس پورے متن کو درج کرنا چاہتا ہوں جو صفحات ۷۲ تا ۷۵ پر مشتمل ہے۔

چکی ہے کہ وہ اب ہر کام کے لئے فوج کی طرف دیکھتے ہیں اور حتیٰ کہ وہ فرائض جن کی تکمیل کے لئے کسی بیرونی اعانت کی ضرورت نہیں اس میں بھی ان کی طرف دیکھتے ہیں۔ حالانکہ یہ کام خود ان کے اپنے کرنے کے ہیں۔ ایسے حالات میں سول امور میں فوج کا دائرہ عمل بڑھتا جا رہا ہے اور اس سے سول امور اور انتظامی طریق کار کا متاثر ہونا بھی ناگزیر ہے۔

سپیشل سیکرٹری نے یہ نکتہ پیدا کیا ہے کہ بد قسمتی سے اس ملک میں فوج کی یہ روایت رہی ہے کہ وہ سول انتظامیہ میں ملوث ہو جاتی ہے۔ طاقت کا اپنا ہی دائرہ ہوتا ہے اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ فوجی افسر بالخصوص درمیانے درجے کے عہدیدار اپنی طاقت اور اختیارات کا علی اظہار گرفتاریوں، تلاشیوں اور پوچھ گچھ سے کرتے ہیں۔ جس سے انہیں اپنے اختیارات کا احساس ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ سیاست دانوں اور سرکاری افسروں کے بارے میں ان کے ذہنوں میں اہانت آمیز خیالات بڑھنے لگتے ہیں، اور عمومی طور پر فوجی حلقوں میں یہ تاثر پھیلنے لگتا ہے کہ سول انتظامیہ اور سیاست سے تعلق رکھنے والا ہر شخص نااہل اور بد عنوان ہے اور صرف فوج ہی اچھے کام انجام دے سکتی ہے۔ یہی وہ طرز احساس تھا جس نے پہلے مارشل لاء کو جنم دیا تھا۔

اس کے بعد راولپنڈی نے بڑے اصرار سے یہ نکتہ پیش کیا ہے کہ جمہوری سیٹ اپ میں فوج میں نہ صرف انتہائی اونچے درجے سے بلکہ نیچے درجے تک، جبکہ سول امور ملوث ہوں، یہ ہونا چاہئے کہ اس پر سول حکومت کا پورا کنٹرول ہو۔ ماسوائے کہ مارشل لاء لگے۔ جس میں فوج سول حکومت کی مدد کے لئے آتی ہے۔ فوج کو کسی صورت بھی ایک قانون نافذ کرنے والی آزاد اور خود مختار ایجنسی کی حیثیت حاصل نہیں ہونی چاہئے۔ جبکہ بلوچستان میں محسوس ہوتا ہے کہ فوج آزادانہ اور خود مختارانہ سطح پر اپنی قوت اور اختیارات کا مظاہرہ کر رہی ہے۔ چونکہ یہ پیشہ ور ہیں اس لئے عوامی یا سیاسی کسی قسم کے رد عمل کی پرواہ کئے بغیر یہ اپنے انداز میں کارروائی کرتے ہیں۔ فوج نے جو سخت رویہ اختیار کیا ہے اس کی وجہ سے لوگوں میں فوج کی پسندیدگی کم ہو رہی ہے۔

اسی موضوع پر مزید بحث کرتے ہوئے اور اسی حوالے سے سپیشل سیکرٹری نے اس نظر کے کوئیوں آگے بڑھایا:

”تمام حالات و واقعات کے مشاہدے کے بعد یہ ظاہر ہوتا ہے کہ فوج نے بلوچستان میں

فوقیت حاصل کر لی ہے اور ترقیاتی شعبے کو بھی زیر نگین کر لیا ہے، اور تمام پالیسیاں فوج ہی بناری ہے۔ یہ ایک انتہا پسندانہ نقطہ نظر ہو سکتا ہے لیکن بلوچستان میں فوج کے طویل قیام کے منفی اثرات ظاہر ہونے لگے ہیں۔“

مندرجہ بالا تجزیے پر انحصار کرتے ہوئے راولپنڈی نے متعدد سفارشات پیش کیں جن میں سے کچھ یہ ہیں:

(ا) سرکاری انتظامیہ کو اس کے پیروں پر کھڑا کیا جائے اور اسے اپنی اصل سرگرمیاں بحال کرنے اور اپنا رول ادا کرنے کے لئے تیار کیا جائے۔

(ب) فوج سے گرفتاریوں، گھریلو تلاشیوں اور شہریوں کو فوجی نگرانی میں مختصر سے وقت کے لئے بھی رکھنے کے اختیارات واپس لے لئے جائیں۔ فوج کو صرف مستقل نوعیت کی ذمہ داریوں کے لئے ہی استعمال میں لایا جائے۔

(ج) انتظامیہ کا مرکز کو رپس پیڈ کو رٹرز سے واپس سول سیکرٹریٹ میں منتقل کیا جائے۔ کمشنروں اور ڈپٹی کمشنروں کے دفاتر بھی مقامی فوجی کمانڈروں کے کیمپوں سے منتقل کئے جائیں۔ اگر رابطے اور تعاون کے لئے میٹنگوں اور مذاکرات کی ضرورت پڑے تو یہ سول دفاتر میں منعقد ہوں۔

(د) فوج کا انخلاء، جو بتدریج ہو، مزید واقعات کا سبب بن سکتا ہے لیکن یہ خطرہ مول لینا چاہئے۔

(ر) فوج کو غیر متحرک اور منجمد فرائض پر مامور کرنا، اندرونی اور بیرونی دونوں سطحوں پر ہونا چاہئے۔ اگر صورت حال مزید خراب ہو یا کوئی علاقہ ہاتھ سے نکل رہا ہو تو فوج ہمیشہ وہاں موجود ہوگی کہ سرکاری انتظامیہ کی امداد کے لئے آ سکے۔

(س) چونکہ افسروں میں یہ تاثر کہ تمام امراض کا حل فوج ہے۔ جسے ایک کاری ضرب مشرقی پاکستان کے لیے میں لگی تھی، پھر سے جڑیں پکڑ رہا ہے۔ یہ تاثر بڑا متعدي ہے اور یہ ایک صوبے تک ہی محدود نہیں رہ سکتا۔ اس متعدي تاثر کو پھیلنے کی اجازت نہ دی جائے۔

مندرجہ بالا سپیشل سیکرٹری کی متعدد تجاویز کو خط کشیدہ کیا۔ لیکن ان پر اپنی کوئی خاص رائے نہیں دی، البتہ انہوں نے ان دونوں نوٹ کو یکجا کر کے جو سپیشل سیکرٹری راولپنڈی نے انہیں بھجوا دیے تھے، اس پالیسی کے ساتھ پیرزادہ کو بھجوا دیے۔ ”پلیزی دونوں نوٹ دیکھئے، اپنی رائے لکھئے اور جب میں آپ کی رائے دیکھ چکوں تو اس پر بات کیجئے۔“ مسٹر

بھٹو کے دستخطوں کے ساتھ ۱۲ اگست ۱۹۷۶ء کی تاریخ ثبت ہے۔

راؤ رشید کی مناسب تجاویز اور سفارشات کے باوجود، جو سرکاری امور اور فوج کے کردار سے متعلق تھیں۔ یہ معاملہ ریکارڈ میں ہے کہ مسٹر بھٹو نے فوج کی بلوچستان سے واپسی کی بتدریج پالیسی اختیار نہیں کی جبکہ دوسری طرف قوی سطح پر احتجاجات کے بعد گورنر ہوئی تو انہوں نے ملک کے کئی شہروں کراچی، حیدرآباد، لاہور پر محدود مارشل لاء نافذ کر دیا۔ اور فوج کو ایک بار پھر باہر بلایا گیا کہ سول حکومت کی مدد کرے۔ یہ وہ علاقے تھے جو بلوچستان کے علاوہ تھے۔

سپیشل سیکرٹری نے سول ملٹری انتظامیہ کی پیچیدگیوں کے بارے میں اپنے حکمت چیف سیکرٹری بلوچستان کے سامنے اٹھائے۔ جنہوں نے اپنے جواب (ضمیمہ ۲۱) میں ۲۹ اکتوبر ۱۹۷۶ء فوجی افسروں کو جو برتری حاصل ہوئی ہے وہ سول افسروں کی ناقص کارکردگی کے سبب ہے جو ترقیاتی امور میں ظاہر ہوئیں اس کے علاوہ اس ناقص کارکردگی کا ایک سبب سرکاری افسروں کی سکریننگ سے خالی ہونی والی اسامیوں کی وجہ سے بھی ہے اور ایسی سکریننگ جو بلوچستان میں یا باہر ہوئی ہے۔ مزید برآں انہوں نے یہ نکتہ بھی پیش کیا:

کچھ اور فوجی اسمز جو کہ پول کے ارکان نہیں ہیں انہیں بھی بلوچستان کے لئے منتخب کیا گیا اور انہیں پولیس اور انتظامیہ وغیرہ کے شعبوں میں کھپایا گیا۔ جو تربیت کے بعد بہتر کارکردگی کا مظاہرہ کر سکیں گے۔ اگرچہ ان فوجی افسروں کی اکثریت کا تعلق بلوچستان سے ہی ہے لیکن وہ سرکاری افسر جنہیں گذشتہ برسوں میں ترقی ملی اب انہیں اپنی ترقی کی راہ میں روکاوٹ تصور کرتے ہیں۔ تاہم ضرورت اس امر کی ہے کہ انتظامیہ اور ترقیاتی شعبوں کے درمیان تعاون اور ربط مضبوط و مستحکم ہوتا جائے تاکہ حکومت کی پالیسیوں کو نافذ کیا جاسکے۔ سول حکومت اپنے انتظامی اختیارات اپنی مکمل سواہد پر تمام شعبوں پر استعمال کرتی ہے۔ ماسوائے ان علاقوں کے جہاں فوجی آپریشنز کئے جاتے ہوں۔ اس کے علاوہ ایک صوبائی کوآرڈینیشن کمیٹی موجود ہے جو وقتاً فوقتاً انتظامی امور کے بارے میں امور طے کرنے کے لئے اپنی میٹنگ کرتی ہے یہ کمیٹی جس کی غائیت کی فوج کے کورپس کمانڈرز فوجی امور سے متعلق کرتے ہیں اور چیف سیکرٹری اور دوسرے سرکاری افسر اس میں سرکاری امور کے بارے میں غائیتگی کرتے ہیں۔

موجودہ حکومت نے خود اپنی تباہی کے سلمان کئے ہیں۔ قرطاس امتیاز میں یہ معاملہ ایک عذر لنگ کی حیثیت رکھتا ہے کہ فوجی جرنیلوں کو طاقت اور اختیارات کی ہوس نہیں اور وہ سول

امور میں مداخلت نہیں کرتے۔ راؤ عبدالرشید کے مشاہدات ان سفارشات کے باوجود، قرطاس امتیاز یہ خود شہادت دیتا ہے کہ یہ حقیقت ریکارڈ پر موجود ہے کہ مسٹر بھٹو نے بلوچستان سے فوج کے انخلاء کی بتدریج پالیسی نہیں اپنائی یہ تو زخم پر نمک چھڑکنے والی بات ہے کہ الزام بھی لگایا جائے اور اس کی تردید بھی وہیں موجود ہو۔ ایک سے زائد بار میں نے فوجوں کی واپسی کے منصوبے پر اصرار کیا لیکن ہر بار مجھ سے یہ درخواست کی گئی کہ ابھی کچھ مہینوں کے لئے مزید اتنا کیا جائے۔ یہ حقیقت ہے۔ یہ مستند اور تاریخی ریکارڈ ہے۔ اس بھوئی کہانی کی تردید کرتا ہے جو اس حکومت نے لکھی ہے۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس وقت جبکہ اس فوج کو ایک برس سے زائد عرصہ ہو گیا اور انہیں پاکستان پر اقتدار اور اختیار حاصل ہے کیا بلوچستان سے فوج واپس بلوائی گئی؟ صرف میں ہی نہیں بلکہ بلوچستان کے عوام بھی اس سوال کا ایک دیانت دارانہ جواب چاہتے ہیں تاہم سول سروسز میں فوجی افسروں کی کچھ اور مداخلت اور اس کے سول سروسز اور انتظامیہ پر اثرات کا مسئلہ جدا گانہ ہے یہ پالیسی فوجی حکومت نے انتظامی کارروائی کے طور پر اختیار کی ہے موجودہ صورت حال یہ غازی کرتی ہے کہ دو برسوں میں سول سروس بطور سول سروس ختم ہو جائے گی اور یہ سکے کا دوسرا رخ بن کر رہ جائے گی۔

مارشل لاء کی حکومتوں کی یہ سربج پالیسی ہوا کرتی ہے جس کی قیمت ملکی استحکام اور اتحاد کو ادا کرنی پڑتی ہے۔ کسی قسم کی معاشی اجارہ داری کبھی برداشت نہیں کی جاسکتی اور سیاسی اجارہ داری تو اس سے بھی کم برداشت کی جاسکتی ہے۔ اس لئے مکمل اجارہ داری ایک مکمل انقلاب کی طرف لے جاتی ہے مسٹر وقار احمد شیشلشمنٹ سیکرٹری کے بارے میں سراسر غلط بتا پر مختلف حلقوں میں یہ تصور کر لیا گیا کہ وہ میری حکومت کا سب سے طاقتور بیوروکریٹ تھا۔ سرکاری افسروں کی سکریننگ کے بارے میں میں نے جو ایک نوٹ لکھا اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ میری حکومت میں شیشلشمنٹ سیکرٹری کو کس حد تک طاقت و اختیار حاصل تھا۔

”درخواست پر مسٹر بھٹو کی رائے سے جہاں ان امور کے متعلق مکمل انصاف اور جائز طرز عمل کا اظہار ہوتا ہے وہاں اس میں ایک انفرادیت بھی ہے انہوں نے لکھا ہے؟ بے شک، اسے چھوڑ دیا جائے۔ شیشلشمنٹ سیکرٹری پر چھوڑ دیا جائے۔ میں منہ کے بل سید جاگر جاجوں کا۔ اس نے اہم سیاسی تقاضوں کا مطلق خیال نہیں لکھا۔ وہ کیا چاہتا ہے؟ ایک سیاسی ڈیل لاک، سیاسی تباؤ۔ صرف ایک یا دو یا تین افراد کے لئے؟“ (صفحہ ۷۷)

(۳)

وار فیئر۔۔۔ انتخابی دھاندلی اور فراڈ

انتخابات کے موضوع پر وقت اور اس کے فوائد کے بارے میں قرطاس ایٹش میں کہا گیا ہے کہ میں انتخابات کو ایک طرح سے حزب اختلاف کے خلاف ایک جنگ سمجھتا تھا کرو یا مر جاؤ منصوبہ (DOORDIEPLAN) کے زیر عنوان صفحہ ۱۱ پر بیان کیا گیا ہے۔

”یہ مسٹر بھٹو کے اپنے رواستھی انتظامی سائل کے عین مطابق تھا کہ ہونے والے انتخابات کے بارے میں وہ سوچتے تھے کہ یہ حزب اختلاف کے خلاف ایک جنگ ہے ان کا حوالہ یوں ہے ” بہت جلد ایک تفصیلی جنگی منصوبہ پیش کیا جائے گا جس میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا جائے گا۔ ہمیں ایک ایسی سرنامہ مہم اپنے دشمن کے خلاف شروع کرنی ہے جس کا آغاز ہمارے طاقتور حکام سے ہو اور ہمارے مخالفوں کے کمزور پہلوؤں پر حملہ سے کیا جائے۔ جنگی اصطلاحات ان کی تقریروں میں بار بار دہرائی گئیں اور جنگی قسم کی کارروائیوں کے منصوبے مسٹر بھٹو اور ان کے معتمدوں نے تیار کئے“

قومی اسمبلی میں اپنی ۷ جنوری ۱۹۷۷ کی تقریر میں میں نے کہا تھا۔ ”میں جانتا ہوں کہ سیاست دان بھی انتخابات سے اسی طرح پہلو تہی کرنے کی کوشش کرتے ہیں جیسے جنرل لڑنے سے لیکن نکتہ یہ ہے کہ سیاسی لڑائیاں لڑی جانی چاہئیں۔ سیاسی انتخابات وقت کے شیڈول کے مطابق لڑائے جانے چاہئیں جبکہ لڑائیوں کے وقت کا کوئی شیڈول نہیں ہوتا ہے۔“

میری تقریر کا یہ حصہ قرطاس ایٹش کے تعارف میں صفحہ (III) پر دکھائی دیتا ہے اس سے میرے بارے میں عناد اور تعصب اور رسوائی پیدا کرنے کا مقصد پورا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ حالانکہ کوئی انتہائی یک طرفہ ذہن رکھنے والا ہی تقریر کے اس حصے سے کوئی غلط مطلب اخذ کر سکتا ہے ایسی اصطلاحات ”کرو یا مر جاؤ اور“ کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا جائے“ عزم ارادے اور تیاری کے اظہار کے لئے استعمال کی جاتی ہیں۔

حال ہی میں ایک عرصے کے مارشل لا ایئر منسٹر نے بیان دیا ہے کہ خوراک کی پیداوار

اشفاق سے یہ درخواست تکلیف میں مبتلا ایک خاتون کی طرف سے تھی۔ اس نے مجھ سے اس بنا پر ملاقات کا وقت مانگا تھا کہ وہ کبائنڈ ملٹری ہسپتال راولپنڈی میں ۱۹۶۳ میں اس وقت میری نرس تھی جب میرا اپینڈکس کا آپریشن ہوا تھا۔ چونکہ میرے پاس وقت نہیں تھا اس لئے میں نے اپنے سیکرٹری کو ہدایت کی ”پلیز اسے فوراً ملیں اور اس کی مدد کرنے کی کوشش کریں دوسری صورت میں میں اسے ملوں گا۔ چونکہ اس نے میری بڑی دیکھ بھال کی تھی“ (صفحہ ۷۷) مناسب جانچ پڑتال اور تصدیق کے بعد اس کی درخواست کو کہ اس کے شوہر کی سکریننگ نہ کی جائے۔ سیکرٹریٹ کی سفارش پر قبول کر لی گئی۔ اگر میری حکومت نے سکریننگ کی تھی تو موجودہ حکومت یوں چینیٹی ہے جیسے قتل کرایا گیا ہو۔ اگر میری حکومت سکریننگ نہیں کرتی تو بھی موجودہ حکومت کا رد عمل یہی ہوتا۔

ہر شخص جانتا ہے کہ ممتاز علی بھٹو میرا خون کارشتہ دار اور کزن ہے۔ اسے گراچی سنٹرل جیل میں ڈالا گیا ہے، جب ہم دونوں کو رات کی تاریکی میں لاڑکانہ سے ۱۷ ستمبر ۱۹۷۷ کو پکڑا گیا سب جانتے ہیں کہ وہ میرے بہت قریب ہے اس کے باوجود میں نے لاڑکانہ کی حدود تبدیل کرنے کے بارے میں اس کے مشورے کو رد کر دیا تھا۔ میں نے منظم نصرت بھٹو کے مشورے کو اس لئے قبول نہیں کیا تھا کہ دونوں متعلقہ افراد میرے وفادار تھے بلکہ اس لئے کہ میں نے اس کی اس رائے سے اتفاق کیا تھا کہ وہ پاکستان کے غریب عوام کے انتہائی بھرپور دوست اور محنتی ہیں قرطاس ایٹش کے صفحہ ۳۹ پر یہ بات درج ہے میرے امتحان کی ایک ہی کسوٹی تھی کہ کون ہے جو محنتی ہے اور پاکستان کے غریب عوام کا دوست ہے۔ غریبوں کا دوست میرا دوست اور بھائی ہے۔ اور عوام کا دشمن میرا جانی دشمن ہے۔ یہ میرا واحد اور ناقابل تبدیل معیار ہے۔ اس کے علاوہ جو کچھ ہے وہ انفرادی اہمیت کا حامل ہے۔

ایوب خان کے سنہری دور میں ایک ممتاز شخصیت کی طرف سے یہ تجویز پیش کی گئی تھی کہ پاکستان میں ورانتی بادشاہیت قائم کر دی جائے اور ایوب خان کو پہلا بادشاہ بنا دیا جائے ایوب خان نے اس تجویز کو بڑی سنجیدگی سے لیا اس نے نواب آف کالا باغ اور مجھ پر مشتمل ایک دورکنی سپریم کونسل بنائی تاکہ اس تجویز کا جائزہ لیا جائے۔ ہم نے ایک ماہ کے بعد اس تجویز کو اس کے بیوروپرٹ کے ساتھ واپس بجوا دیا۔ اور یہ سفارش کی کہ وہ اس تجویز کو فراموش کر دیں۔ ایوب خان نے اس پر اپنی رائے دی اور اس نے کہا تھا یہ اتنی بھی بے کار اور فضول نہیں ہے۔

کے لئے ”وار ٹینک“ کی پالیسی بنائی جائے گی اس کا یہ مفہوم ہے کہ ایک جنرل جس نے اپنا فوجی پیشہ ۵ جولائی ۱۹۷۷ کو ایک سیاسی کیریئر کے لئے ترک کر دیا جنگ کی بجلی کر رہا ہے ؟

ساری دنیا میں سیاسی رہنما ایسی اصطلاحات متفقہ رویوں اور میکانوں میں سیاسی عمل کو متحرک اور نیز تر کرنے کے لئے استعمال کرتے ہیں۔ قابل قدر سیاست دان جو اپنی حیثیت رکھتے ہوں، وہ جرنیلوں کی اصطلاحات استعمال کرنے سے بھی خوفزدہ نہیں ہوتے جبکہ اس کا الٹ کم از کم پاکستان میں ایک سچ کی طرح ہے ہمارے ملک میں سول حکومت کے زمانے میں جنرل جمہوریت کی تعریف کرتے ہیں اور قومی منشور کے ساتھ وفاداری اور وابستگی کا اعلان کرتے رہتے ہیں۔ وہ سول حکومتوں کے ساتھ اپنی گہری وفاداری کا اظہار کرتے ہیں۔ اور اپنی حکومتوں اور ان کی سیاست کی مدح سرائی کرتے ہیں موجودہ فوجی حکومت کو نہیں لے جو فوجی اصطلاحات انتخابات کے زمانے میں استعمال کی ہیں اور جنگ اور انتخابات کے مابین جو حد فاصل قائم کی اس سے خوفزدہ نہیں ہونا چاہیے۔

نوبرس کی عمر میں، میں نے ۱۹۳۷ کے انتخابات سے ایک سبق سیکھا اور وہ یہ تھا کہ کوئی دقیقہ فراغت نہ کیا جائے اور زیادہ خود اعتمادی کا اظہار نہ کیا جائے۔ اس سے بہر حال یہ کسی طور ثابت نہیں ہوتا کہ بد عنوانی یا دھاندلی کی جگہ لے سکتی ہے اس کے برعکس جامع اور مکمل تیاری کا مفہوم اور مقصد یہ ہے کہ فراڈ اور دھاندلی پر غور نہیں کیا گیا بالکل اسی طرح جیسے فوج کے اپنے ضابطے اور اصول ہوتے ہیں اسی طرح انتخابات کے ہوتے ہیں ایک اچھا جرنیل اپنی فوج کو مکمل تیاری اور منصوبہ بندی کے تحت فتح سے ہمکنار کرتا ہے ایک جنرل جو ناقص تیاری، مبالغہ آمیز اعتماد اور کسی منصوبے کے بغیر اپنی فوج کو جنگ میں بھونک دیتا ہے اسے اپنے نوے ہزار فوجی قیدی بنائے پڑتے ہیں۔

فوج کے حکمران ٹولے نے یہ قباس کر لیا ہے کہ انتخابات کے بارے میں وہ جتنا زیادہ تیاریوں کا اعادہ کریں گے الزام میں استہابی زیادہ مجھے گھناؤنا بنا کر پیش کرنے میں کامیاب ہو سکیں گے۔ اور مجھ پر انتخابات میں دھاندلی کا الزام ثابت کر سکیں گے یہ منصوبہ جس کسی استہابی اور فرد نے تیار کیا ہے انتہائی گھٹیا اور کینینہ پن سے ملبوس وہ لوگ یہ منظر انداز کر جاتے ہیں کہ اگر میں نے انتخابات میں دھاندلی کرنی ہوتی تو مثالی منصوبے نہ بنانا میری ذمہ داری کے انبار نہ گوانا اور انتخابات کی تیاری کے لئے میز رختار میٹنگوں کا اہتمام نہ کرنا اگر میرے ذہن میں دھاندلی ہوتی تو اس کے لئے ایک دو میٹنگیں اور دو ایک زبانی احکام کافی تھے۔ جبکہ حقیقت یہ ہے کہ چارٹ سکیمیں اور پلان ایک دوسرے کے اوپر ایک انبار کی صورت اختیار کر چکے تھے کنفرول روم قائم

کئے گئے مواصلات کا نیٹ ورک قائم کیا گیا یہ سب چیزیں اس نتیجے تک پہنچاتی ہیں کہ میری حکومت اور میری پارٹی جنگ ”لڑانے“ کی تیاری کر رہی تھی انتخابات میں دھاندلی کرنے کی نہیں۔ میں یہ بات دہراؤں گا کہ اگر میں انتخابات میں دھاندلی کرانا چاہتا تھا تو مجھے کیا ضرورت تھی کہ میں ایسی میٹنگوں پر اپنا قیمتی وقت ضائع کرتا جو صبح تک چلتی تھیں۔ ایسے اندازے کئے گئے اور ایسی ہدایات جاری کی گئی جو ان متوقع امور کے متعلق تھیں جو حزب اختلاف اٹھا سکتی تھی سخت قسم کے انتخابی دوروں کا پروگرام بنا اور ان پر عمل کیا گیا۔ صوبائی سیل تیار کئے گئے اور پارٹی کو نئے سرے سے منظم کیا گیا۔ کوئی بھی کوشش ایسی نہ تھی جو نہ کی گئی ہو اور جو توانائی میری رہنمائی کو حاصل تھی اسے بروئے کار لایا گیا تاکہ صاف ستھرا مقابلہ ہو اور منصفانہ انتخابات ہو سکیں۔

میرے بارے میں آمرانہ اقدام کرنے کے الزامات تیار کئے گئے ہیں لیکن میں موت کی اس کو ٹھوکی میں اس قابل نہیں ہوں کہ ہر نکتے کو پھاڑاؤں اور توڑ کر ٹکڑے کر سکوں تاہم اگر میں ایک آزاد آدمی ہوتا اور تمام سرکاری۔ کارڈز تک میری رسائی ہوتی تو بھی یہ اپنے وقار کے منافی سمجھتا۔ من گھڑت کہانیوں اور فینٹسی کے ہر حصے کی ترویج کرتا بہتر وجوہات کے تحت میں سمجھتا ہوں کہ بہت سے الزامات کو حقارت کے ساتھ نظر انداز کر دینا چاہیے۔ مثلاً میں نے کبھی سپر سیلون استعمال نہیں کیا ایک صفحے کے بعد دوسرا صفحہ ایسے ہی الزامات کے لئے وقف کر دیا گیا ہے۔ اور اس کا اینٹی کلائمکس قرطاس ایضاً اس وقت ہوتا ہے جب قرطاس ایضاً میں بتایا جاتا ہے کہ میں نے سپر سیلون کو اس لئے استعمال نہیں کیا میں خراب اختلاف کے دباؤ سے خوفزدہ ہو گیا تھا۔ میرے ہم وطن یقیناً مجھ سے یہ توقع نہیں رکھتے کہ میں ایسے مضحکہ خیز امور کی وضاحتیں کروں۔

جہاں تک سرکاری افسروں کو ہراساں کرنے کا تعلق ہے تو مجھے ایک مثال پیش کرنے دیں جس کے ثابت ہو کہ قانون کی خلاف ورزی نہیں کی گئی تھی۔ قرطاس ایضاً کے صفحہ ۸۷ اور ۸۸ پر کہا جی کے ایک بڑے جلوس کا ذکر کیا گیا ہے۔ عوام کا ایک سمندر تھا جو کراچی ایرپورٹ پر میرے استقبال کے لئے جمع تھا کہ میں ملک کی قیادت کرنے والا تھا۔ چیف آف آرمی سٹاف بھی اس ہجوم میں پہنچا جاتا تھا کیونکہ وہ وردی میں تھا۔ عوام کے ہجوم کی وجہ سے میں چیف آف سٹاف سے ہاتھ نہیں ملا سکتا تھا۔ اس نے بڑے پر جوش انداز میں اپنی آج کی جانی پہچانی مسکراہٹ کے ساتھ میری طرف ہاتھ بڑھایا۔ کیا وہ جلوس میں شامل تھا؟ اس کے بارے میں دونوں طرح کے دلائل دینے جاسکتے ہیں۔ اس جواب کا انحصار اس پر ہو گا کہ کس کے ہاتھ میں لائسنس ہے یہ قرطاس ایضاً کی اخلاقیات ہے۔

ڈس کوالی فیکیشن ٹریبونلز

سرفرائنس میکن نے اپنے مشہور مضامین میں سے ایک میں پوچھا ہے صداقت کیا ہے؟ ”میں اب یہ پوچھنا چاہوں گا ”دھاندلی کیا ہے؟“ ڈکٹری کی تعریف واضح ہے۔ دھاندلی کرنا۔ ”فراڈ کرنا یا اس کا اہتمام ہے۔“ اس روشنی میں میں یہ پوچھنا چاہوں گا کہ انتخابات کے نام پر حکومت کا تختہ الٹنا قرآن پاک کی قسم کھا کر یہ وعدہ کرنا کہ انتخابات نوے دنوں میں ہوں گے انہیں مسنوخ کر دینا اور پھر چند دنوں کے وقفے کے بعد اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی میں ساری دنیا کے سامنے یہ اقرار اور اعلان کہ انتخابات منعقد کرائے جائیں گے۔ کیا انتہائی درجے کا فراڈ نہیں ہے؟ کیا یہ فراڈ کا اہتمام نہیں کیا گیا ہے؟ کیا یہ فراڈ نہیں کہ عوام کو ان کے آئین سے محروم کیا جائے؟ کیا یہ فراڈ کا اہتمام نہیں کیا گیا ہے کہ انتخابات صرف اس وقت ہوں گے جب مثبت نتائج حاصل ہو سکیں گے؟ جیسے کہ جنرل ضیا الحق نے قوم کے نام اپنی تقریر میں ۲۵ جون ۱۹۷۸ کو کہا ہے۔ اور سینیٹ کی تیاریوں کو ظاہر کرنے کے لئے محض ایک الیکشن سیل قائم کیا گیا ہے۔ جس کی حیثیت تیاری کے عمل کے ایک سیل سے زیادہ نہیں ہے۔ یہ فوجی حکومت اپنی منافقت دو غلطے پن اور فراڈ کی وجہ سے سب سے بڑی دھاندلی کی مرکتب ہوئی ہے۔

میرے اس نکتے کی طنزیہ وضاحت وہ گفتگو کرتی ہے جو دو فوجی ڈکٹیٹروں کے مابین ہوئی۔ ان میں سے ایک کا تعلق ایشیا سے تھا اور دوسرے کا افریقہ سے، فیلڈ مارشل عزیز لو اووہ نے جنرل سکودہ سے پوچھا ”بڑے بھائی کہو کیا آپ نے انتخابات میں دھاندلی کی ہے؟“ جس کے جواب میں جنرل نے جواب دیا۔ ہاں بے شک، ورنہ میں عوام کو کیسے چا سکتا تھا! فیلڈ مارشل اووہ :- ہاں میں نے احمقوں سے انتخابات کا وعدہ کیا تھا۔ میں قسم کھاتا ہوں میں پھر قسم کھاتا ہوں کوئی بھی اس کا فرق نہیں جانتا یہ محفوظ اور صاف ترین دھاندلی ہے“ جنرل سکودہ :- ہاں آپ جو کہتے ہیں اس میں صداقت ہے۔ لیکن ذاتی طور پر میں ان احمقوں پر ابھی بخشنے سے پیشتر کیا ہوں کہ وہ اپنے منہ ہی نہیں کھول سکتے۔ اس طرح مجھے ان کی رضا مندی حاصل ہو گئی ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ انتخابات ایک انجام کا ذریعہ ہوتے ہیں اور دھاندلی ایک ذریعہ کا ذریعہ ہے“

(یہ گفتگو اس کانفرنس میں منعقد ہوئی تھی جو عوام پر کنٹرول کرنے کی غرض سے منعقد ہوئی تھی)

۱۹۷۰ میں میرے انتخابات کی مہم انہی اصولوں پر منظم کی گئی تھی۔ المرتضیٰ میں مہمانوں کا کرہ کنٹرول روم بنایا گیا تھا۔ ایسے ہی منصوبے، چارٹس اور سیلز اور اندازے اور تخمینے اس وقت تیار کئے گئے تھے۔ اور اسی طرح کے انتخابی دورے تیار کئے گئے اور ان پر عمل کیا گیا تھا۔ اور انہی رفق رضاؤں، پیرزادوں اور گھروں کو خاص فرائض سونپے گئے تھے۔ کیونکہ ہم ان انتخابات میں پوری تیاری کے بعد شامل ہوئے تھے۔ ہم سینی خان سے تصادم اور دھاندلی کو چکنا چور کرنے کے قابل تھے۔ کیونکہ ہم نے انتخابات کی لڑائی اپنے مکمل جنگی منصوبوں اور کرویا مرقاؤ کی روح کے ساتھ لڑنے کا فیصلہ کیا تھا اور ہم جرنلوں، سبازشوں اور سانگھڑ میں قاتلانہ حملے کی مدافعت کے لئے پوری صلاحیت رکھتے تھے۔

تمام دشواریوں کے باوجود ہم ۱۹۷۰ کے انتخابات میں فتح ٹھہرے یہی روح ہم نے ۱۹۷۷ کے انتخابات میں بھی زندہ رکھی ۱۹۷۰ میں بھی میں نے کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا تھا میں ملک کے ہر گوشے اور کونے میں گیا۔ میں خا کروں کی جنگیوں میں گیا۔ میں بچی آبادیوں کے جھوپڑوں میں گیا میں نے ہر جگہ اپنے قدموں کے نشانات چھوڑے میری آواز ہر گھر تک پہنچی میں ایک گاؤں میں تین بار گیا اس کے باوجود میرے ذہن میں شکوک تھے کیونکہ ایک پیر کا پیشینہی اثر و رسوخ اس گاؤں میں موجود تھا۔ میں وہاں چوتھی بار گیا۔ اس موقع پر گاؤں والوں کی موجودگی میں گاؤں کے نمبر دار نے مجھے کہا۔ ”سائیں آپ ہیں شرمندہ کیوں کرتے ہیں آپ کے علاوہ اور کون ہے جو ہمارے ووٹ لینے کا استحقاق رکھتا ہے؟“ میں وہاں ایسا شخص نہیں تھا جس کی آنکھوں میں آنسو آگئے ہوں۔

یہاں وہ ایک گاؤں تھا جو صدیوں بعد اپنے پیر کو پہلی بار ترک کر رہا تھا۔ ایک گنہگار سیاست دان کے لئے؟ نہیں، ایک ایسے شخص کے لئے جیسے موت کی سزا سنائی گئی ہے؟ نہیں جب ہماری جیپ چارہ تھی تو میں نے بھٹو کے نعرے اس وقت تک سننا رہا جب تک کہ ان نعروں کی آواز نہیں پہنچ سکتی تھی۔ شاید میں نے اپنے آپ کو اس ملک کے ناداروں کے دلوں کی گہرائی تک اتار لیا تھا۔ اور دوسروں کے لئے یہ ایک انوکھا منظر تھا۔ یہ ایک گلاسز کلینے ہو گا کہ اگر میں یہ کہوں کہ میں ہر گھر میں بولا جانے والا ایک لفظ ہوں۔ ہر بحث جو چمکتی ہے اس کے نیچے میں بولا جاتا ہوں۔ میں اس ملک کے پسینے اور رگوں سے تعلق رکھتا ہوں میں عوام کے ساتھ ایک ابدی رشتہ رکھتا ہوں جسے فوجیں کبھی توڑ نہیں سکتی ہیں۔

گیا ہے کہ عوام کو آئین کے تحت ان کی مرضی کے انتخابات کا سیاسی اختیار دیا جائے گا۔ وہ لوگ جو اب اپنے آپ کو صرف خدا کے سامنے جوابدہ ہوئے کا دعویٰ کر کے عوام کے حقوق سلب کر بیٹھے ہیں ان کا یہ عمل بدترین دھاندلی اور فراڈ ہے۔ اس فرب کاری اور اس کے کالیک پہلویہ دعویٰ بھی ہے کہ سرکاری افسروں اور انتظامیہ کے ملوث ہونے سے دھاندلی ہوئی ہے۔ کیا سرکاری افسروں کو کسی طرح انتخابات سے الگ تھلک رکھا جاسکتا ہے؟ افسروں اور انتظامیہ پر ایک بھاری ذمہ داری ہوتی ہے۔ انہیں یہ ضمانت دینی پڑتی ہے کہ نظم و نسق اور امن و امان برقرار رکھا جائے گا۔ کسی قسم کی دھاندلیاں نہیں ہوں گی۔ اور لوگ ووٹ طے شدہ طریقے کے تحت ڈال رہے ہیں۔ پولنگ سٹیشنوں پر عورتوں کو ہراساں نہیں کیا جا رہا۔ امیدوار انتخابی قوانین کی پابندی کر رہے ہیں سلیٹ باکسوں کے ساتھ کوئی گزیر نہیں کی جارہی

سرکاری افسروں اور انتظامیہ کے فرائض کی یہ فہرست ہے انتخابات سرکاری افسروں اور انتظامیہ بغیر کسی طور منعقد نہیں ہو سکتے۔ اس روشنی میں اپنے ارادے کے ساتھ یہ سوچا جاسکتا ہے کہ کچھ افسروں کو کمیٹیوں میں شامل کر دیا جائے۔ لیکن بعد میں مزید غور و فکر کے بعد اس تجویز پر عمل نہیں کیا گیا۔ قسطاس امتیاز کے صفحہ ۶ پر رفیع رضا کا حوالہ ہے کہ جس نے غیر سرکاری کے الفاظ پر اعتراض کیا تھا۔ غامی کن وکلیٹر شپ کے سٹائل میں موجودہ فوجی حکومت جو بات چاہے اپنے انداز میں ڈھال سکتی ہے اور بہت کچھ کو کچھ بھی نہیں میں بدل سکتی ہے۔ قسطاس امتیاز کے صفحہ ۶۱ پر افسروں کے حوالے سے مجھ پر جو جملہ کیا گیا ہے۔ اس میں بیان ہوتا ہے۔

”مسٹر ذیڈ اے بھنوا ۱۹۷۴ء سے ہی جب وہ انتخابات کے لئے ڈھانچہ اور فریم ورک بنا رہے تھے۔ اپنے ذہن میں انتظامی سروسز کے لئے خاص کردار کا نقشہ بنا چکے تھے۔ حتیٰ کہ اس زمانے میں جب وہ مرحوم صدر ایوب خان کی حکومت میں ایک وزیر اور کنونشن مسلم لیگ کے سیکرٹری جنرل تھے، وہ اس آئیڈیا کے حوالے سے جانے جاتے تھے کہ سینٹر شعلی سرکاری افسروں کو پارٹی کے ارکان بنایا جانا چاہیے۔“

میرے ان بچہ بچہ کو جو کورمنٹس ہاؤس ڈھاکہ میں ایک خاص اور خفیہ میٹنگ میں کہے گئے تھے غلط انداز میں استحصالی طریقے سے اب پیش کیا جا رہا ہے۔ اس اجلاس کی صدارت صدر ایوب خان نے کی تھی شرکاء کی تعداد آٹھ سے دس وزیروں اور سرکاری افسروں، جن میں دو صوبوں کے گورنر اور اس وقت کے وفاقی سیکرٹری قانون مسٹر جسٹس مولوی مشتاق حسین سے زیادہ نہیں تھی۔

میرے بارے میں یہ فرض کر لیا گیا کہ میں نے یہ ہدایات دی تھیں کہ پی این اے اور این ڈی پی کے سربراہوں کو کسی قیمت پر انتخابات میں کامیاب نہ ہونے دیا جائے کیا یہ چران کن بات نہیں کے وہ دونوں دو دو حلقوں میں بڑی اکثریت کے ساتھ جیت گئے۔ مزید برآں چیف سیکرٹریوں کے بیانات میں اس پر اصرار کیا گیا ہے کہ صرف ان میں بلکہ کس نے بھی ایسی ہدایات جاری نہیں کیں انتخابات میں کوئی دھاندلی اور فراڈ کے کسی بھی طریقے سے نہ کروایا جائے۔ میں نے اس وقت جو کہا تھا وہ ایک بار پھر دہراتا ہوں۔ میں کوئی ایسا کام ایک دن میں ہوتے ہوئے دیکھنا نہیں چاہتا۔ جس کے لئے مجھے آنے والے پانچ برسوں میں معذرت کرنی پڑے۔ حتیٰ کہ قسطاس امتیاز کا یہ لنگڑا حملہ کہ انتخابات میں افسر شاہی کو استعمال کیا گیا۔ یہ سب کوئی اشارہ فراہم نہیں کرتا کہ دھاندلی ہوئی تھی۔ میں پھر اس طرف آتا ہوں کہ حکومت پر قبضہ کرنے والی فوجی طاقت نے انتخابات کا بہانہ بنا کر حکومت کا تختہ الٹا اور وعدہ کیا کہ انتخابات ہوں گے اور اب تک انتخابات کیوں نہیں کرائے؟

گھنٹی کی یہ صدا جوشنی جارہی ہے۔ اس میں کوئی صداقت نہیں ہے کہ انتخابات اس وقت ہی کرائے جاسکیں گے کہ جب اکثریتی جماعت محدود پیمانے کی یا خاموشی میں اس کا دم کھوٹ دیا جائے گا۔ یہ ڈس کوالی ٹیکیشن سیرینولز بھی دھاندلی کی ہی ایک شکل ہیں ڈس کوالی ٹیکیشن کے یہ ظالمانہ فیصلہ، جن میں قانونی طور پر صفائی پیش کرنے کا موقع ہی نہیں دیا جاتا دراصل ایک حربہ ہیں جن کے تحت اپنے مخالفین اور مد مقابل افراد کو اس دن کے لئے اپنے راستے سے ہٹانا ہے۔ جب اپنی مرضی کے مثبت نتائج پر مشتمل انتخابات کرائے جاسکیں گے جب پاکستان پیپلز پارٹی کے تمام امیدوار نااہل قرار دیئے جاسکیں گے تو کیا اس وقت ہی فوجی حکومت یہ سوچے گی کہ اب مثبت نتائج حاصل کئے جاسکتے ہیں۔ اب تک ایک سو سے زائد کو تو نا اہل قرار دیا جا چکا ہے۔

انتخابات کی تازہ تیاریوں کو جدا گانہ طرز انتخابات پر استوار کرنا فراڈ کے جہرے کا ایک اور رخ ہے۔ آئین کے تحت الیکٹرول روٹری سال کے بعد ہی نظر ثانی کی جاسکتی ہے۔ قومی اور صوبائی اسمبلیوں کی نشستوں میں اضافہ آئینی طریق کار کے بغیر نہیں کیا جاسکتا ہے۔ مزید برآں محفوظ انتخابات کے بجائے جدا گانہ انتخابات کو اپنانا آئین کی روح کے منافی اور برعکس ہے۔ لیکن فوجی حکومت تو آئین کو دفن کر چکی ہے ذرا اندازہ کیجئے کہ فوجی حکومت نے اپنی حکومت کو آئین سے برتر قرار دیدیا جبکہ حکومت پر جبری قبضہ صرف اور صرف اس وعدے کے ساتھ کیا گیا کہ نوے دنوں کے اندر اندر انتخابات کرائے جائیں گے۔ خدا کے سامنے حاضر و ناظر ہو کر اعلان کیا

یہ بالکل غلط ہے کہ میں نے کسی ایسی تجویز یا خیال کی حمایت کی تھی۔ میں نے صرف ایشیا میں رائج طرز حکومت کی قوتوں اور خامیوں کا تجزیہ کیا تھا اور دوسرے نظاموں کی اہمیت سے موازنہ کیا جو عوام کی انگلیوں کی تشکیل کرتی اور ملکوں کو استحکام بخشتی ہیں۔ یہ ایشیائی سرزمینوں کا ایک سیاسی سروے تھا۔ اس میں مجھے شک نہیں کہ پاکستان میں رائج نظام کی میں نے بڑی کھمبیر تصویر پیش کی تھی۔ اور میں نے اسے ورثے میں ملنے والی خامیوں کی نشاندہی کی تھی۔ میں نے بیوروکریسی یا اس کے بڑے بھائی مسلح افواج کے بارے میں کسی قسم کی کوئی خاص تجویز پیش نہیں کی تھی۔ ایسی کوئی بھی کوشش بے کار ہوتی۔ اس میں شریک بہت سے افراد یا تو فوت ہو چکے ہیں یا پھر بنگلہ دیش میں ہیں۔ صرف سابق وفاقی چیکر ٹری قانون موجودہ چیف الیکشن کسٹور میں ہی زندہ ہیں جو ایک شہر میں دو کہانیاں سناتے ہیں۔

جہاں تک انتخابات کا تعلق ہے۔ وجہ نزاع صوبہ پنجاب تھا پی این اے نے بلوچستان میں انتخابات کا بائیکاٹ کیا۔ جبکہ اس کے لیڈروں نے اپنے مضبوط ٹھکانے کراچی اور صوبہ سرحد میں کامیابی حاصل کی۔ فوجی اصطلاح کو استعمال کرتے ہوئے کہا جاسکتا ہے کہ ۱۹۷۷ کے انتخابات میں پنجاب پانی پت بن چکا تھا۔ وہ جو پانی پت کی جنگ جیت جاتا انتخابات میں بیج حاصل کر لیتا قومی اسمبلی کی کل ۲۱۷ سیٹوں میں ۱۲۱ نشستیں پنجاب کی ہیں۔ صوبائی اسمبلیاں بلوچستان میں چالیس اور صوبہ سرحد اسی، صوبہ پنجاب میں دو سو چالیس اور سندھ میں سو نشستیں ہیں۔ تین اسمبلیوں کی کل نشستوں کی تعداد پنجاب اسمبلی کی نشستوں کی کل تعداد سے بیس نشستیں کم ہے۔ یہی صورت حال وفاقی اسمبلی کی ہے۔ اس لئے اگر دھاندلی کی ضرورت تھی تو اس کا ضرورت مالاکنڈ یا مری بگٹی صحرائی پہاڑی علاقوں میں نہیں بلکہ پنجاب کے میدانوں میں دن کی پوری روشنی میں ضرورت تھی پنجاب کی آبادی کل آبادی کا چھیا سٹھ فیصد ہے۔ پنجاب سب سے اہم صوبہ تھا اگر پنجاب میں دھاندلی ثابت نہیں کی جاسکتی تو اس کا واضح مطلب یہ ہے کہ دھاندلی سرے سے ہوئی ہی نہیں جیسا کہ خود قرطاس انٹس میں بیان کیا گیا ہے پنجاب میں پاکستان پیپلز پارٹی نے بڑی آسانی سے اکثریت سے کامیابی حاصل کی۔ پولنگ کے دن کے بارے میں قرطاس انٹس میں جو ۳۴ صفحات رکھے گئے ہیں ان میں سے صرف چار پنجاب سے تعلق رکھتے ہیں۔ اگر کوئی دھاندلی کی بھی گئی ہے تو قرطاس انٹس اس کے شواہد پیش کرنے اور مجھے اور میری حکومت کو گھناؤنا جاسب کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکا۔ ان چار صفحات میں متضاد غیر متعلقہ معلومات فراہم کی گئی ہیں۔ انکو آٹری گیشی نے جو دو بیانات جمع کئے۔ ان میں سے دو افسروں کے بیانات انتہائی معلوماتی اور اہم نوعیت کے حامل ہیں اور ان سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ پاکستان پیپلز پارٹی نے ایسا کوئی مرکزی منصوبہ یا ہدایت نامہ تیار نہیں کیا تھا جو

عالمی سطح پر دھاندلی کرنے کے لئے تھا۔

ان میں سے ایک بیان سابق ڈپٹی کسٹور لائل پور مسٹر نوید آصف کا ہے جو قرطاس انٹس کے صفحہ ۳۱۹ پر ہے مزید برآں صفحہ ۸۹۱۴ پر بیان کرتا ہے۔ اپنی بہترین صلاحیت اور یادداشت کو کھٹکانے کے بعد میں پورے یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ کسی بھی موقع پر کسٹور ڈی سی کی میٹنگوں میں اس ہدایت کا ذکر نہیں آیا کہ ایسی ہدایت دی گئی ہو کہ پاکستان پیپلز پارٹی کے امیدواروں یا ان کے حامیوں کی قانونی خلاف ورزیوں کو نظر انداز کر دیا جائے مجھے قطعاً یاد نہیں آتا کہ مجھے کوئی ایسی ہدایت انتخابی مہم کے دوران یا انتخابات کے دن دی گئی ہو۔

صفحہ ۸۹۱۹ پر اس کا بیان ہے مجھے غیر مستند سیلٹ پیپر انتخابات میں کسی بھی حلقہ انتخاب میں استعمال کرنے کے لئے فراہم نہیں کئے گئے۔ اس سلسلے میں کسی بھی امیدوار کی طرف سے کوئی تحریری شکایت بھی موصول نہیں ہوئی۔ مجھے اس قسم کی بھی کوئی شکایت کسی حلقہ انتخابات یا کسی الیکشن ایجنٹ کی طرف سے زبانی یا تحریری نہیں ملی کہ کسی الیکشن سیک کے ساتھ کسی قسم کی کوئی گزبڑ کی گئی ہے۔

دوسرا سرکاری افسر مسٹر محمد اصغر خاں ڈپٹی انسپکٹر جنرل پولیس ہے یہ بات ذہن نشین کرنے کے قابل ہے کہ مسٹر اصغر خاں میرے مقدمہ قتل میں ایک گواہ بھی ہے۔ راؤ عبدالرشید ایک سابقہ آئی جی پولیس نے سپریم کورٹ کے سامنے جو بیان حلفی پیش کیا ہے اس میں اصغر خاں کے بطور ایک پولیس افسر اس کے رویے کے بارے میں انتہائی ناخوشگوار رپورٹ دی ہے۔ جو مسٹر اصغر خاں کے خلاف اس کے آراء اور افسرانہ رویے کے خلاف شکایتوں کی تحقیقات کے نتیجے میں تھی۔

اصغر خاں نے اپنے بیان میں انتخابات کے دن کسی قسم کی غیر قانونی اور غلط حرکات کا ذکر نہیں کیا۔ اس کے پاس کوئی ٹھوس ثبوت نہیں۔ اور جو کچھ کہا ہے اس کی نفی صوبے کے چیف سیکرٹری نے کر دی ہے۔ جس کے بارے میں قرطاس انٹس نے لکھا ہے کہ وہ دھاندلی کے کھل جاسم سم کی جانی رکھنے والا بیوروکریٹ ہے۔

صوبہ پنجاب کا چیف سیکرٹری ایک رٹائرڈ بریگیڈئر تھا۔ وہ میری ۱۹۷۲ کی سکیم کے تحت ملازمت میں نہیں آئے تھے۔ ۱۹۶۵ کی جنگ میں وہ شدید زخمی ہوا تھا۔ اور اگر میں غلطی نہیں کرتا تو اس کا تعلق مشہور پروین "پارس" سے تھا۔ جو آرمرڈ فورس کی آنکھ کا تارا سمجھا جاتا ہے۔ بریگیڈیر کو اس کے کھیلے اور قابلیت کے صلے کے طور پر معقول و جلوبات پر سول

سروس میں لے لیا گیا۔ جب ڈاکٹر ہنری کسنجر ۱۹۷۱ء کے موسم گرما میں اپنے چین کے خفیہ مشن پر پاکستان آیا تو اس کام کے لئے بریگیڈ کرکٹ کا انتخاب ہوا ہر کام ٹھیک طریقے سے ہو رہا ہے۔ میں اسے نہیں جانتا تھا تاہم جب میں پاکستان کا صدر بنا تو اس کے ایک ماہ بعد اس کے فرائض کے سلسلے میں اس سے آشنا ہوا۔

جولائی ۱۹۷۷ء میں مارشل لاکے نفاذ کے فوری بعد اسے سویڈن میں سفیر نامزد کیا گیا۔ اس نے وزارت خارجہ میں ملازمت کے لئے ایک درخواست فروری ۱۹۷۷ء میں اپنی بیوی کی الٹانگ حالات میں واقع ہونے والی موت کے بعد کی تھی چیف مارشل لائیڈ منسٹر نے اپنے پڑوسیوں سے تعلق رکھنے والے اپنے ایک بھائی کی درخواست فوراً منظور کر لی لیکن اچانک پراسرار انداز میں یہ تقرری بریگیڈر کی تسلیم شدہ قابلیت اور تجربے کے باوجود منسوخ کر دی گئی شاید اس کا جواب قرطاس ایضاً کے حصے ”پنجاب کا منظر نامہ“ میں فراہم کیا گیا ہے جس کا میں کسی منصوبے کے بغیر حوالہ دینا چاہتا ہوں۔

پنجاب کا منظر نامہ

پنجاب میں جو کہ مرکزی میدان کا رازدار تھا گورنر کے خط سے قطع نظر ایسے کئی شواہد ملتے ہیں جو براہ راست افسروں کی دلچسپی اور مداخلت کی نشاندہی کرتے ہیں۔

چیف مارشل لاء کی انکوائری کمیٹی کا ایک اہم گواہ بریگیڈر نریشا نرڈ مظفر ملک تھا جو انتخابات کے وقت پنجاب میں بطور چیف سیکرٹری خدمات انجام دے رہا تھا۔ اس سے پہلے وہ مرکز میں وزارت داخلہ کے سیکرٹری کے عہدے پر رہ چکا تھا۔ قومی سلامتی اور انٹیلیجینس کے پس منظر میں اس کی یہ شہرت تھی کہ وہ ایک مضبوط لائیڈ منسٹر ہے جس کی وفاداری مستحکم ہے۔

اپنے مختصر اور دو ٹوک بیان میں جو اس نے انکوائری کمیٹی کے سامنے ۲۲ جنوری ۱۹۷۸ء کو دیا۔ بریگیڈر ملک نے مندرجہ ذیل محکمات پیش کئے (ضمیمہ ۲۷۷) انتخابات میں پارٹی کے اندر ہم آہنگی اور تعاون کے لئے سیاسی مشینری کو بروئے کار لاتے ہوئے متعدد وزراء کر اضلاع / ڈویژنوں کا انچارج بنایا گیا۔ گورنر کو بہاولپور ڈویژن کا ذمہ دار بنایا گیا جبکہ وزیر اعلیٰ نے بذات خود ملتان ڈویژن کی دیکھ بھال کی ذمہ داری اسی طرح دوسرے وزراء کو دو یا تین اضلاع میں جہاں ان کا اثر و رسوخ تھا۔ ذمہ داری سونپی گئی مزید برآں وزیر اعظم نے پنجاب کے تمام بنیادی علاقوں کے دورے کئے ایسے شہروں / قصبوں کا انتخاب متعلقہ سیاسی اہمیت اور علاقائی

سیاسی معاونوں کی سفارشات پر کیا گیا تھا۔ ”ایک حقیقی تصویر تک پہنچنے کے لئے کہ پیپلز پارٹی کتنی نشستیں جیت سکتی ہے۔“ کچھ اجلاس وزیر اعظم کی سطح پر اور اسی طرح وزیر اعلیٰ کی سطح پر بھی ہوئے۔ وزیر اعظم کے اجلاس کینڈن کی صورت میں تھے جس میں صوبوں نے بھی سیاسی اور انتظامی دونوں سطحوں پر شرکت کی۔ وزیر اعلیٰ کی میٹنگوں میں میں بھی شریک ہوا میرے علاوہ سیکرٹری داخلہ، کمشنرز، ڈی آئی جی حضرات اور وزیر اعلیٰ کے سٹاف کے چند ارکان نے بھی شرکت کی۔

صوبائی سطح کی میٹنگوں میں ڈویژنل افسروں سے استفسار کیا گیا کہ وہ محدود نشستوں کی کامیابی کے بارے میں اپنے اندازے بتائیں ان بی میں بعض وہ نام نہاد فشتیں بھی تھیں۔ جہاں سے حکمران پارٹی کی اہم شخصیات اور پارٹی لیڈن اس کے اہم افراد انتخاب لڑ رہے تھے۔ اس انتظامی تحمید کا بنیادی آئیڈیالہ تھا کہ انتظامی اندازے کا موازنہ سیاسی اندازے کے ساتھ کیا جاسکے۔

ابتدائی مرحلے میں انتظامیہ نے یہ اندازہ دیا کہ حکمران پارٹی اتنی فشتیں حاصل کرے گی وفاقی سطح کی ایک میٹنگ جس میں میں نے شرکت کی وزیر اعظم کو ستر فشتیں کی رپورٹ دی گئی۔ ایسی میٹنگوں میں اور ان کے بعد کسی بھی مرحلے پر اس قسم کی کوئی ہدایت کمشنروں کو نہیں دی گئی کہ پولنگ میں حکمران پارٹی کی حمایت کریں۔ یہ میرا یقین راسخ ہے کہ پنجاب کے مختلف حلقوں میں ہو دھاندلی ہوئی اس کے ذمے دار انفرادی امیدوار تھے۔ جنہوں نے مختلف قسم کے جھٹکنڈے اختیار کئے۔ اس میں ان کی مدد ان مقامی سرکاری افسروں نے کی جن کی تعیناتی انہوں نے سیاسی ذرائع کے ذریعے کروائی تھی۔

اس کے بعد یہ خیال ہے کہ بریگیڈر ملک نے اعلیٰ ترین سطح تک انتخابات میں مداخلت کی نفی کی ہے۔ ماسوائے یہ کہ اندازے کے مقاصد سامنے تھے جہاں تک انفرادی طور پر امیدواروں کی دھاندلی کا تعلق ہے تو اس کا الزام افسروں پر لگایا گیا ہے جو کہ ان بیانات کے بالکل برعکس ہے جو متحدہ ڈویژنل اور خطی سرکاری افسروں نے لئے اور جن کی تفصیل اگلے باب میں موجود ہے۔ جنہوں نے کہا ہے کہ انہیں براہ راست سابق چیف سیکرٹری سے ہدایات ملی تھیں۔ (صفحہ ۲۳۹ - ۲۵۰)

قرطاس استعفیٰ کے صفحہ ۲۸۷ پر بیان کیا گیا ہے انہی شہادتوں کے دوران بریگیڈر مظفر ملک نے تسلیم کیا کہ اس وقت کے وزیر اعلیٰ نواب صادق حسین قریشی نے بذات خود لاڑکانہ پلان دکھایا تھا اس نے لاہور میں کنفرول روم کی موجودگی بھی تسلیم کی جہاں بڑی ذہانت سے کام ہو رہا تھا۔ اسی طرح وزیر اعلیٰ کا ایک اپنا الیکشن سیل تھا۔ اسی طرح کے سیل اور کنٹرول روم کوئٹہ اور پشاور

میں بھی تھے ۔

یہ آرگنائزیشن ہے دھاندلی نہیں وہ سرکاری افسر جو مارچ ۱۹۷۷ء کے انتخابات میں کنگ پن کی حیثیت رکھتا ہے ایک سابق فوجی افسر ہے اور ممتاز پرووین پارس کا ایک ساتھی افسر ہے ۔ وہ بھی بہر حال یہی کہہ رہا ہے کہ ہم نے پنجاب کے انتخابات میں دھاندلی نہیں کی تھی فریب ان کی طرف سے ہوا ہماری طرف سے نہیں ۔

(۲)

الیکشن کمیشن

قرطاس ایض میں فراواں مقدار میں ایسے حواسے موجود ہیں، جن سے یہ دکھانے کی کوشش کی گئی ہے کہ میں نے چیف الیکشن کمشنر کو اپنی کٹھ پتلی اور الیکشن کمیشن کو اپنی باندی بنانے کی کوشش کی ۔ اس موقع پر میں چیف مارشل لائیڈ منسٹر کو اس پریشانی سے بچانے ہوئے، آئینی حکومت کے دور میں الیکشن کمیشن کے سٹیٹس اور ٹائی گن مارشل لا دور میں اس کی حیثیت سے موازنہ کرنے والی میٹنٹس پیش نہیں کر رہا تھا ۔

اس وقت کے چیف الیکشن کمشنر مسٹر جسٹس سجاد احمد جان کی حیثیت کے بارے میں قرطاس ایض میں بہت زور دیا گیا ہے ۔ یقیناً میں کب یہ نشاندہی کر چکا ہوں کہ اس دستاویز کو خاص مقاصد کی تکمیل کے لئے اپنی مرضی کے مطابق کاٹ چھانٹ کر تیار کیا گیا ہے ۔ یہ قطعی طور پر واضح نہیں ہیں جو تاکہ موجودہ حکمران ٹولہ چیف الیکشن کمشنر کو ایک مومن سمجھتا ہے ۔ یا میری کاچمنڈ انتخابی دھاندلیوں میں ایک ایک حصے دار اور شریک ۔ چیف الیکشن کمشنر کے کردار کے متعلق قرطاس ایض تضادات ملتے ہیں ۔

بات آگے بڑھانے سے پہلے مجھے اجازت دیجئے کہ میں تیزی سے اپنی حیثیت کی وضاحت کر سکوں۔ قرطاس ایض کے نسخہ ۳۷ پر سیکرٹری الیکشن کمیشن مسٹر اے زید فاروقی نے ”سنی سنائی“ باتوں پر میرے خلاف معمول کے عمل سے گریز کرتے ہوئے قرطاس ایض کے مرتبین کو ”یہ رپورٹ دیتے ہوئے بتایا کہ“ مئی ۱۹۷۵ء کو کابینہ کا ایک اجلاس ہوا ۔ جس میں وہ خود بطور سیکرٹری الیکشن کمیشن شریک تھے ۔ مستقبل میں چیف الیکشن کمشنر کے عہدے کے بارے میں مختلف اصطلاحات اور امور کے بعد بات کرتے ہوئے وزیراعظم نے کہا ۔ ”میں نہیں سمجھتا کہ اس بد قماش“ کو ایسی خوشگوار سہولتیں حاصل ہیں تو اس کے جانشین کو یہ سہولتیں کیوں نہ دی جائیں ۔ (قرطاس ایض صفحہ ۳۸)

مجھے بالکل یاد نہیں آ رہا کہ میں نے اس اجلاس یا کانفرنس کے کسی دوسرے اجلاس میں مسٹر جسٹس سجاد احمد جان کو ”بد قماش سمجھاؤ“ میں بیٹھنا دیکھا ہوتا تھا۔ وہ چیف الیکشن کمشنر تھے۔ جنہیں میں اپنی شیطانی حکمتوں کے لئے جہوار کرنا چاہتا تھا۔ پھر اس کے ساتھ انھوں نے ”سیڑ کی سیڑ کی“ کی تاجپوشی بطور ”ملکدار ترنم“ کی گئی۔ جبکہ مارک انٹونی اپنے آپ کو سیزر کا تاج پہنانے میں تین بار ناکام ہوا تھا۔

اپنے انتہائی صلاحیتیں رکھنے والے لیفٹننٹ مسٹر حفیظ احمد ذراؤہ کے ساتھ تمام تر دوستانہ مراسم کے، یہ بات یاد رکھنے والی ہے کہ اس وقت کے چیف الیکشن کمشنر نے ایک صاف ضمیر کے ساتھ بڑی حقارت اور اہانت سے حزب اختلافات کے ان شدید مطالبات کو رد کر دیا تھا۔ جن میں ان کے مستعفی ہونے کا مطالبہ بھی تھا۔ اگر وہ واقعی میرے خلاف دھاندلی کے الزام پر ناراض اور کشیدہ تھے تو انہیں حزب اختلاف کے مطالبے کو خوش آمدید کہتے ہوئے اپنے عہدے سے احتجاجاً استعفیٰ دے کر یہ مطالبہ مان لینا چاہیے تھا۔ چونکہ دھاندلی نہیں ہوتی تھی اور وہ بد قماش نہیں تھے۔ اس لئے وہ حزب اختلاف کے احتجاج کے دباؤ میں نہیں آئے۔ اور انہوں نے حزب اختلاف کے ”پیرو“ کی حیثیت سے استعفیٰ دینے سے انکار کر دیا۔ اس کے برعکس ۱۲ مارچ ۱۹۷۷ء کو ایک پریس کانفرنس میں انہوں نے حزب اختلاف کے اس مطالبے کو وہ استعفیٰ دے دیا ”سیاسی بلیک میل“ کا نام دیا۔ یہی بات قریباً ۲۸ پریمیان کرتا ہے۔

”مارچ ۱۹۷۷ء کے انتخابات کے بعد انتخابات کا جو سلسلہ شروع ہوا، اس میں حزب اختلاف کے ایک حصے نے یہ مطالبہ بھی کر دیا کہ چیف الیکشن کمشنر مستعفی ہو جائیں۔ چیف الیکشن کمشنر کا رد عمل یہ تھا کہ اس احتجاج کو نظر انداز کر دیا جائے۔ ۱۲ مارچ ۱۹۷۷ء کو ایک پریس کانفرنس میں انہوں نے سیاسی بلیک قرار دے کر اپنے عہدے سے استعفیٰ دینے کے مطالبے کو رد کر دیا چونکہ اس کی وضاحت کی سیاسی دباؤ کے تحت اس لیے استعفیٰ جو وویشنل مس کنڈیکٹ“ میں بے پناہ اضافے کا سبب بنے گا۔ لیکن احتجاجات کا سلسلہ سرونہ ہوا اور تین ماہ کے اندر اندر چیف الیکشن کمشنر، نئی علاج کے لئے رخصت لے کر سرکاری خرچے پر بیرون ملک چلے گئے۔“

جب میں نے جنوری ۱۹۷۷ء میں چیف الیکشن کمشنر کو تین سال کے لئے مزید توسیع ملازمت دی تھی تو میں نے اپنے اس فیصلے کے عواقب و اطراف کا پورا جائزہ لیا تھا۔ اس وقت میں ہر تر حالات و بحران کے سینکڑوں پر تھا۔ لیکن جانتا تھا کہ ان کا حزب اختلاف کے ساتھ بہت گہرا تعلق ہے۔ میں جانتا تھا کہ گجرات سے تعلق رکھنے والے ایک سیاست دان کے ساتھ اس

کے گہرے مراسم ہیں۔ میں جانتا تھا کہ وہ ایک بہادر جنگجو کی طرح اپنی دلاوری کے حوالے حزب اختلاف کو یقین دلارہے ہیں کہ وہ ان کی طرف سے ”آزاد“ رہیں گے۔ انہوں نے حزب اختلاف کو متعدد بار یقین دلایا تھا کہ جو بھی انہوں نے حکومت کی مداخلت کی ہو سو سچی وہ اپنے عہدے سے استعفیٰ دے دیں گے۔ وائٹ پیپر کے صفحہ ۳۷ پر الیکشن کمشن کے سکریٹری مسٹر اسے زیر فاروق کے ضمنی بیان سے یہی بات سامنے آتی ہے۔ جس میں اس نے بیان کیا ہے:

”مسٹر سجاد احمد جان اکثر شدید دباؤ میں رہتے تھے اور اکثر یہ سوچتے تھے کہ وہ مستعفی ہو جائیں۔“

ان حالات میں قومی اسمبلی میں ۷ جنوری ۱۹۷۷ء کو عام انتخابات کا اعلان کرتے ہوئے، اگر میں ان کے عہدہ ملازمت میں توسیع نہ کرتا تو بھی اسی طرح کا شور مچایا جاتا۔ جس طرح کالاب چیف مارشل لائیڈ منسٹر نے، اپنے ”آبائی قیسے“ کے نئے الیکشن کمشنر کی تقرری پر ہوا ہے۔ میں انتہائی سخت تنقید کی زمین آجاتا۔ میں شیطان اور گہرے نیلے سمندر کے درمیان پھنسا ہوا تھا۔ اسی لئے الیکشن کمیشن کے ادارے پر عوام کے اعتماد کو بچھڑنے کے لئے کہ یہ ایک آزاد ادارہ ہے، میں نے ان کی ملازمت میں توسیع کر دی۔

بہر حال جیسے کہ توقع تھی، میں تنقید کے نشانے پر آ گیا۔ یہ تنقید حزب اختلاف کی طرف سے نہیں تھی بلکہ میرے ہمدردوں اور حامیوں کی طرف سے تھی۔ مخالف سیاسی جماعتوں نے اس توسیع کو خوش آمدید کہا۔ اور تنقید جسے موجودہ حکومت تلاش کر سکی ہے۔ وہ کراچی کے اردو رسالے ”الفتح“ کی ہے۔ اور تنقید کے حصول کے لئے برابر حکومت نے مزید بڑی محنت سے اپنے ذرائع استعمال کئے۔ اور یہ دریافت کرنے میں کامیاب ہو گئی کہ کراچی کے جریدے ”کانٹونمنٹ“ نے ”الفتح“ کو اپنے شمارے مورخہ ۲۳ جولائی ۱۹۷۷ء کو دوبارہ شائع کیا۔ قریباً ۲۷ صفحہ پر دریافت بیان کی گئی ہے۔ بہر حال، گذشتہ آٹھ ماہ میں اس جریدے ”الفتح“ پر جو کچھ گزری، اور اس کے ساتھ جو کچھ کیا گیا، اس سے مجھے موجودہ دائیں بازو کی حکومت نے بائیں بازو کے جریدے کے حوالے سے خراج پیش کیا ہے۔ اگر اس وقت کے چیف الیکشن کمشنر، حزب اختلاف کے محبوب کے عہدے کی مدت میں توسیع نہ کی جاتی تو موجودہ حکومت کو بے شمار تنقیدی اور مخالفانہ مضامین اور بیانات دستیاب ہو جاتے جن کے حوالے سے قریباً ۲۷ صفحہ اس بے انصافی کے خلاف وادعایا جاتا۔

اگر چیف الیکشن کمشنر میری کٹھ پتلی ہوتے تو پھر وہ ۱۲ مارچ ۱۹۷۷ء کو اپنی پریس

یہ وہ ملک سے اپنے علاج کے بعد واپسی پر انہوں نے اسے - بی بی سی سے گفتگو کرتے ہوئے کہا نقص ان گراؤنڈ رولز میں نہیں تھا جو الیکشن کمیشن نے تیار کئے تھے اور کوئی رقیقہ فروگزاشت نہیں کیا گیا کہ انتخابات منصفانہ اور آزادانہ ہوں - اسی انتخابی طریقے کی ناکامی کا بڑا سبب حکمران پارٹی کے وہ امیدوار تھے جنہوں نے اپنی حیثیت سے اور پارٹی میٹن سے ناجائز فائدہ اٹھایا - اور انتخابات کے انچارج سرکاری افسروں کو دبانے میں کامیاب ہو گئے - یوں انہوں نے سیلٹ پیپر کے تقدس کو مجروح کیا -

میں کسی تضاد کے خوف کے بغیر یہ بیان دیتا ہوں کہ کسی بھی وقت خواہ میں صدر اور وزیر اعظم تھا یا اس کے بعد جبکہ میں جیل میں پھانسی کی کوٹھڑی میں ہوں سابق الیکشن کمشنر حسرت سجاد احمد خان نے ذوالفقار علی بھٹو یا اس کی حکومت پر یہ الزامات نہیں لگائے -

(۱) سرکاری مداخلت

(ب) سرکاری دباؤ

(ج) سرکاری دھاندلی

(د) سرکاری دھمکیاں وغیرہ

یہ عجیب بات ہے کہ سرکاری دھاندلی پر مبنی اس دستاویز کے مرتبین نے ان سے بیان لینے کی ضرورت محسوس نہیں کی - ان کے تمام بیانات سنی سنائی باتوں پر مبنی ہیں اور مسٹر اسے - زیڈ فاروقی کے ذریعے بیان و مرقوم ہوتے ہیں جبکہ حقائق کا یہ تقاضا کہ اسی وقت کے چیف الیکشن کمشنر کا بیان لیا جاتا اور ان سے پوچھ کچھ کی جاتی - اگر وہ پاکستان میں واپسی کے بعد ۲۸ نومبر ۱۹۷۷ کو ایک پریس کانفرنس کر سکتے تھے تو وہ یکم نومبر ۱۹۷۷ کو قائم کی جانے والی انکوائری کمیٹی کے سامنے بھی پیش ہو سکتے تھے - اگر انہوں نے ۹۰۰ گواہوں سے پوچھ کچھ کی اور ان کے بیانات لے لئے تو پھر سب سے پہلا بیان تو سابق چیف الیکشن کمشنر کا ہونا چاہیے تھا - اگر پہلے درجے کے گواہ سے پوچھ کچھ نہیں ہوتی تو پھر وہ بڑے وعدہ صاف گواہ ہیں - شاید ان کا بیان ریکارڈ کیا گیا تھا - لیکن اگر ایسا ہوا تو پھر وہ غریہ جلد سے کیوں غائب ہے! اور اگر بیان ریکارڈ نہیں کیا گیا تو پھر اس کی وجہ بیان کیوں نہیں کی گئی؟

یہ بھی بڑی عجیب اور انوکھی بات ہے کہ مارشل لاء کے خفاذ کے ایک دن بعد ہی ۶ جولائی ۱۹۷۷ سیکرٹری الیکشن کمیشن کو اپنے فرائض جاری رکھنے کا حکم دیا گیا - جیسا کہ اس نے اپنے بیان میں خود بتایا جو قرطاس ایٹش کے صفحہ ۳۲ پر موجود ہے - مسٹر اسے - زیڈ فاروقی ایک استہانی

کانفرنس میں یہ نہ کہتے کہ کمیشن نے ایک ”فول پروف“ مشینری فراہم کی تھی - لیکن ”اگر غنڈے، ڈاکو، فساداتی اس مشینری کو توڑنا چاہتے تھے تو کمیشن کیا کر سکتا تھا؟ یہ الفاظ جو قرطاس ایٹش کے صفحہ ۳۲ پر درج ہیں - کسی ایسے شخص کے نہیں ہو سکتے جو بے بس مجبور اور کٹھ پتلی ہو - فساداتی لوگ دونوں طرف تھے ۵ جولائی ۱۹۷۷ کے موجودہ سیٹ اپ کے بعد ایک سرسری لکڑی جانے تو نظر آتا ہے اب غنڈے، بدعاش ڈاکو اور فساداتی دوسری طرف دکھائی دے رہے ہیں حکومت کا تختہ الٹنے کے بعد اس میں سے بعض پھیل کر اس حکومت کی صفوں میں چلے گئے ہیں - اس وقت کے چیف الیکشن کمیشن نے جب یہ بھارک دیا تھا تو یقیناً ان کے ذہن میں مشین گنوں والے سیاست دان، ایک بیسوں کا تاجروں والی اور ایک نیلی ڈارچی موجود تھی - تباہی اور مصیبت کے اپنے ہی چہرے ہوتے ہیں -

دونوں اطراف کے ان غنڈوں، ڈاکوؤں اور بدعاشوں نے خواہ کتنا ہی نقصان پہنچایا تھا تاہم یہ کسی طرح جائز نہ تھا کہ ڈراکولائی فوجی حکومت ایٹش والی طاقت کو دعوت دی جاتی - یہ نقصان اتنا معمولی تھا کہ اپنی ایک اور پریس کانفرنس منعقدہ ۶ اپریل ۱۹۷۷ میں چیف الیکشن کمشنر نے وعدہ کیا کہ یہ سب کاٹھ کباڑ چھ ماہ میں صاف کر دیا جائے گا“ اس بات کا اظہار قرطاس ایٹش کے صفحہ ۲۵۹ پر ہوا ہے -

اگر میری حکومت نے کسی قسم کی مداخلت کی ہوتی تو چیف الیکشن کمشنر اتنی بات سے پہلے درمیان یا بعد میں بی بی سی کے ایک نمائندے سے یہ وعدہ نہ کرتے کہ انتظامیہ کی مداخلت کے پہلے اشارے پر ہی استعفیٰ دیدیں گے“ ان کا یہ انٹرویو ڈان نے ۶ اپریل ۱۹۷۷ کو شائع کیا تھا - (صفحہ ۲۵۸)

میری حکومت کا تختہ الٹنے کے بعد ۲۸ نومبر ۱۹۷۷ کو وطن واپسی پر مسٹر حسرت سجاد احمد خان نے پریس انٹرویو میں سخت الفاظ استعمال کئے - لیکن انہوں نے مجھ پر دھاندلی کا الزام نہیں لگایا - ان کے پریشان اعصاب کے پیش نظر ان کے سخت الفاظ کو نظر انداز کیا جاسکتا ہے - اہم حقیقت یہ ہے کہ انہوں نے مجھ پر سرکاری مداخلت یا دباؤ کا الزام عائد نہیں کیا - میں جیل میں مقدمہ قبل کے سلسلے میں تھا - موجودہ حکومت ہر اس شخص کو شاباش دے رہی تھی جو مجھ پر حملہ کرتا تھا - سابق چیف الیکشن کمشنر محض ایک شخص نہ تھا - مسٹر سجاد احمد خان نے جو پریس کانفرنس کی اور جو قرطاس ایٹش کے صفحہ ۳۳۱ صفحہ ۳۳۱ میں درج ہے - اس سے نظر آتا ہے کہ انہوں نے الزام لگانے والی اچھی امیدواروں کی طرف اٹھائی ہے - اس پر لیس انٹرویو کا اہم حصہ یوں ہے -

مراعات یافتہ گواہ ہیں جنہوں نے جھوٹے اور کئی غیر اخلاقی طریقوں کے ساتھ مجھے اور میری حکومت کو نقصان پہنچانے کی ہر ممکن کوشش کی ہے۔ اس کے باوجود اس نے سابق چیف الیکشن کمیشن کی کہیں مذہمت نہیں کی۔ بلکہ اس کے برعکس ہر جگہ ممکن طریقے سے ان کا دفاع کیا اور ان کی مشکلات اور جدوجہد کی وضاحت کی ہے۔ اپنے سابق آفاقی صفائی پیش کرتے ہوئے سیکرٹری الیکشن کمیشن نے یہ بیان کیا ہے کہ یہ سبے چاری روح۔۔۔ اکثر شدید باؤمیں رہتی تھی اور اکثر مستعفی ہو جانے کے بارے میں سوچا کرتی تھی قرطاس ایضاً صفحہ ۱۵۰ اور ۱۵۱ پر مسٹر اسے زید فاروقی نے مسٹر جسٹس سجاد احمد جان کو بطور ایک بہادر اور محب وطن اور صاحب کردار کی حیثیت سے پیش کیا ہے۔

یہ بھی دیکھئے کہ جہاں حکومت کا تختہ الٹنے کے ایک دن بعد صدر فاروقی آرڈر نمبر ۴ کے ذریعے مسٹر فاروقی کو دوبارہ عہدے پر بحال کیا گیا۔ وہاں مسٹر سجاد احمد جان کے چیف الیکشن کمیشن کو فی الفور اس عہدے سے سبکدوش کر دیا گیا یہ اطلاع قرطاس ایضاً کے صفحہ ۲۸ پر فراہم کی گئی ہے۔ فاروقی کی بجلی ایک پیرزن کے تحت ہوتی لیکن ان کے پاس کو جن کا وہ دفاع کرتے اور سرایتے ہیں جس طرح سے ناک آؤٹ کیا گیا اس کے بارے میں کیا کہا جاسکتا ہے اس کا نتیجہ کیا نکلتا ہے؟ کیا سجاد احمد جان اس فوجی ٹولے کے ساتھ ملے ہوئے ہیں یا ایک ایسا فرد ہیں جو دھاندلی کی سازش میں ملوث تھے۔ بہر حال دونوں میں سے کوئی بات ہو ۲۵ جولائی ۱۹۷۸ کو جب قرطاس ایضاً جاری کیا گیا جو بد عنوانی اور دھاندلی پر آخری لفظ ہے تو اس سے پہلے الیکشن کمیشن کی پوزیشن واضح کرنی ضروری تھی۔ جبکہ قرطاس ایضاً سابق الیکشن کمیشن کے سابقہ بیانات اور پریس کانفرنسوں پر بہت حد تک انحصار کرتا ہے اس میں الیکشن کمیشن کے سیکرٹری نے اس کے بارے میں باتیں کی ہیں اور ان کا نام لے کر باتیں منسوب کی ہیں اس میں خود اس شخص کی طرف سے کوئی مستند اعلان اور بیان شامل نہیں یہ وہ آدمی ہے جس کی سب سے زیادہ اہمیت بنتی ہے۔

ڈارون کی کھوٹی ہوئی کڑی ابھی تک دریافت نہیں ہو سکی سجاد احمد جان کے اپنے بیان اور شہادت کی عدم موجودگی نے صورت حالات کو بطور خاص پریشان کن بنا دیا ہے۔ قرطاس ایضاً کی ریمیز کے تین دن بعد سجاد احمد جان نے لاہور میں اسے پی پی کے نائبہ کے جو بیان دیا اس سے صورت حال مزید بگڑ جاتی ہے۔ ۲۸ جولائی ۱۹۷۸ کے اس ڈیجے میں بتایا گیا ہے کہ سابق الیکشن کمیشنر اب سوئی گیس کے زہر کے اثرات سے بحال ہو چکے ہیں۔ اگر یہ درست ہے تو پھر قرطاس ایضاً کے مرتبین کا یہ فرض بنتا تھا کہ وہ اس بنیادی اہمیت کے حامل فرد کا بیان ریکارڈ

کرتے اس نامکمل دستاویز کے درمیان جو خلا باقی ہے اسے اس عرصہ میں پر کیا جاسکتا تھا۔ اگر سابق جج اس وقت جبکہ ”چریلوں“ کا شکار ہو رہا تھا دستیاب نہیں تھا تو اس کی صحت کی بجائی کے بعد اس کا بیان ریکارڈ کیا جانا چاہیے تھا۔ اس طرح اس دستاویز کی اہمیت میں اضافہ ہوتا۔ قرطاس ایضاً کی ترسیل میں اس قسمیے کے اضافے کی وجہ سے ایک دو ہفتوں کی تاخیر ہو سکتی تھی۔ اب قاری اس گہرے اور خوفناک خلاء سے خود ہی نتائج اخذ کر سکتا ہے کہ اس دستاویز کی کیا حیثیت ہے؟

موجودہ چیف

یہ اس فوجی ٹولے اور حکومت کی مکاری واضح ثبوت ہے کہ چیف الیکشن کمیشن کے آزاد اور خود مختار عہدے کو ایسے بخر بن اور دھاندلی سے مسح کیا گیا کہ چیف الیکشن کمیشن کا عہدہ اور لاہور ہائی کورٹ کے چیف جسٹس کا عہدہ ایک کر دیا گیا۔ لاہور ہائی کورٹ کا چیف جسٹس جسے اس وجہ سے شہرت حاصل ہوئی کہ میرے خون کا پیسا سا ہے۔ اس چیف الیکشن کمیشن کو میری ذات سے جو عناد ہے اسے اب بین الاقوامی سطح پر محسوس کیا جاسکتا ہے۔ یہ ایک ایسی شخصیت حقیقت ہے جس کی نفی نہیں کی جاسکتی۔

اس شدید عناد کا پس منظر بھی ہے مولوی مشتاق حسین نے میری نظربندی کی درخواست کی سماعت ان کمرہ لاہور جیل کیسپ کی دیواروں کے پیچھے سماعت کرنے مسرت کا اظہار کیا تھا۔ یہ جنوری ۱۹۶۹ کا واقعہ ہے بہر حال یہ وہ نہیں تھے جنہوں نے مجھے نظربندی سے رہائی دی بلکہ حکومت تھی جس نے میری نظربندی کے احکام حالات و واقعات کے پیش نظر واپس لے لئے تھے۔

حالات کے تبدیل ہونے کے بعد جب میں صدر پاکستان بنا تو مولوی مشتاق حسین نے پنجاب ہاؤس راولپنڈی میں مجھ سے ملاقات کی انہوں نے اپنی خواہشات کے حوالے سے سید سے اور واضح اشارے دئے اور یہ تجویز پیش کی کہ ایسے نازک حالات میں جو پاکستان کی تاریخ میں آئے ہیں صدر کو ایک ایسے با اعتماد شخص کی ضرورت ہے جو عدلیہ پر کنٹرول کر سکے۔ جب ان کی امیدیں پوری نہ کر سکا تو بہت بد دل اور منفعل ہوئے اس کے کچھ ماہ بعد جب سردار محمد اقبال کو میری حکومت نے لاہور ہائی کورٹ کا چیف جسٹس مقرر کر دیا تو ان کی ناراضگی میں مزید اضافہ ہوا۔ انہوں نے اپنے غصے کو پھپھانے کی کوشش بھی نہیں کی ابھی ناراضگی کا اظہار انہوں نے کئی طریقوں سے اپنی سرکاری اور دوسری حیثیت سے کیا۔ اس نے پنجاب کے سابق گورنر

اور وزیر اعلیٰ غلام مصطفیٰ کھر کو تجویز پیش کی کہ میرے سر پر گولی مار دی جائے اس کے بعد جب آئینی ترمیم کے بعد مسٹر جسٹس اسلم ریاضی حسین کو پنجاب ہائی کورٹ کا چیف جسٹس بنایا گیا تو انہوں نے اس دوسری سبقت کو ایک ناقابل برداشت اہانت قرار دیا اور اس حد تک کہ میرے مقدمہ قتل کی سماعت کے پہلے دن ہی انہوں نے اپنے ججے کا اظہار کر دیا اور بطور خاص ان پر ان پر سبقت دے کر دوسروں کو چیف جسٹس بنانے کو ایک "منافقانہ کس" قرار دیدیا۔

اس سے پہلے ۱۹۷۵ کے موسم خزاں میں انہوں نے مسٹر عبدالحق ظاہر زادہ کے ساتھ ناخوشگوار اور ناقابل ذکر رویے کا اظہار کیا جو ایک سینئر وفاقی وزیر تھے۔ جب دوسری بار ان پر سبقت دی گئی تو انہوں نے اپنے سرکاری فرائض کو سنجیدگی سے ادا کرنے کا عمل ترک کر کے، اپنے جیمیز میں بیچ و تاب کھاتے رہے۔ معمولی سی بات پر دو بار پپر وائر کرنے لگے جب ۵ جولائی ۱۹۷۷ کو حکومت کا جبراً تختہ الٹا گیا تو وہ اس وقت یورپ میں تھے۔ قومی ٹی وی کے رکن لیڈروں نے انہیں اپنے اندرونی ٹولے کا رکن بننے کے لئے پاکستان طلب کر لیا۔ اس دعوت کا خیر مقدم انہوں نے کسی جنونی کے سے شوق و جوش سے کیا۔

سروسز میں میرٹس کے اعتبار سے ان کا معاملہ دوسرا تھا تاہم انہیں فی الفور پنجاب ہائی کورٹ کے ایڈمنسٹریٹو چیف جسٹس کا عہدہ دیدیا گیا۔ چیف جسٹس کی حیثیت سے ان کے عہدے کی توثیق میرے خلاف مقدمہ قتل کے دوران کر دی گئی۔ ایک ہی وقت میں جبکہ ان کی تقرری بطور ایڈمنسٹریٹو چیف جسٹس ہوئی اور چیف ایڈمنسٹریٹو کی حیثیت سے عہدے پر بھی فائز کر دیا گیا۔ انہوں نے اپنی اس تقرری کو پاکستان پیپلز پارٹی پر شرمناک حملہ کر کے بے مقصد کر دیا۔ انہوں نے پاکستان پیپلز پارٹی اور میری حکومت پر یہ گھنٹیا حملہ اپنے اس انٹرویو میں کیا جو ریڈیو اور ٹی وی پر سنا اور دیکھا گیا۔

اس وقت جب انہوں نے ۱۳ ستمبر ۱۹۷۷ کو مقدمہ قتل سنبھالا مسٹر جسٹس صدیقی اور مسٹر جسٹس نظیر الحق پر مشتمل ڈویژنل بینچ کو بحال باہر کیا جو کہ اس کیس کی پیچھے سے سماعت کر رہے تھے تب سے لے کر مقدمہ قتل میں اپنے فیصلے مورخہ ۱۸ مارچ ۱۹۷۸ تک لاہور ہائی کورٹ کے چیف جسٹس کارویہ ایک تکلیف دہ اور تلخ طویل داستان ہے۔ انہوں نے اپنے اختیارات کا ناجائز استعمال کیا اور لاہور ہائی کورٹ کے چیف جسٹس کی حیثیت سے جو رویہ اختیار کیا اس کے نمایاں پہلوؤں کو میں سپریم کورٹ میں اپنی اپیل کے میمورنڈم میں شامل کر چکا ہوں اس لئے میں نہیں چاہتا کہ اس کہانی سے اپنی روایت کو بوجھل کر وہ مجھے پھانسی دینے اور جب تک مر نہ جاؤں پھندے سے لٹکا رہے کہ الفاظ جو ان کے فیصلے میں ہیں انہوں نے ان الفاظ کو پیشی دے

کے ساتھ ادا کیا اور حکم دیا کہ مجھے پھانسی کو ٹھری میں منتقل کر دیا جائے جو کہ موت سے بھی زیادہ اہانت آمیز ہے۔

ان سب چیزوں کی تاجپوشی کرتے ہوئے، قرطاس ایض جو مارچ ۱۹۸۸ کے عام انتخابات کے انعقاد و عمل کے بارے میں ہے ۲۵ جولائی ۱۹۷۸ کو ایسے وقت ہنگام میں جاری کیا گیا جب میرا وکیل صفائی عدالت میں اپنی آخری تقریر کرنے والا تھا۔ اس سے پہلے ہی استغاثہ نے موجودہ حکومت کی طرف سے بولنا شروع کر دیا۔ جبکہ موجودہ حکومت اس دستاویز کے ذریعہ براہ راست میرے خاتمے اور تباہی کے لئے بول اٹھی ہے۔ قرطاس ایض کے متبادروں کے ذریعے دراصل دفاع کو گھیرے میں لینا اس کا اصل مقصد ہے۔

انتخابات پر قرطاس ایض بنیادی طور پر الیکشن کمیشن کے اختیارات اور دائرہ کار میں آتا ہے۔ تاہم دوسرے طبقے اس میں مناسب تعاون کا کردار ادا کرتے ہیں۔ میں یہاں مثال سے واضح کرنا چاہتا ہوں کہ انتخابات سے متعلق تمام امور میں چیف الیکشن کمیشن کی ذمہ داری اسی طرح کی ہوتی ہے۔ جیسے کہ ایک زمانہ بینک اور امن کے امور میں ایک سپریم کمانڈر کی ہوتی ہے۔ جس کے ساتھ وزارت خارجہ ایک معاون کا کردار ادا کرتی ہے۔ اسی طرح وزارت قانون وہ وزارت ہے جو الیکشن کمیشن کے متعلقہ امور کے ساتھ تعاون کا کردار ادا کرتی ہے۔ انٹرنی جنرل کا کاؤنٹر پارٹ پیئر مین آف دی جوائنٹ چیف آف سٹاف ہے میں یہ رائے ایک بے خبر اور سزا یافتہ "قاتل" کی حیثیت سے نہیں دے رہا بلکہ اپنے تمام تر انتظامی تجربے کی بنیاد پر دے رہا ہوں میں آٹھ برسرِ تلک وفاقی وزیر رہا اور ساڑھے پانچ برس تک پاکستان کا صدر اور وزیر اعظم رہا تھا۔ یہاں اور وہاں قرطاس ایض کے مرتبین کی کٹھری بیوشنز دکھائی دیتی ہیں۔ کوئی بھی یہ آسانی دیکھ سکتا ہے کہ شور بے میں کتنی اٹھائیاں ڈالی ہوئی ہیں طرح طرح کے اشارے ملتے ہیں اس کی مثال محض (iii) ہے جس میں تعارف کو اس طرح ایجنٹی کلائیکس نوٹ کے ساتھ حاتمے تک پہنچایا گیا ہے۔

قرطاس ایض میں جو چیزیں نقل کی گئی ہیں۔ ان میں، بچوں اور املاک جو غلطیاں ہیں۔ ان کے لئے ایک حرف معذرت کی ضرورت پڑتی ہے چونکہ بنیادی طور پر یہ ان دستاویزات کی غلطیاں ہیں۔ اس لئے کوئی ایجنسی کو شش نہیں کی گئی کہ گرامریا، بچوں وغیرہ کی غلطیاں دود کی جائیں یہاں جو مشکوک صلاحیت کے سنیوں گرافوں نے ریکارڈ کئے انہیں بھی اسی صورت میں چھو گیا ہے کہ وہ قطعی طور پر مبہم رہ جائیں۔ سیاسی/سرکاری اصحاب نے اپنے نکتہ کو نمایاں

کرنے کے لئے کمیٹی (لیٹرڈ) (بڑے حروف) استعمال کئے ہیں اس لئے متن کے اپنے ورژنوں میں کسی قسم کی مداخلت کرنے کی کوشش نہیں کی گئی۔ قرطاس ایض کے صفحہ ۳۱ پر بیان ہوتا ہے مسٹر بھٹو بطور خاص اس حلقہ نیابت کے مسئلے میں بہت ناراض تھے۔ جو شاید میر پور خاص کی حلقہ نیابت میں ہے جس میں مسٹر قائم علی شاہ وچپی رکھتے تھے۔ میرے نام یہ بیان وقار احمد سابق کیمنٹ سیکرٹری کے حوالے سے مملووب کیا گیا ہے۔ لیکن صرف وہی شخص جو سندھ کا ابتدائی سیاسی صورت حال سے ناواقف ہو وہی اس بات کو قرطاس ایض میں شامل کر سکتا ہے۔ اس قسم کے بیانات نے اس دستاویز کی سمجھ کو بری طرح ہلا کر رکھ دیا ہے۔ قائم علی شاہ کا تعلق خیرپور بالائی سندھ سے ہے۔ نشیبی سندھ کے میرپور خاص سے اس کا کوئی تعلق یا واسطہ سرے سے نہیں بنتا۔ مسٹر بروہی جو کہ مسٹر قائم علی شاہ کے براہ راست ساتھی ہیں وہ میری اس رائے کی تصدیق کر سکتے ہیں۔

یہ حقیقت ہے جس کا اظہار خود قرطاس ایض کرتا ہے کہ اس رہنما حکمران ٹوٹے ہوئے جو مواد اور بنیادیں جمع کیں وہ پوری کی پوری اس میں پیش پیش نہیں کی گئی۔ تعارف میں صفحہ (ii) پر بتایا جاتا ہے۔

نہ یہ ممکن تھا نہ ہی مفید کہ کمیٹی کی تمام رپورٹیں منقل کی جاسکتیں.....

ان کی صحت کا انحصار چند ماہرین پر کیا گیا۔ اور ایک رپورٹ پر جسے انکوائری کمیٹی نے اختیارات کے غلط استعمال دوسرے غلط کاموں کے لیے تیار کیا تھا۔ اس کے لئے انکوائری کمیٹی نے مسٹر محمد خان جو نوجو حکومت سندھ کے سابق سیکرٹری داخلہ تھے، ان کے بارے میں تہی جواب معطلی کے بعد نظر بند ہیں چونکہ یہ رپورٹ انتخابات میں صرف ان کے کردار سے تعلق رکھتی تھی اور ایک ضمیمہ دستاویز ہے۔ اس لئے یہ ممکن نہ تھا کہ اس پوری رپورٹ کو بطور ایک ضمیمہ شامل کیا جاسکتا۔

جوئے فریب پر مشتمل غامض کار اور نامکمل مواد کو میرے خلاف استعمال کرنا پہلے سے ذہنوں میں طے کر لیا گیا تھا جو حوالہ نیچے دے رہا ہوں وہ وائنٹ پیپر کے متن میں شامل ہے۔

مارچ ۱۹۷۷ء کے انتخابات کے بعد حزب اختلاف نے ہر حلقہ انتخاب کے بارے میں ایک طوفان کھڑا کر دیا۔ وہ چاہتے تھے کہ انتخابات کا اہدم قرار دینے جائیں، کیونکہ ہر حلقہ کے انتخاب میں وحاندلیاں ہوتی تھیں۔ یہ صورت حال بہت ابتر تھی اور غلط تاہم حزب اختلاف کا تمام انحصار میرٹس پر نہیں بلکہ محض الزامات پر تھا۔ جب یہ احتجاج اپنے عروج پر پہنچا تو ان کا مطالبہ زیادہ غیر معقول ہو گیا۔ لیکن قرطاس ایض نے ملک کے تمام حلقہ انتخابات میں سے صرف دو حلقہ

بائے انتخابات کا چناؤ کیا ہے جس سے وحاندلیوں کے پھیلناؤ کو واضح کیا جاسکے۔

ایک کا تعلق محلی بختیار سابق اٹارنی جنرل اور میرے وکیل صفائی سے ہے دوسرا حلقہ انتخاب کا تعلق ایمٹ آباد سے ہے۔ جسے محض اس لئے پیش کیا گیا ہے کہ اسے مسٹر محلی بختیار کے خلاف پیش کئے جانے والے مواد کو توازن سے چکنا کر کے تقویت دی جاسکے۔ اس کاروبار میں جو ایسی چالیں چلی جاتی ہیں ہم انہیں بہت اچھی طرح جانتے ہیں مسٹر محلی بختیار کا استابڑا سکینڈل بنا دیا گیا ہے کہ اس کا خاص حوالہ نوٹس باب میں دیا گیا ہے مزید برآں اسے باب دوئم میں بھی یہی اہمیت دی گئی ہے۔ اس سے صاف عیاں ہے کہ قرطاس ایض کے مرتبین مسٹر محلی بختیار سے اتنی نفرت کرتے ہیں، جتنی کہ مجھ سے۔ یہی وجہ ہے کہ جان دی میسپسٹ اور اس کے رہنما کی جگہ برابا کو منتخب کیا گیا ہے۔ اور پھر یہ دیکھیں کہ داستان طرازی کی حکایتوں کے اس مجموعے قرطاس ایض میں اپنی توجہ کا مرکز ایک ایسے حلقہ انتخاب کو بنایا ہے جو انتہائی دور افتادہ ضلع پشین میں ہے۔

قرطاس ایض کے صفحات ۱۵۲ اور ۱۵۳ اس حوالے سے درج کئے جانے کی ضرورت ہے کہ ایک وکیل دفاع نے اپنے ملزم سزایافتہ کے لئے جو آزادیاں اور سہولتیں مانگی تھیں ان کی تحریف کی گئی اس سے یہ بھی دیکھا جاسکتا ہے کہ وہی شخص اسی غیر اطلاقی صورت حال تک جاسکتا ہے جو اپنے جرم کے رد عمل میں شدید پریشانی اور تکلیف میں مبتلا ہو۔

مسٹر مسعود نبی نور نے ایک اور ڈائریکٹو اپنے ایڈیشنل سیکرٹری کو ۳ مئی ۱۹۷۷ء کو جاری کیا (ضمیمہ ۱۳۸) یہ ہدایت کاہینہ کے اس فیصلے پر مشتمل تھی جو گورنمنٹ ہاؤس کی ایک میٹنگ میں کیا گیا کاہینہ کی میٹنگ کی کارروائی کے متعلق

مشتمل منٹس کا خلاصہ مندرجہ ذیل ہے :

”وزیراعظم اس پر خوش ہوئے کہ مجوزہ معاہدے کو قبول کر لیا جائے گا تو وہ ایک اور مسئلہ کو اٹھائیں گے۔ بہت سے اخبارات ایسے لوگوں کے پیغام شائع کر رہے تھے جو جیلوں میں بند تھے۔ جب ایک شخص کو جیل بھیج دیا جاتا ہے تو اسے اس کی آزادی سے محروم کر دیا جاتا ہے۔ اس لئے پریس کسی کے پیغامات شائع نہیں کر سکتا۔ مزارت اطلاعات کو چاہئے کہ وہ اخبارات کے خلاف کارروائی کرے۔“

۴ مئی ۱۹۷۷ء کو یہ معاملہ پھر اجلاس میں زیر بحث لایا گیا۔ جس کی صدارت سابق وزیر اعظم نے کی تھی۔ جن کی ہدایت تھی کہ براہ راست اور فوری کارروائی ان لوگوں کے خلاف کی جائے جو اس قانون شکنی کے مرتکب ہوئے ہیں۔ یہاں قانون شکنی کرنے والوں کا فطری

مفہوم اخبارات ہیں جو ان لوگوں کے لیے غنایات اخبارات میں شائع کر رہے ہیں جو پی این اے کی تحریک میں شامل ہونے کی بنا پر جیلوں میں بند تھے۔

زیر حوالہ ڈائریکٹور کے مطابق وزیراعظم نے یہ پالیسی جاری کی کہ اگر ضروری ہو تو وزارت اطلاعات و نشریات اپنے ہیڈ کوارٹر کے قانونی مشیر کو رکھے، جس کے سامنے ایسی نوعیت کے کیس قانونی مشورے کے لئے پیش کئے جائیں۔ مزید برآں یہ معاملہ میں عمومی ایڈوائس لا ڈویژن سے حاصل کی جائے۔ (اس کا موازنہ ان سہولتوں کے مطابق سے کیا جاسکتا ہے جو مسٹر بھٹو اور اس کے وکیل نے ان پر مقدمہ چلائے جانے کے وقت سے کئے ہیں)

صفحہ ۱۵۵ پر ”چکنا“ کے زیر عنوان قریطاس ایڈیشن کے مختلف نے بڑی تنقیدیں و مبالغے سے یہ بتایا ہے کہ میں نے کس طرح اپنے مخالفین کو ”چکلا“ اور دیا یا۔ میں نے ”چکلا“ کا کون سا کام کیا؟ وقافی وزیر اطلاعات و نشریات نے ایک ایسے اخبار کے بارے میں بعض انتظامی تدابیر اختیار کرنے کی تجویز پیش کی جو بغاوت کے شعلوں کو بوا دے رہا تھا۔ ”کافروں“ کے خلاف جہاد کے لئے پکار رہا تھا۔ اور کسی بات پر رک ہی نہیں رہا تھا۔ یہ اخبار بعض لیڈروں، رجعت پسندوں، موقع پرستوں اور مخالفت برائے مخالفت کرنے والوں کے نصب العین کا چمپین تھا۔

لیاقت علی خان، پاکستان کے پہلے وزیراعظم کے زمانے سے اس اخبار نے ایک عدم تحمل اور امتیاز کے اصول کی راہ اختیار کی تھی۔ اس اخبار کے قائل اس حقیقت کی گواہی دیتے ہیں کہ اس نے بلا جواز اور بے بنیاد انداز میں ملک کے منتخب وزیراعظم پر وحشیانہ حملے کئے اور تنقید کی بطور خاص ملک کے پہلے اور دوسرے وزیراعظم لیاقت علی خان اور خواجہ ناظم الدین بطور خاص اس کے بے رحم حملوں کا ہدف بنے۔ اور اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی اس اخبار کا وطیرہ رہا کہ وہ ڈکٹیٹروں اور ڈکٹیٹروں جیسے گورنر جنرلوں، غلام محمد اور پیٹھ مارشل لائیڈ منسٹر جنرل ضیاء الحق کی حمایت کرتا رہا۔

۱۹۷۷ء کے موسم بہار میں ہونے والی گزٹ میں اس نے تمام حدود پار کر دیں، ہر رکاوت کو توڑ دیا۔ حکومت اگر اسے مزید ابھرنے فراہم کرتی تو اپنے ان فرائض سے غفلت برستی جو عوام نے اسے سونپے تھے۔

اس اخبار کی انتہائی اشتعال انگیزی کے باوجود میری حکومت نے اس کے ایڈیٹر کے خلاف کوئی فرضی مقدمہ قتل قائم نہیں کیا۔ نہ ہی اسے التا لکھنے کی یہ دھمکی دی۔ ہم نے نہ تو صحافیوں کو کوڑے لگائے اور نہ ہی اس اخبار کا پرنٹنگ پریس چوری کر لیا۔ نہ ہی اس کی اشاعت

ایک رات کے لئے بھی بند کی۔ ”چکلا“ کا عظیم مشورہ جو وقافی وزیر اطلاعات نے دیا تھا وہ کچھ یوں تھا:

(۱) تمام سرکاری اشتہارات بند کر دئے جائیں۔ یہ تجویز سرکاری اشتہاروں کے لئے پیش کی گئی تھی۔ کیونکہ یہ حکومت کی تحویل میں ہوتے ہیں اس لئے ان سرکاری اشتہارات کو روک دیا جائے۔

(ب) ایڈیٹر ایڈیٹر کی انکم ٹیکس ریٹرن کے بارے میں انکوائری شروع کی جائے۔ کسی قسم کی دھمکی پر مبنی اور نہ ہی انکم ٹیکس کے جعلی مطالبات کئے گئے۔ کوئی بھی حکومت اس کی مجاز ہوتی ہے کہ اس اخبار کے خلاف قانونی اور مجاز جعلی انکوائری کر اسے کیونکہ اس اخبار کا کاروبار بڑا وسیع ہے اور اس کی اشاعت اسی پر زاریاں ہیں۔

(ج) پنجاب گورنمنٹ سے کہا جائے کہ اس ایڈیٹر نے جو جائیداد حاصل کی ہے اس کی انکوائری کرے۔ یہ سفارش بھی قابل اعتراض نہیں ہے۔

(د) پرائیویٹ اداروں کو کہا جائے کہ وہ اس اخبار کو اشتہارات بھیجنا بند کر دیں۔ میں یہ بات دہراؤں گا کہ میں نے اس تجویز سے اتفاق نہیں کیا۔ جس کی تصدیق ان اشتہارات سے کی جاسکتی ہے جو اس اخبار میں اس خاص زمانے میں شائع ہوتے رہے۔

(ہ) تمام صوبوں، خود مختار اور نیم خود مختار اداروں سے کہا جائے کہ وہ اس اخبار کو خریدنا بند کر دیں۔ یہ ایک ایسی چکانہ سفارش تھی کہ اگر میں وزیر کو یہ بتاتا کہ یہ انتہائی چکانہ تجویز ہے تو اسے تنکیف ہوتی۔

قریطاس ایڈیشن میں بتایا گیا ہے کہ میں نے یہ تجویز ۲۶ اپریل ۱۹۷۷ء کو منظور کر لی۔ میں اس کا فیصلہ پاکستان کے عوام پر چھوڑتا ہوں کہ ”چکلا“ کا یہ عمل، اگر اسے پوری طرح سے نافذ العمل کیا جاتا تو زیادہ ڈراکونین تجویز ہوتا یا جو کچھ موجودہ فوجی ٹولے لے گیا ہے۔ اس فوجی ٹولے کے پاکستان میں پریس اور صحافیوں کے ساتھ جو سلوک کیا ہے۔ اسے کس عمل کا نام دیا جائے گا۔ اس سلسلے میں میں یہ بھی لکھوں گا جو سلوک میرے اخبار اور اس کے پریس کے خلاف کیا گیا اسے ایک طرف رکھ کر، مختار انداز کر کے پریس اور صحافیوں پر کیا جاتی۔ ہینلز فاؤنڈیشن پر غیر قانونی اور جبری قبضہ کر لیا گیا اور اس کے ساتھ ساتھ ہلال پاکستان اور اس کے پرنٹنگ پریس کو بھی ہتھیالیا گیا۔ ان کا یہ عمل، اس موجودہ فوجی حکمران کے اپنے معیار کے مطابق، متقاضی کرتا ہے کہ ان کے دونوں ہاتھ کاٹ دئے جائیں۔ آئیے، ان باتوں کو ایک طرف رکھتے ہیں۔ لیکن میں صحافیوں کو کوڑے لگائے گئے، مختار انداز نہیں کر سکتا۔ ”اصطح“ اور ”معیار“ کو جس طرح بند کیا

گیا اسے ہم فراموش نہیں کر سکتے۔ فوجی سرینوئلز نے سرسری سماعت کے بعد ہمارے ساتھیوں کو جو سزائیں دیں وہ بھلائی نہیں جاسکتی ہیں۔ اس وقت جبکہ میں یہ سطور لکھ رہا ہوں، صحافی بدستور گرفتار کئے جا رہے ہیں۔ ان کی اکثریت گزشتہ چھ ماہ سے جھوک پڑتال کر رہی ہے۔ گزشتہ تیس برسوں میں جتنے آدمیوں نے جھوک پڑتال کی۔ ان کی تعداد ان سے کہیں زیادہ ہے۔

قرطاس امتیض کے صفحہ ۳۹۳ پر بیان کیا گیا ہے کہ۔ ”مسٹر یحییٰ بختیار کی چیئر مین شپ اس پیشہ ورانہ کمیٹی کے ارکان میں ان کے لئے کسی نرم گوشے کا نتیجہ نہیں تھی کہ جس پیشے سے وہ تعلق رکھتے ہیں۔“ یہ پُر خیال خراج تحسین جو مسٹر یحییٰ بختیار کو پیش کیا گیا، جو اس وقت اٹارنی جنرل تھے اور انہیں لایٹننٹ آرڈر کمیٹی کا چیئر مین میں نے مقرر کیا تھا۔ درجہ کی پر مبنی اس دستاویز کے خالق کو ہی یہ زیب دیتا تھا کہ ایسا رویہ اختیار کرے۔ کیونکہ ایسی بات کہنے والے کو ہی یہ یہ صلاحیت گویا ملی ہے کہ وہ دوسروں کے دلوں کے اندر جھانک کر دیکھ سکے۔ اصل مقصد تو مسٹر یحییٰ بختیار سے انتقام لینا ہے۔ کیونکہ وہ میرے وکیل صفائی ہیں۔ اس لئے ان کے خلاف دوسروں کے دلوں میں تعصب اور عناد پیدا کرنا حقیقی نصب العین ہے!

قرطاس امتیض کے صفحہ ۴۰۳ پر یوں بیان کیا گیا ہے:

”مسٹر زیڈ اے بھٹو جب تک اپنے عہدے پر فائز رہے، یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ تاریخ کا بڑا شعور رکھتے ہیں۔ ان کا دعویٰ ہے کہ وہ نہ صرف یہ کہ تاریخ کے طالب علم ہیں بلکہ تاریخ ساز بھی ہیں۔“

لاہور میں مقدمہ قتل کی خفیہ سماعت کے درمیان چھپتے ہوئے لہجے اور طنز مسکراہٹ کے ساتھ لاہور ہائی کورٹ کے چیف جسٹس نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا تھا:

”آپ کا دعویٰ ہے کہ آپ تاریخ کے طالب علم ہیں اور مجھے اطلاع دی گئی ہے کہ آپ کا یہ دعویٰ بھی ہے کہ آپ تاریخ ساز بھی ہیں۔“

قرطاس امتیض کے ایک بڑے حصے میں حلقہ انتخابات کی حدود میں تبدیلی کرنے کو جو موضوع بنایا گیا ہے۔ اس سارے قصے کا مقصد یہ ہے کہ میں نے حلقہ ہائے انتخابات کو نئے سرے سے ”سیا“ اور بطور خاص ضلع کجرات میں۔ یہ سراسر جھوٹ ہے۔ میں کوئی درزی تو نہیں ہوں کہ حلقہ ہائے انتخابات کی سلامتی کرتا ہوں۔ کجرات کا یہ قصہ اس لئے بیان کیا گیا ہے کہ ایک سیاست دان کو شیرنا کر پیش کیا جائے اور یہ دکھایا جاسکے کہ اس ضلع میں اس کا اثر و رسوخ ناقابلِ تخیل ہے۔ میں اس سے قطعی متاثر نہیں ہوں۔ میں اس کے اثر و رسوخ کا نظارہ اس

زمانے سے کر رہا ہوں جب وہ مغربی پاکستان کی حکومت کے ایک ری پبلکن وزیر کے برآمدے میں بیچ پر بیٹھا کرتا تھا۔ میں جانتا ہوں کہ وہ کس طرح گڈگڑاتا ہوا میرے پاس آیا اور میرے قدموں میں گر پڑا۔ جب مغربی پاکستان کا ایک تمام طاقت رکھنے والا گورنر اس کی بدعنوانیوں کے خلاف کارروائی کرنے والا تھا۔ میں اسلامی جمہوریہ پاکستان کے صدر کو اس معاملے میں ڈالتا ہوں، جس کے نعرے کجرات میں لگتے ہیں کہ وہ اس کی تردید کرے کہ میں جو کچھ کہہ رہا ہوں وہ غلط ہے۔

یہ سچ ہے کہ مجھے ایسی کئی درخواستیں موصول ہو رہی تھیں کہ بعض حلقہ ہائے انتخابات میں تبدیلی کی جائے۔ یہ درخواستیں جسے پاکستان پیپلز پارٹی کے چیئر مین اور ملک کے وزیر اعظم کی حیثیت سے مجھ کو جاری تھیں۔ اور ایسا ہونا قطعی طور پر نارمل اور فطری ہوتا ہے۔ ہر بار جب حلقہ ہائے انتخابات کی حدود میں تبدیلی کی جاتی ہے سیاست دان دروازوں کو کھٹکھٹاتے رہے ہیں۔ تحریری اور شخصی طور پر الیکشن کمیشن کا بھی محاصرہ کیا جاتا ہے۔ سوال تو یہ ہے کہ کیا میں نے اس کام کے لئے اختیارات اور اثر و رسوخ کا ناجائز استعمال کیا یا ان حلقہ انتخابات کی نئی حدود میں سے لے دیا ڈالا؟

اس سے قطع نظر کہ الیکشن کمیشن کا سیکرٹری کیا کہتا ہے میں بطور خاص یہ کہنا چاہتا ہوں کہ میں نے اس معاملے میں کسی قسم کی غیر معمولی یا عام ذکر سے ہٹ کر دلچسپی نہیں لی۔ اور حقیقت یہ ہے کہ سیکرٹری الیکشن کمیشن مجھے اس میں ملوث ہی نہیں کرتا، وہ تو جھانپوں میں بھٹکتا ہوا ملتا ہے۔ اس نے ذہنی کشن لاکھ لاکھ کے الیکشن کمیشن کے دفتر میں آنے جانے کا ذکر کیا ہے۔ وہ بڑے پراسرار اور مبہم انداز میں ان بینکامی اجلاسوں کا ذکر کرتا ہے جہاں نئی تجاویز پر غور ہو رہا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ یہ تسلیم کرتا ہے کہ ”اسے ان ذرائع کا علم نہیں ہو سکا کہ یہ نئی تجاویز اور سفارشات کہاں سے آ رہی تھیں۔“ اس قصے کی طوالت اور اختصار کا خلاصہ یہ نکلتا ہے کہ میرے خلاف عناد رکھنے والا یہ شخص مجھے ملزم نہیں ٹھہراتا کہ میں نے غیر مناسب اور ناجائز اثر و رسوخ استعمال کیا تھا کیونکہ وہ ایسا ثابت ہی نہیں کر سکتا۔ میں کسی طرح ہمارے سیاست دانوں کا ذمہ دار نہیں جو حزب اقتدار یا دوسری جماعتوں سے تعلق رکھتے تھے اور انہوں نے چیف الیکشن کمیشن کے سامنے اپنی تجاویز اور سفارشات پیش کیں۔ ان سیاست دانوں کو قانون کے مطابق یہ حق حاصل تھا اور اسی طرح الیکشن کمیشن کا یہ فرض تھا کہ وہ ان کی درخواستوں کی تحمل سے سماعت کرے۔ یہ فیصلہ اور طے کرنا الیکشن کمیشن کا کام ہے کہ جن لوگوں نے ان کے ساتھ رابطہ قائم کیا، انہوں نے قانونی طور پر حق استعمال کیا یا نہیں؟

قرطاس اینٹس کے صفحہ ۳ پر کہا گیا ہے کہ وہ حلقہ ہائے انتخابات جو سیاسی دباؤ کے تحت تخلیق کئے گئے۔ ان میں ایک وہی حلقہ انتخابات بطور خاص کراچی کے نواح میں تخلیق کیا گیا جو مسٹر حفیظ پیر زاہد کو پوری طرح ملوث کرتا تھا۔

یہ ہے وہ بیان جو الیکشن کمیشن کے سپرٹری اے ٹیڈ فاروقی نے کمرٹل پرو سجر کوڈ کے سیشن ۱۶۱ کے تحت، ۳۰ مارچ ۱۹۷۸ کو عبدالرحمان خان، عدیشی ڈائریکٹر فیڈرل انویسٹی گیشن اتھارٹی کے سامنے رکارڈ کرایا۔ ضمیمہ ۲۷ کے مطابق اس کے صفحہ ۸۶ اے کے حاشیہ پر ”الیکشن کمیشن کے فاضل نقل“ کے الفاظ لکھے ہوئے ہیں۔ جو ڈپٹی ڈائریکٹر ایف آئی اے کے ہاتھ کے ہیں۔ اور اس کے دستخط بھی اس پر موجود ہیں۔

مسٹر حفیظ پیر زاہد کے سابق پیف الیکشن کشر کے ساتھ انتہائی دوستانہ مراسم تھے یا نہیں! جیسا کہ یہ بات پہلے نوٹ کی گئی ہے، بہر حال ایک میٹروپولیٹن شہر میں ایک دیہی حلقہ انتخابات کی تخلیق، کسی طرح بھی علی تجویز کی ذیل میں نہیں آتی۔ یہ ممکن نہیں ہے کہ کسی طرح سرے کا دیہاتی علاقہ اٹھا کر عین پکاڈلی سرکس کے مرکز میں کاڑ دیا جائے۔ اگر کسی شہر کے گرد و نواح میں دیہی علاقہ موجود نہ ہو تو یہ اس شہر کے ارد گرد اسے سبز پٹی کی طرح تخلیق نہیں کیا جا سکتا۔ اس معاملے کی حقیقت یہ ہے کہ ملیر کا علاقہ جہاں سے مسٹر پیر زاہد نے انتخابات میں حصہ لیا۔ کراچی کا نواحی یہ وہی دیہی علاقہ ہے۔ ملیر کا علاقہ ہمیشہ سے وہیں رہا ہے جہاں وہ اب موجود ہے۔ ملیر کو کبھی سکھر کی طرح کراچی سے دور دراز کا علاقہ نہیں سمجھا گیا۔ اس لئے مسٹر پیر زاہد کے خلاف جو الزامات لگانے گئے ہیں وہ جھوٹ ہیں۔

قرطاس اینٹس کے صفحہ ۵۹ پر لکھا ہے کہ حلقہ انتخابات کی مٹی حدود اور کانٹ چھانٹ کے باوجود جو کچھ حاصل ہوا تھا، مسٹر بھٹو اس سے مطمئن نہیں تھے۔ ان کی توقعات پوری نہیں ہوئی تھیں۔ اس لئے انہوں نے اپنے سپیشل اسٹنٹ کو جو ان کا سیاسی مشیر بھی تھا خصوصی ہدایات جاری کیں۔

یہ رائے بڑی مثبت ہے۔ مثال کے طور پر دیکھیے۔ مسٹر سندر خان سندرانی نے حلقہ ہائے انتخابات نمبر ۱۱، ۱۲، ۱۳، ۱۴ اور ۱۵ ضلع جیکب آباد کے بارے میں شکایت درج کرائی۔ مسٹر بھٹو نے اس پر لکھا ”Donot“۔ (اور اسے دوبار خط کشیدہ کیا) سندرانی کی تجاویز پر عمل نہ کیا جانے حالانکہ سرکاری طور پر وہ پاکستان پیپلز پارٹی میں ہے۔

یہ تمام سیاسی جماعتوں، جن میں حکمران جماعت بھی شامل ہوتی ہے کا جائز حق ہے کہ وہ

الیکشن کمیشن کی نئی حد بندیوں کے بارے میں مناسب ذرائع سے اپنی تجاویز پیش کرے۔ یہی کچھ ہم نے اپنے قانونی حق کے مطابق کیا۔ کسی بھی حکمران پارٹی کے اس حق کو یہ نام دیا جاسکتا کہ اس طرح وہ حزب اختلاف کے خلاف کام کر رہی ہے۔ یہ الیکشن کمیشن کا فرض اور اسی کے دائرہ کار میں ہے کہ وہ ایسی تجاویز کو قبول کرے یا رد کرے۔ جبکہ الیکشن کمیشن نے جو فیصلے کئے وہ میری سیاسی جماعت اور حزب اختلاف دونوں کی تجاویز سننے کے بعد کئے۔ لیکن یہ میری سیاسی جماعت، جو حکمران پارٹی تھی، اس کا قانونی حق تھا کہ وہ اپنے ذرائع کو اختیار کرے۔ اور اس کے ساتھ سیاسی قانونی برتاؤ کیا جائے جیسا کہ حزب اختلاف کے ساتھ کہ وہ حد بندیوں میں کمی وغیرہ کے لئے الیکشن کمیشن سے رجوع کرے اور الیکشن کمیشن ان کی پوری سماعت کا فریضہ انجام دے اور ایسا ہی ہوا۔

جہاں تک میر سندر خان میرانی کی شکایت اور میری رائے کا تعلق ہے تو میں کہوں گا کہ یہاں پھر قرطاس اینٹس کے خالقوں نے اپنے تعصب اور عناد سے غداری کی ہے۔ اگر کوئی غیر جانبدار اور منصف انسان ہوتا تو وہ مجھے اس کا اعزاز بخشتا کہ میں نے ایسی رائے دی۔ وہ یہ تسلیم کرنا کہ ذوالفقار علی بھٹو ایک منصفانہ ذہن کا وزیر اعظم ہے جو اپنے سیاسی مشیر کو یہ مشورہ دے رہا ہے کہ خود اس کی پارٹی کی طرف سے آنے والی خود غرضانہ تجویزوں کو رد کر دے۔ اگر میں نے اپنے سیاسی مشیر کو یہ ہدایت دی ہوتی کہ وہ میری پارٹی کے آدمیوں کی تجاویز کی حمایت کرے تو پھر قرطاس اینٹس کے مرتبین کو مجھ پر یہ الزام لگانے کا حق پہنچتا تھا کہ میں نے اپنی جماعت کی ناجائز حمایت کی اور اپنے اختیارات کا غلط استعمال کیا ہے۔

میر سندر خان سندرانی کے ساتھ میرے گہرے تعلقات ہیں۔ ہمارے خاندانی مراسم بہت قديم ہیں۔ میرے حلقہ انتخاب میں کئی سندرانی رہتے ہیں۔ اپنی پارٹی کے رکن اور ذاتی تعلقات کی بنا پر میرے پاس ہر طرح کی وجوہات تھیں کہ میں اس کی تجاویز کی حمایت کرتا۔ لیکن میں نے جو فیصلہ کیا استحقاق کے معیار پر کیا۔ پھر یہ بھی اہم نکتہ ہے کہ ان تمام حلقہ ہائے انتخابات میں مسٹر سندرانی کا قانونی حق نہیں بنتا تھا جبکہ ضلع جیکب آباد کے ایک اور حلقہ انتخاب میں اس کا قانونی حق بنتا تھا۔ مزید برآں یہ مسئلہ ریکارڈ پر ہے اور اس کی تصدیق کی جا سکتی ہے کہ اس خاص وقت میں، سندرانی اور اس کے کسانوں اور باریوں میں خاصی حد تک کشیدگی پائی جاتی تھی۔ قدرتی بات ہے کہ میں اس کے باریوں، غریبوں اور پسماندہ لوگوں کی حمایت کر رہا تھا۔

قرطاس اینٹس کے اسی صفحہ ۵۹ پر مزید کہا گیا ہے ”لین اے ۱۵۷ اور لین اے ۱۵۸ نواب شاہ کے بارے میں سید ظفر علی شاہ نے اعتراضات فائل کئے۔ جنہیں مسٹر بھٹو نے ”حمایت نہ

کی جائے کے رہارک کے ساتھ مسٹر وکر دیا۔ دوسرے حلقہ انتخابات کے بارے میں انہوں نے اپنے سیشنل اسٹنٹ کو ہدایت کی کہ مسٹر غلام مصطفیٰ جتوئی (وزیر اعلیٰ) اور مسٹر اے۔ ڈیو، کپڑ (اس وقت کے پاکستان پیپلز پارٹی کے صدر) اور پارٹی کے دوسرے زعماء، جو مقامی حالات سے واقف ہوں، سے مشورہ کیا جائے، مسٹر بھٹو نے چوبیس گھنٹوں کے اندر اندر اس قافلہ کو نمٹا کر ۸ فروری ۱۹۷۶ کو مسٹر راسن کو واپس بھیجی کر دی۔ اس پر کارروائی بروقت ہوئی تھی لیکن الیکشن کمیشن کو چتنا وقت چاہئے تھا اب نہیں رہا تھا۔

میرے اس ریمارک ”مدونہ کی جائے“ میں کوئی خامی یا غلطی نہیں ہے۔ اس کا یہ قطعاً مفہوم نہیں لیا جاسکتا کہ ”مخالفت“ کی جائے۔ لیکن اگر اس کا یہ مفہوم ہی لیا جائے تو بھی یہ فیصلہ مثبت تھا۔ کیونکہ میر ظفر علی شاہ پاکستان پیپلز پارٹی کا رکن ہے۔ ایک برس کا عرصہ ہوتا ہے کہ میں نے میر ظفر علی شاہ کو اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی بھجوا دیا تھا۔ ایک ایسا وقت بھی تھا جب وہ ایک خوبصورت کینڈین خاتون کے مجنونانہ عشق میں مبتلا تھا۔ اس کی نازک اور پرکشش شخصیت مجھے صحرا کے خوبصورت ترین پھولوں کی یاد دلا رہی ہے۔ اس وقت جب میں یہ سطور لکھ رہا ہوں تو میری آنکھوں سے آنسو بہہ رہے ہیں۔ گزشتہ ایک برس میں میں نے انتہائی ظلم و ستم کو برداشت کیا ہے کہ ایسے نرم خوار اور نازک روحوں کی یاد میرے اندر بڑے قوی جذبات پیدا کر دیتی ہے۔ میر ظفر علی شاہ، محمد علی شاہ کابینا، اللہ آندو کا پوتا اور ضلع نواب شاہ کے نواب شاہ کا پڑپوتا۔ ایسی ہی ایک شخصیت ہے۔ ایک بار پھر اسی قرطاس ایٹش نے دوستی کے رشتے کو مجروح کرنے کی کوشش کی ہے۔

اب میں ضلع لاڑکانہ کی حد بندی کی طرف آتا ہوں۔ میں نئی حد بندی سے قطعاً متاثر نہیں ہوتا تھا۔ اس کی حد بندی جیسی بھی کر دی جاتی، میں اس ضلع کے کسی بھی حصے سے ہاتھ نیچے کر کے، باستانی ہیبت سکتا تھا۔ اگر میرے دوست اور بھی خواہ اپنی ذہانتوں کے استعمال کے لئے اپنی طرف سے کچھ سفارشات اور تجاویز پیش کر رہے تھے، یا چند افراد جیسا کہ ضرب المثل ہے ”بادشاہ سے زیادہ وفادار“ کا کردار ادا کر رہے تھے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ میں اس کا ذمہ دار تھا کہ وہ متصادم تجاویز پیش کریں۔ انتخابات کے آزادانہ قیام کے بارے میں میرے صحیح رویے کے بارے میں باآسانی فیصلہ اس حقیقت سے کیا جاسکتا ہے کہ الیکشن کمیشن کے سامنے ڈپٹی کمشنر لاڑکانہ کو کم از کم چار مواقع پر پیش ہونا پڑا۔

اگر اپنے ”آپائی قبضے“ کی حدود کی تبدیلی کے لئے ضلع کے ڈپٹی کمشنر کو انصاف کے لئے الیکشن کمیشن کے سامنے چار بار پیش ہونا پڑا اور اس پر متزاہد غلام مصطفیٰ جتوئی، کپڑ اور دوسرے

نمائندگی کے لئے گئے تو اس سے یہ دیکھا جاسکتا ہے کہ چیف الیکشن کمیشن اور کمیشن کسی طرح بھی میرے ظلم و استبداد کے سائے میں کام نہیں کر رہے تھے۔ ایک ایسے حلقہ انتخاب میں جہاں سے میں جب بھی کھرا ہوتا، کامیاب ہوتا، اگر اس کے ساتھ الیکشن کمیشن نے یہ طرز عمل اختیار کیا تو پھر اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ دوسرے حلقہ ہائے انتخاب کے بارے میں اس کا رویہ کیسا تھا۔

قرطاس ایٹش کے صفحہ ۳۸ پر بیان کیا گیا ہے۔ ”ایک دوسرا ثبوت وہ ہے جو مسٹر بھٹو نے انشیلٹی جنس رپورٹ پر مار جنرل فوٹس لگے۔ اس میں یہ رپورٹ کی گئی ہے کہ مسٹر سجاد احمد جان کے ایک خاص غیر ملکی سفارت کار سے گہرے تعلقات قائم ہو چکے ہیں۔ مسٹر بھٹو نے اس کے حاشیے پر لکھا تھا۔ ”ڈپلوماسٹ، کیا ہم اسے اپنے مفاد کے لئے استعمال نہیں کر سکتے، پلیز اس پر بات کیجئے۔“ اس رپورٹ کی فوٹو سنٹیٹ منقل (ضمیمہ ۲۵) سے متعلق سفارت کار کا نام غیر ضروری پیچیدگیوں سے بچنے کے لئے حذف کر دیا گیا ہے۔“

اس غیر ضروری پیچیدگی سے کس طرح صرف نظر کیا جاسکتا ہے جبکہ متعلقہ ضمیمہ جو صفحہ ۱۱۱۔ اسے جس کا ضمیمہ ۳۵ میں حوالہ ہے، اس میں درج ہے کہ ۱۸ ستمبر ۱۹۷۵ کو چیف الیکشن کمیشن نے اس حذف شدہ سفارت کار سے ٹیلی فون پر رابطہ قائم کیا اور دوسری باتوں کے علاوہ کہا ”وہ آج ہی ٹینس کھیلنے کے لئے آئیں گے۔“ اس کے جواب میں حذف شدہ سفارت کار نے وعدہ کیا کہ وہ ان سے ٹینس کورٹ میں ملیں گے۔ ایک بار جب اتنی زیادہ معلومات فراہم کر دی گئی ہیں تو پھر اس کے بعد سفارت کار کے نام اور سفارت خانے کو چھپانے کی کوئی ضرورت باقی نہیں رہ جاتی۔ کیونکہ متعلقہ سفارت خانہ فوراً یہ معلوم کرے گا کہ متعلقہ سفارت کار اس کے سفارت خانے سے تعلق رکھتا ہے۔

ٹیلی فون پر گفتگو کی تاریخ دی گئی ہے۔ اس کے علاوہ تاریخ سے بھی زیادہ یہ معلومات دی گئی ہیں کہ چیف الیکشن کمیشن اور حذف شدہ سفارت کار کے درمیان ۱۸ ستمبر کو ٹینس کورٹ میں ملاقات ہوئی۔ اسلام آباد میں صرف ایک ہی ٹینس کورٹ ہے اور وہ اسلام آباد میں ہی ہے۔ اگر وہاں ایک سے زیادہ ٹینس کورٹ بھی ہوتے تو بھی سفارت خانہ جان سکتا ہے کہ وہ کون سا ٹینس کورٹ ہے۔ گفتگو سے یہ صاف ظاہر ہے کہ مسٹر سجاد احمد جان نہ تو روزانہ ٹینس کھیلتے ہیں اور نہ ہی چار سفارت کار کے ساتھ کھیلتے ہیں۔

اس سے قطع نظر قرطاس ایٹش میں اس تعلق کی ”سماجی تعلق اور رابطے“ سے وضاحت کی گئی ہے۔ میں نے حاشیہ پر جو نوٹ لکھا اس سے کون سی تکلیف وہ مداخلت ہوتی ہے؟ گھبراہٹ ہم اسے اپنے مفاد کے لئے استعمال نہیں کر سکتے۔ پلیز ڈسکس کیجئے۔ اس سے ضروری نہیں کہ یہ

فضول امور، جیسے کہ ٹینس کا کھیل پر سپر پاورز کے ساتھ پیدا نہیں کرنی چاہئیں۔

یہ مسئلہ کتنا ہی ناکارہ اور فضول کیوں نہ ہو، یہ دیکھتے کہ اس حکومت نے اسے میرے خلاف میرے حواشی پر لگے نوٹس کی بنیاد پر معاندانہ تشریح کے ساتھ استعمال کیا ہے۔ اس میں اس بات کو مسلط کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ ایسے امور کی وجہ سے چیف الیکشن کمشنر میری کٹھ پتلی بن چکا تھا اور اس کا نابلہ حلقہ انتخابت کی حدود سے ملا دیا گیا ہے۔ قRTLاس ایٹش میں اصل امور کو یکسر چھپایا گیا ہے اور اس میں چیف الیکشن کمشنر کے اس فیصلے کو خارج کر دیا گیا ہے جس میں لاڑکانہ کی ایک نشست کی تخصیص کر کے کراچی کی ایک صوبائی نشست میں اضافہ کیا گیا تھا۔ اور لاڑکانہ کے علاوہ صوبہ سندھ کے کسی ضلع کی نشست کو کم نہیں کیا گیا تھا۔ اس قسم کا فیصلہ میری کوئی کٹھ پتلی نہیں کر سکتی تھی۔ یہ حقیقت بخوبی عیاں ہے کہ چیف الیکشن کمشنر نے اسے کے سیاست دانوں سے زیادہ نزدیک اور دوست تھے۔ بہت سے مواقع پر انہیں پی پی پی پر ترجیح دی گئی۔ چیف الیکشن کمشنر پر پی پی پی اسے کے سیاست دانوں کی رسائی اور اثر و رسوخ کے بارے میں قRTLاس ایٹش میں ایک لفظ بھی موجود نہیں ہے۔

قRTLاس ایٹش کو اس ایک خط سے بہت پریشانی اور تکلیف ہوئی ہے جو چیف سیکرٹری سندھ نے میرے سیکرٹری کو نئی حدود دہی پر حکومت سندھ کی تجاویز کے بارے میں لکھا تھا۔ اس میں بھی کوئی ”عجیب“ یا غیر معمولی بات نہیں ہے۔ یہ سفارشات چیف سیکرٹری سندھ کی ذاتی سفارشات نہیں تھیں۔ وہ اپنی حکومت اور حکمران پارٹی کی تجاویز کو، وزیراعظم کے سیکرٹری اور پارٹی کے چیئرمین کے سامنے پیش کر رہا تھا۔ یہ کوئی حکمنامہ نہیں تھا۔ اس نے یہ سفارشات کمیشن کے بجائے صرف میرے سیکرٹری کو پیش کیں۔ اسی طرح بلوچستان کے وزیراعلیٰ نے صوبائی حکومت کی تجاویز ایک خط کے ذریعے جو کوئٹہ سے ۳۰ دسمبر ۱۹۷۵ء کو لکھا گیا، میرے نام ”بجوائی تھیں۔ یہ خط قRTLاس ایٹش کے صفحہ ۵۷ پر موجود ہے۔

حقیقت میں سٹراے۔ زیڈ فاروقی کے بیان میں جب اس نے میرے سیاسی مشیر کو مشورہ دیا کہ وہ اپنا نامیدہ سرکاری طور پر حدود بندی کے امور میں سماعت کے لئے بھیجیں تاکہ وزیراعظم کے سیکرٹریٹ کے نقطہ نظر پر کمیشن غور کر سکے۔ فاروقی نے اعتراض کرتے ہوئے لکھا ہے:

”سٹرمن نے کہا کہ یہ ممکن نہیں ہے۔ کیونکہ اگر ان کا نامیدہ ہیلک میں کوئی پوزیشن لیتا ہے تو اس سے وزیراعظم بہت پریشان ہوں گے۔ چونکہ ان کی اپنی پارٹی میں کئی

میرے یا پارٹی کے مفاد کا نتیجہ نکلتا ہو۔ اس کا تعلق زیادہ تر ملک کے مفاد میں ہی نکلتا ہے۔ ایسا خیال تو قRTLاس ایٹش کے مرتبین کے ذہن میں بھی آبی نہیں سکتا۔ وہ یہ سمجھ ہی نہیں سکتا کہ ”ہمارے مفاد“ کے الفاظ کا مفہوم پاکستان کا مفاد ہے۔ اس کے نزدیک ”ہمارا مفاد“ کا مطلب یہ ہے کہ اس سے ذاتی حکمرانی کا مفاد نکلتا ہے۔

آئیے اس نقطہ نظر کو دیکھیں جو انتہائی عجیب پر مشتمل ہے اور جو سارے قRTLاس ایٹش میں جاری و ساری نظر آتا ہے۔ اور میرے حواشی پر دئے گئے نوٹس کی بدتمیز وضاحت اور تشریح کی گئی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ کمشنر میری جیب میں نہیں تھا۔ وہ میری دسترس سے باہر تھا۔ اس لئے میں بڑا مشتاق تھا کہ ٹینس کے گیند کو ٹینس کورٹس میں پہنچا کر وہ معلومات جو فراہم کی گئی ہیں اس سے سفارت خانہ کو معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ کس سفارت کار کے بارے میں ہے تو پھر ایسی کوئی وجہ رونے زمین پر نہیں کہ پاکستانی عوام کو تاراجی میں رکھا جائے۔ یہ تو ایسی ہی حکومتوں کا کردار ہے کہ وہ عوام کو بیخود اندھیرے میں رکھتے ہیں۔

بہر حال اس میں جو قومی مفاد ہے اس پر سمجھوتہ نہیں کیا جاسکتا اس لئے یہ میرا فرض ہے کہ میں اس سماجی رابطے کے بارے میں بتاؤں کہ یہ رابطہ روسی سفارت خانے کے سٹاف چارج ڈی ایفرز مسٹر ایڈارڈ یونف کے ساتھ تھا۔ اگر کوئی ضروری یا غیر ضروری پیچیدگی پیدا ہوتی ہے تو وہ اس مسئلے کو پر اسرار بنانے سے پیدا ہوگی۔ اور شکوک پیدا ہو جائیں گے۔ اگر یہ حکومت خارجہ امور میں اتنی محتاط اور صحیح ہوتی تو پھر اسے پورا حوالہ ہی حذف کر دینا چاہئے تھا۔ یہ شکوک پیدا کرنے والا پر اسرار رویہ زیادہ خطرناک ہوتا ہے۔ اس مسئلے میں ایک حکایت کے ذریعے ہی بتایا جاسکتا ہے کہ موجودہ حکومت کس پیش بینی اور بصیرت کا فقدان رکھتی ہے۔ جب سلی ماؤس کی شادی ہو رہی تھی تو اس کے باپ نے اسے مشورہ دیا۔ مکی اگر تم ایک مرد ہو تو پھر شادی کے دن ہی اپنی شادی مکمل کر لو گے لیکن اگر تم چوہے ہو تو پھر تم اسے دوسرے دن مکمل کرو گے۔ اس پر مکی نے جواب دیا تھا۔ ”ابا۔۔۔ میں تو ایک گندہ چوہا ہوں اس لئے پچھلی رات ہی شادی مکمل کر چکا ہوں۔“

عوام کے رہنما مرد چوتے ہیں اور وہ جن حکومتوں کی سربراہی کرتے ہیں وہ باوقار ہوتی ہیں۔ ہمارے انقلابی ادوار میں جبکہ زمین ایک تیسری جنگ عظیم کو افق پر دیکھتے ہوئے لرزہ برانداز ہے۔ کسی چوہے کے لئے کوئی جگہ نہیں رہی۔ سکھر اور گڈاپ کے آغاشا ہی۔۔۔ اس حکومت کے وزیر مملکت برائے امور خارجہ کو اس بروقت انتباہ کو پوری طرح سمجھ لینا چاہئے۔ وہ اپنی باوردی حکومت کو بہتر طور پر سمجھا سکتے ہیں کہ اس قسم کی غلط فہمیاں، ایسے

دھڑے ہیں اس لئے وہ کسی ایک دھڑے کی حمایت میں پیش نہیں ہو سکیں گے۔ بہر حال انہوں نے کہا کہ مجھے ججوں کے بارے میں فکر مند نہیں ہونا چاہئے کیونکہ وہ چھوٹی رعد توں کے لئے حکومت کے پاس آتے ہیں ان کا انتظام ہو جائے گا۔

یہ قRTL اسٹیشن کے صفحہ ۳۳ پر ہے۔ الیکشن کمشن کا سیکرٹری میرے سیاسی مشیر کو یہ مشورہ دیتا ہے کہ وہ اپنا سرکاری نمائندہ تجاویز پیش کرنے کے لئے بھیجیں۔ لیکن میرا سیاسی مشیر اس تجویز کو مسترد کر دیتا ہے۔ اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ غلط طریقہ کار اپنانے کے الزام لگا کر کس حد تک میری حکومت کی مخالفت کی جاتی ہے۔ جہاں تک ججوں کے بارے میں گھٹیا ریمارکس کا تعلق ہے۔ جنہیں میرے سیاسی مشیر سے منسوب کیا گیا ہے تو میں پوری شدت کے ساتھ یہ کہوں گا یہ ریمارک شرات اور بد نیتی سے قRTL اسٹیشن میں اس شخص پر اور چو صفحہ ۴۴ پر درج کئے گئے ہیں۔ ان کا صرف ایک ہی مقصد ہے کہ ججوں میں میرے اور میری حکومت کے خلاف عناد اور تعصب پیدا کیا جائے۔

مسٹر محمد حیات تمن میرے سیاسی مشیر اور مغربی پاکستان کی حکومت کے سابق وزیر تھے۔ وہ ایک مہذب اور تجربہ کار فرد ہیں۔ وہ کبھی ایسے پست ریمارک نہیں دے سکتے۔ وہ بہت کم بات کرنے والے آدمی ہیں۔ وہ کبھی ایسے الفاظ اپنے منہ سے نہیں نکال سکتے، جسے چھاپے کی مشین قRTL اسٹیشن کے دو صفحات پر فوراً چھاپ دے۔ مسٹر تمن کا اپنا تجربہ بھی اس حقیقت کی نشاندہی کرتا ہے کہ میرا یہ اثر و رسوخ رکھنے والا مشیر، اپنے صوبے میں اپنے ضلع کے حلقہ انتخابات کی نئی حد بندیوں میں ناکام رہا۔ قRTL اسٹیشن کے صفحہ ۵۴ پر مندرج ہے ”مسٹر حیات محمد تمن، وزیر اعظم کے خصوصی نائب نے کمیشن کو ورغلانے کی کوشش کی کہ صوبائی اسمبلی کے ضلع کیمبل پور کے حلقہ ہائے انتخابات کے بارے میں ان کی تجاویز مان لی جائیں لیکن کمیشن اس پر رضامند نہیں ہوا۔“ یہ سب کچھ اس حقیقت کے باوجود ہوا کہ میں نے ان کی تقرری کی تھی کہ وہ الیکشن کمیشن کے ساتھ رابطہ رکھیں۔

یہ الزام کہ میں نے سٹے حلقہ انتخابات بنوائے، پانی کی طرح ناپائدار ہے۔ ججوں کے بارے میں جو کچھ کہا گیا وہ بطور خاص زہریلا ہے۔ قRTL اسٹیشن کے مصنفین کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے، اس لئے یہ حوالہ ایک بار نہیں بلکہ دوبار دیا گیا ہے جیسے مصروفیت زیادہ ہے اور یہ دستاویز بہت فرہ ہے۔ اگر وہ ججوں کے بارے میں صرف ایک بار یہ حوالہ تیزی سے نظروں سے اوجھل ہو سکتا تھا۔ اس لئے اسے دوبارہ درج کرنا ضروری سمجھا گیا۔

میرے خلاف ججوں کے دلوں میں عناد پیدا کرنے کی یہاں تک ظالمانہ کوشش کی گئی

ہے اور اس وقت دانش کی گئی ہے جبکہ میری زندگی، جس حد تک انسانی زندگی کا فیصلہ کرنے کی طاقت انسان میں ہے، ان کے ہاتھوں میں ہے۔

اب میں موجودہ چیف الیکشن کمیشن کی طرف رجوع کروں گا کہ انہوں نے حلقہ ہائے انتخابات کی حدود بندیوں کے بارے میں کیا آزادانہ کردار ادا کیا ہے۔ چھ اگست ۱۹۷۸ کے پاکستان ٹائمز میں ایک رپورٹ شائع ہوئی ہے اس کا عنوان ہے ”الیکشن کمیشن نے تعیناتی پروگرام مکمل کر لیا“ اس میں دیگر باتوں کے علاوہ کہا گیا ہے:

”الیکشن کمیشن نے اپنے ایک اجلاس منعقدہ راولپنڈی میں تجرباتی شمارو تعیناتی پروگرام مکمل کر لیا ہے۔ اور حلقہ ہائے انتخابات کی تجویز حد بندیوں پر بھی کام کر لیا ہے۔ یہ اجلاس چیف الیکشن کمیشن مسٹر جسٹس مولوی مشتاق کی صدارت میں منعقد ہوا۔ یہ سفارشات اب منظوری کے لئے وفاقی حکومت کے سامنے پیش کی جائیں گی۔ حکومت عام انتخابات کے انعقاد کے سب سے ضروری اقدامات کی پہلے ہی منظوری دے چکی ہے۔“

اگر فوجی حکومت حلقہ ہائے انتخابات کی حدود بندیوں کی تجرباتی تعیناتی کی منظوری دی گئی تو اس کا مطلب یہ ہے کہ حدود بندیوں کا کام فوجی حکومت نے کیا ہے، الیکشن کمیشن نے نہیں۔ یوں الیکشن کمیشن کی حیثیت اب محض ایک سفارشات کی تنظیم کی رہ گئی ہے۔ اس کا کام استانی رہ گیا ہے کہ یہ ابتدائی کام کرے تاکہ فوجی ٹولہ کوئی فیصلہ کر سکے۔ پاکستان ٹائمز کی اشاعت مورخہ ۲۸ اگست ۱۹۷۸ کے مطابق، پی این اے کے صدر نے اعلان کیا ہے کہ ”اب یہ نئی کابینہ کی ذمہ داری ہے کہ وہ الیکشن کمیشن کے کام کو دیکھے اور اس کی نگرانی کرے“ یوں الیکشن کمیشن موجودہ حکومت کا ذاتی ملازم بن کر رہ گیا ہے۔

اس انکشاف کی روشنی میں سوال پیدا ہوتا ہے کہ کس جواز کے تحت قRTL اسٹیشن حکمران پارٹی کے قانونی ابطال پر حملہ کر سکتا ہے کہ وہ الیکشن کمیشن کو تجاویز پیش کرتے تھے۔ فوجی حکومت نے طریق کار کو الٹ دیا ہے۔ اس نے تعلقات کی نوعیت بدل دی ہے۔ اس کے باوجود قRTL اسٹیشن کو یہ حیثیت اور اختیار حاصل ہے کہ وہ میری حکومت کے حلقہ انتخابات کی حدود بندیوں کے بارے میں جو کارروائیاں قانونی دائرے میں رہتے ہوئے کیں، ان پر حملہ کرے اور تنقید کر سکے!

(۵)

حکومتی مشین

قرطابری، ایض میں یہ تاثر دینے کی کوشش کی گئی ہے کہ چیف ایگزیکٹو اور صوبائی اور وفاقی حکومت کے منتخب اہمائی حیثیت سے مجھے بے کار بیٹھنا اور نوکر شاہی پر مجھے کسی قسم کا اختیار استعمال نہیں کرنا چاہئے تھا۔ اس معیار کو سامنے رکھتے ہوئے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ میں نے اپنے مفاد کے لئے نوکر شاہی، الیکشن کمیشن انٹیلی جنس ایجنسیوں اور وزارت اطلاعات و نشریات کو استعمال کیا۔ یہ ایک خلاف عقل ہمارے ہے۔ اس سے یہ محسوس ہوتا ہے کہ پاکستان کے موجودہ خود مسلط اور خود مقرر کردہ آقا یہ چاہتے تھے کہ منتخب وفاقی اور صوبائی حکومتیں اپنے جائز اختیارات سیٹ آپرٹس کے لئے ترک کر دیتے۔ کیا ہم حزب اختلاف سے یہ درخواست کرتے کہ وہ ہماری طرف سے حکومت کرتے؟

چونکہ یہ غیر معمولی تصور کافی نہیں تھا اس لئے چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر نے ۲۷ جولائی ۱۹۷۸ کو کوئٹہ کے ہوائی اڈے پر کہا کہ ”میور و کمریسی ایک ایسا ادارہ تھا جس کا اپنا منصب ہوتا ہے۔“ اس نے یہ نشانہ ہی کی ”جہاں تک ہمارے سسٹم کا تعلق تھا، میور و کمریسی کو ایک حتمی کردار ادا کرنا تھا۔“ اس نے مزید کہا۔ ”یہ جاہداری سے کام نہیں لے سکتی۔ اگر یہ کسی خاص پارٹی کا ساتھ دیتی ہے تو پھر یہ صحیح ادارہ نہیں ہے۔ مسٹر بھٹو نے میور و کمریسی کے ادارہ کو نقصان پہنچایا ہے۔ سرکاری ملازم بے چہرہ ہوتے ہیں۔ وہ خود غرض بھی نہیں ہوتے۔ وہ باہر نکل نہیں سکتے کہ عام بٹے میں جا شریک ہوں۔ اس لئے ایک ایسا سرکاری ملازم، جو ایک خاص سیاسی پارٹی کا یا کسی انفرادی پارٹی کارکن نہیں اور یا پھر وہ غیر جاہد ار رہنے کی کوشش کرتا ہے تو اس قسم کے موجود حالات میں اسے پسند نہیں کیا جاتا۔“

(پاکستان ٹائمز ۲۸ جولائی ۱۹۷۸)

میں اس سے اتفاق کرتا ہوں کہ بیورو کریسی کو اصل کے مارشل لاء کے تحت ایک خاص کردار ادا کرنا ہے۔ اس کا مخصوص کردار یہ ہے کہ میرے، میرے خاندان اور میری پارٹی کے زعماء کے خلاف جعلی شواہد تیار کرے۔ فوجداری مقدموں اور نااہل قرار دینے والے ٹریبونلز کے سامنے ہمارے خلاف جھوٹی گواہیاں دیں۔

وہ سرکاری افسر جو یہ مخصوص کردار ادا کر رہے ہیں انہیں خوبصورت اعزاز و انعام سے نوازا جا رہا ہے۔ اگر وہ انکار کرتے ہیں تو انہیں سزا دی جاتی اور جیلوں کی طرف روانہ کر دیا جاتا ہے۔ اس ملک کی پوری تاریخ میں بیورو کریسی کو ایسا غیظ اور کٹھنڈا کر دیا گیا ہے کہ حکم دے کر مجبور نہیں کیا گیا جتنا کہ آج کیا جا رہا ہے۔ بیورو کریسی بطور ایک ادارہ ختم ہو چکی ہے۔ سرکاری ملازموں کو تبدیل اور بحال کیا جاتا ہے تاکہ موجودہ حکمران ٹولے کے شکوک و شبہات کی تسکین کی جاسکے۔ یہ ان کی غیر جانبداری ہے۔

ہاں۔۔۔ ان میں ”بے چہرہ“ بھی ہیں جو جیلوں میں ہیں۔ لیکن پاکستان کی تاریخ میں یہ پہلی بار ہوا ہے کہ منتخب براہمنوں کو نامزد کر کے وزیر اور مشیر بنایا گیا ہے۔ ماضی میں بعض بیورو کریٹ اعلیٰ سیاسی عہدوں پر فائز رہے لیکن یہ عہدے انہوں نے انتخابی عمل سے گزیر کر حاصل کئے تھے۔ ایک سابقہ بیورو کریٹ وزیر اعظم بھی بنا۔ لیکن اسے پاکستان دستور ساز اسمبلی نے اپنا رہنما منتخب کیا تھا۔ ایک اور رہنما ڈیڑھ بیورو کریٹ ملک کا صدر بنا لیکن اسے بھی منتخب کیا گیا تھا۔ ایک زمانہ ایسا تھا کہ ولید بھائی پٹیل یا مارگری ڈیسانی یا دونوں انڈین سول سروس میں تھے۔ لیکن وہ مستعفی ہوئے اور آزادی کی جدوجہد میں شامل ہو گئے۔ ایوب خان نے اپنے مارشل لاء میں بیورو کریٹ کو وزیر نامزد نہیں کیا تھا۔ اور نہ ہی یحییٰ خان نے۔ میری حکومت میں دو سابقہ بیورو کریٹ وزیر تھے لیکن دونوں سینٹ کے لئے منتخب ہوئے تھے۔ ہماری تاریخ میں یہ پہلی بار ہوا ہے کہ موجودہ غیر نمائندہ حکومت نے بیورو کریٹ کو مشیر اور وزیر اور نامزد کیا ہے۔ ان میں سے ایک ۵ جولائی ۱۹۷۷ تک ڈپٹی فیکٹو وزیر اعظم رہ چکا تھا۔ اس حکومت میں بے چہرہ، بے غرض غیر جانبدار بیورو کریٹ وزیروں اور مشیروں کی جگہ بیٹھ گئے ہیں۔

بہر حال روایت اور ورثے میں ملنے والے تضادات اور دشواریوں سے قطع نظر عمومی اہمیت کے ایک اعلیٰ سول اصول کی ضرورت کو سامنے رکھنا چاہئے۔ اس عمومی اصول پر بحث کرتے ہوئے میں اس نظام کو شامل کرنا نہیں چاہتا ہوں جس کے تحت صرف ایک پارٹی ہی حکمرانی کرتی ہے۔ میرے ذہن میں کئی جماعتوں پر مشتمل جمہوری نظام ہے۔ کثیر الجماعتی

نظام میں ہی امتیاز و علیحدگی کے عناصر کو ناقابل عمل بنا دیا جاتا ہے۔ ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں تمام اونٹنے عہدوں پر حکمران جماعت کے افراد کو تعینات کیا جاتا ہے۔ ایک انتظامیہ سے دوسری انتظامیہ تک اقتدار کی منتقلی کے عمل کے لئے، انتخابات کے بعد، آٹھ ہفتوں کے لگ بھگ مدت فراہم کی گئی ہے جس میں بہت بڑی بڑی انتظامی تبدیلیاں ہوتی ہیں۔ پارلیمانی سسٹم میں بھی سول سروسز اور دوسری سروسز اپنی جگہ کوئی جزیرے نہیں ہوتی ہیں کہ متوازی حکومت کی طرح کام کریں۔

دولت مشترکہ برطانیہ، جو ہمارے لئے ماڈل کا درجہ رکھتی ہے میں بھی بنیادی تبدیلیاں کی جاتی ہیں۔ اس وقت، برطانوی نظام خصوصی مشیروں کا ایک ادارہ ہے۔ اس ادارے میں وسعت ہو رہی ہے۔ وزیر اعظم حیرلڈ ولسن کے زمن میں یہ کنوشن تھی کے کاہنہ کے ایک وزیر کے لئے دوسرے زیادہ مشیر نہیں ہو سکتے۔ موجودہ وزیر اعظم برطانیہ مسٹر جیمز کیمبلین کی لیبر حکومت خصوصی مشیروں کے ادارے کی بہتری اور فروغ کے لئے غور و فکر کر رہی ہے۔ سرکاری ملازموں کی سیاسی سرگرمیوں کے حوالے سے آر میٹج کمیٹی یہ نظریہ قبول کر چکی ہے کہ خصوصی مشیروں کو وزیر اعظم کی طرف سے جاری کردہ علیحدہ رولز کا پابند کیا جائے۔ خصوصی مشیروں کے اس ادارے نے جامع سیاسی نیٹ ورک تخلیق کیا تھا۔ جون ۱۹۷۴ میں برطانیہ میں اڑتیس خصوصی مشیر برطانوی حکومت میں کام کر رہے تھے۔ اس سلسلے میں یہ سننے میں آ رہا ہے کہ ان کی تعداد سو تک بڑھائی جا رہی ہے۔ ان کی درجہ بندی ”عارضی سرکاری ملازموں“ کے ذیل میں کی گئی ہے۔ قواعد و خواہ کچھ کہتے ہوں، ان کے برعکس خصوصی مشیر نارمل سیاسی سرگرمیوں میں اپنے آپ کو مصروف رکھتے ہیں۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ خصوصی مشیر جو کہ ”عارضی سرکاری ملازم“ ہوتے ہیں۔ لیکن وہ سیاسی کارروائیوں میں شامل ہوتے ہیں۔ اور برطانوی حکومت میں وہ ادارتی شکل میں موجود ہیں۔ بے چہرہ جانبدار سرکاری ملازم کی یہ حیثیت برطانیہ کی پارلیمانی جمہوریت میں ہے۔

علیحدہ، عوام سے کٹی ہوئے غیر جانبدار سرکاری ملازم کی ضرورت نوآبادیاتی نظام کو تھی۔ سامراجی اقتدار نے سول سروسز کے لئے لوہے کا ایک فریم ورک تیار کیا کہ ایک تو وہ عوام کی دسترس سے دور رہیں اور دوسرے ان کا کوئی چہرہ دکھائی نہ دے۔ مقامی لوگ ان سے دور رکھے جائیں۔ وہ مقامی لوگوں کے مقامی تنہا زعموں اور جھگڑوں میںغیر جانبدار رہیں۔ ہندوستانیوں کے فرقہ وارانہ اور سیاسی مسائل میں بھی جانبداری سے کام نہ لیں۔ لیکن اس جانبداری میں بھی وقتاً فوقتاً دلائل پڑتی رہیں۔ یونکہ کبھی ایک دھڑے کی حمایت کی جاتی کبھی

دوسرے فریق کی جس کا مقصد صرف برطانوی راج کو مستحکم کرنا تھا۔ یہ جانبداری اور بے چہرہ پن، جو کہ انتہائی فریب پر مبنی تھا، اس کا اطلاق سادہ آقاؤں پر نہیں ہوتا۔ جب بھی برطانوی راج کے مفادات کا معاملہ آتا ہے انڈین ہوم سروس، اور دوسری مستقل سروسز، پورے چہرے کے ساتھ، انتہائی خود غرضانہ اور جانبدارانہ کردار ادا کرتی تھیں۔ جو برطانوی راج کے دھارے کے ساتھ چلتا تھا۔ میں ایک پارٹی، سبھی کی شکایت نہیں کر رہا اور نہ ہی میری حکومت نے سروسز کے ساتھ جو رویہ اختیار کیا اس پر ہی معذرت کر رہا ہوں۔ میں اجماعاً موجودہ حقائق کی وضاحت کر رہا ہوں، جو ہمارے زمانے میں حکمران پارٹی اور سول سروسز کے درمیان تعلقات سے متعلق ہیں۔

اس پس منظر میں مجھے اجازت دیجئے کہ میں قریطاس انیش کے حوالہ اپنی حمایت ہی پیش کر سکوں۔ اس کے صفحہ ۶۹ پر بتایا گیا ہے کہ راؤ رشید نے مجھے یہ تجویز پیش کی کہ ”وزراء اور وزرائے اعلیٰ کے پاس بہت کم وقت ہوتا ہے کہ وہ سیاسی مسائل پر صرف کر سکیں۔ شاید ان میں سے بعض کو ان کے پورے فولیو سے فارغ کر دینا چاہئے تاکہ وہ خاص طور پر پارٹی کا کام کر سکیں۔“ تاکہ پارٹی اور حکومت تمام امتیاز اور علیحدہ علیحدہ شناخت کو بیٹھے تو پھر یہ کامراج پلان“ راؤ رشید کبھی میرے سامنے پارٹی کے مسائل کے ایک ممکن حل کے طور پر نہ رکھتے۔

میں قریطاس انیش کے ایک اور حوالے کی طرف توجہ مبذول کرتا ہوں جس سے میرے ذہن کی کشادگی اور انصاف پسندی، اور پارٹی کے تمام تعصبات سے بالاتر ہو کر، ایک قومی رہنمائی حیثیت سے میری غیر جانبداری کا اظہار ہوتا ہے۔ یہ کہ کیا غلط یا صحیح آنکھیں بند کر کے پارٹی کے مفاد کو ہمیشہ نظر نہیں رکھتا تھا۔ یہ حوالہ قریطاس انیش کے صفحہ ۱۷۲ پر ہے:

”پارٹی کے کارکنوں نے، پارٹی کے سیٹ اپ کی تکمیل کے لئے بیورو کریٹ کے اشتراک پر شدید رنج و غصہ کا اظہار کیا۔ لیکن مسٹر بھٹو نے خفیہ میٹنگوں میں ان پر واضح کیا کہ جب سے وہ اقتدار میں آئے ہیں، وہ تسلسل کے ساتھ یہ شکایات سن رہے ہیں کہ تمام سطحوں پر پاکستان پیپلز پارٹی کے کارکن بیورو کریسی کو خوفزدہ کر رہے ہیں۔ پارٹی پوزیشن کا ناجائز استعمال کرتے ہوئے روپیہ بنا رہے ہیں۔ ان حالات میں یہ انتہائی مناسب ہے کہ نہ صرف بیورو کریٹ بلکہ متعلقہ شعبوں کے اہم پارٹی سے تعلقات رکھنے والے افراد کو بھی یہ موقع دیا جائے کہ وہ مجوزہ عہدیداروں کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کر سکیں۔“

میں نے اپنے پرسنل سٹاف میں سرکاری ملازموں کا اشتراک اس لئے نہیں کیا تھا کہ وہ پارٹی میں مدغم ہو جائیں۔ بلکہ اس لئے کیا تھا کہ عوامی شکایات پر ان کے غیر جانبدارانہ اور موزوں مشورے حاصل کئے جاسکیں۔ قریطاس انیش بھی اس سے انکار نہیں کرتا۔ صفحہ ۷۰ پر بتایا گیا ہے کہ میں بیورو کریٹس کی رائے پر کہیں زیادہ سیاست دانوں کی رائے کو ترجیح اور فوقیت دیتا تھا۔ ”افسران بکار خاص اس دوران میں اپنی فہرستیں پیش کرتے رہے، جو مسٹر زیڈ اسے بھٹو، مسٹر جنونی، مسٹر کشر اور پاکستان پیپلز پارٹی کے دوسرے زعماء کی سفارشات کے سامنے کوئی اہمیت نہ رکھتی تھیں۔“

اگر میں عوام کی خدمت کے تحت آنکھیں بند کر کے جانبداری برستتا، یا میں اس کے برعکس کرتا تو پھر عوام کے مفاد کو نظر انداز کر دیتا۔ اگر میں حکمران پارٹی کے موزوں اور جائز مفادات کو نظر انداز کر دیتا تو پھر رجعت پسندوں کا جوابی انقلاب و بغاوت، جس کی سربراہی چیف مارشل آئیڈ منسٹر کر رہا تھا بہت پہلے سرکاری مشینری کو خراب کر جاتا۔ میں تو توازن اور معقولیت کی پالیسی پر عمل کر رہا تھا اور متضادم مفادات کو ہم آہنگ کر کے، ایک مشترکہ ڈھانچے کی تشکیل کر رہا تھا۔

فوج نے حکومت کا تختہ الٹ کر کیا سبق سکھایا ہے؟ یہ کہ سمجھوتہ کیا جائے۔ جو ایک یو ٹوپین خواب ہے۔ فوجی حکومت نے یہ ظاہر کیا ہے کہ طبقاتی جدوجہد میں مفاہمت اور اشتراک نہیں ہو سکتے۔ اور اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلے گا کہ ایک طبقہ دوسرے طبقے کو فتح کر لے گا۔ اس سے دور حال میں جو بھی نقصانات پہنچیں یہ جدوجہد صرف ایک طبقے کی فتح پر منتج ہوگی۔ آئے ہوئے واقعات کی تمام تر ذمہ داری اس فوجی حکومت کے رہنماؤں پر عائد ہوتی ہے۔ یہ فوجیتا دیوار ہے جس پر ان کے دستخط ثبت ہیں۔

یہ ایکسپلرٹس اور انتہائی مضحکہ خیز صورت حال ہے کہ میرے لئے میرے بیٹے مرتضیٰ نے لندن میں جو تجربہ کیا اس کا غیر ضروری رد عمل رجعت پسندوں کی طرف سے سامنے آیا۔ جس سے ان رجعت پسندوں کی بولکھٹ اور احساس جرم کا اظہار ہوتا ہے۔ ایک اردو اخبار نے میرے بیٹے کو یاد دلایا کہ جیسے اس کا ایک باپ ہے، قصوری کا بھی ایک باپ تھا۔ قصوری نے اپنے باپ کے خون سے سرکاری خرچ پر لاس انجلس، نیویارک اور پیرس میں ہولی کیٹی کی۔ اگر میرے بیٹے، ان لوگوں کا خون نہ پیئیں تو میرے خون کے درپے ہیں تو وہ میرے بیٹے نہیں۔ یہ ہے اصل فرق۔ میرے بیٹے کون ہیں؟ عوام میرے بیٹے ہیں، میر غلام مرتضیٰ اور شاہنواز کون کی پیدائش سے یہ تربیت دی گئی ہے کہ وہ ان کے سچے خادم ہیں۔

انٹیلیجنس ایجنسیز

قرطاس ایٹس میں انٹیلیجنس ایجنسیز کے کردار پر بڑے مقدس سے مگر مجھ کے آنسو بہائے گئے ہیں کہ یہ ریاستی ادارے پاکستان پیپلز پارٹی کی حکومت کے سیاسی بازو بن گئے تھے۔ صفحہ ۱۹۵ پر اس معاملے کو مندرجہ ذیل الفاظ میں بیان کیا گیا ہے:

”ریاست کی انٹیلیجنس ایجنسیز کا کردار۔۔۔ کہ وہ پاکستان پیپلز پارٹی کی حکومت کا سیاسی بازو بن گئی تھیں اور خاص طور پر عام انتخابات میں کل کردار بہت سے اہم حوالہ کو جنم دیتا ہے۔ جب سیاست انٹیلیجنس بیورو یا انٹرسروسز انٹیلیجنس ڈائریکٹوریٹ جیسے حساب داروں پر مسلط ہو جائے تو پھر قدرتی طور پر یہ اپنے بنیادی فرائض یعنی ریاست کی خارجی اور اندرونی سلامتی سے غفلت برتنے لگیں گے۔ ایک جمہوری معاشرے میں جمہوری جماعتوں کا وجود جمہوریت کے لئے ناگزیر ہوتا ہے اگر ان جمہوری پارٹیوں کے خلاف حکمران جماعت ان ریاستی اداروں کو استعمال کرے تو ملکی سلامتی کا کام مجروح اور مشکل ہو جاتا ہے۔“

اس سلسلے میں اپنی مزید حمایت کے لئے قرطاس ایٹس کے صفحہ ۱۹۷ پر مسٹر اس کے بروہی کی معروضات پیش کی گئیں جو انہوں نے سیم نصرت بھٹو کی درخواست کی سماعت کے درمیان سپریم کورٹ میں پیش کی تھیں۔ بروہی نے کہا تھا:

”اس رویے میں انٹیلیجنس بیورو کو خاص طور پر مسٹر بھٹو کے ذاتی اور سیاسی مقاصد کے لئے استعمال کیا گیا۔“ اس کے علاوہ۔۔۔ ایک اور حوالہ اسی درخواست کے حوالے سے ہے۔ یہ صفحہ ۱۸۱ پر درج ہے۔

”مسٹر بھٹو نے ایک ایسا ہی ہدایت نامہ انٹیلیجنس بیورو کے ڈائریکٹر کے نام جاری کیا۔ فیڈریشن کی طرف سے مسٹر زید اسے بھٹو کی منفردی کی درخواست پر سپریم کورٹ کے سامنے دلائل دیتے ہوئے مسٹر اسے۔ کے بروہی نے کہا:

(۱) جب ڈائریکٹر انٹیلیجنس بیورو نے ایک رپورٹ یکم اپریل ۱۹۷۶ کو مسٹر بھٹو کو پیش کی۔ جس میں یہ نشاندہی کی گئی تھی کہ مخالف سیاسی جماعتیں ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کر رہی ہیں تو مسٹر بھٹو نے مندرجہ ذیل ہدایات جاری کیں:

”پلیز ان پر کڑی نگاہ رکھیے، انہیں کسی طرح بھی ایک دوسرے کے قریب آنے کی

اجازت نہ دی جائے۔ یہ خوف کا نہیں بلکہ ایک اصولی مسئلہ ہے۔ یہ آپ کا فرض ہے کہ آپ انہیں جدا رکھیں۔ مجھے بتایا گیا ہے کہ جب غلام مصطفیٰ کھر نے مسٹر روف ظاہر کو پنجاب ٹی بورڈ کا سربراہ بنایا تو اس نے بہت زیادہ روپیہ بنایا، اس کی تحقیقات کیوں نہیں کی جاتی ہیں۔“

(ب) جب چیف سکیورٹی افسر نے ایک رپورٹ ۵ مئی ۱۹۷۶ کو وزیر اعظم کے سامنے پیش کی جس میں ان کو ششوں کا ذکر تھا کہ حزب اختلاف کا اشتراک ہونے والا ہے تو مسٹر بھٹو نے مندرجہ ذیل حکم جاری کیا:

”آپ انہیں متحد ہونے کی اجازت نہ دیں۔ یہ آپ کا اولین فرض ہے۔“

اس کے برعکس انٹرسروسز انٹیلیجنس کے ڈائریکٹر جنرل لیفٹیننٹ جنرل جی جیلانی، جنہوں نے خود کو اور اپنی ملٹری انٹیلیجنس کو ساڑھے پانچ سال تک، خاص طور پر میری ذات اور سیاسی مقاصد کے لئے استحصال اور غلط استعمال کی اجازت دیئے رکھی، وہی قرطاس ایٹس کے صفحہ ۶۶ کے مطابق، میری حکومت کو ایک رپورٹ پیش کرتے ہوئے یہ رائے دیتے ہیں:

”(ان مسٹر بھٹو) کی قیادت فہم اور مرتبہ کا کوئی نعم البدل نہیں اور کوئی بھی ان کے علم و فہم اور مرتبہ کے قریب اس شعبے میں دستیاب نہیں۔“

”مسٹر بھٹو واحد رہنما ہیں جو بین الاقوامی شناخت اور ایجنٹ رکھتے ہیں۔ جو بین الاقوامی پاور پالیسیوں کا علم اور تجربہ رکھتے ہیں۔ انہوں نے پاکستان کے لئے ایک معمار کی سی خدمات انجام دی ہیں۔ وہ پاکستان کے استحکام اور سلامتی کی علامت ہیں۔“

جس میں ۲۰ دسمبر ۱۹۷۱ کو پاکستان کا صدر بننا تو لیفٹیننٹ جنرل جیلانی اس سے پہلے انٹرسروسز انٹیلیجنس کے ڈائریکٹر جنرل تھے۔ وہ پانچ جولائی ۱۹۷۷ تک اپنے اس حساس عہدے پر فائز رہے۔ حکومت کا تختہ الٹنے کے چند ماہ بعد انہیں سیکرٹری دفاع بنا دیا گیا۔ اس وقت بھی اس اہم عہدے پر فائز ہیں۔ اگر وہ ناراضی کی زد میں تھے، اگر ان کا ساتھی جرنیلوں کا ٹولہ انہیں میرا خواہی سمجھتا تو انہیں بھی اس طرح منظر سے ہٹایا جاسکتا تھا جس طرح بہت سوں کو ۵ جولائی ۱۹۷۷ یا اس کے بعد فوری طور پر ہٹایا جاسکا ہے۔ سوائے جنرل جیلانی کے، انٹیلیجنس کے تمام انچارج افراد دفاعی سطح تک، حکومت کا تختہ الٹنے کی رات یا اس کے ایک ماہ کے اندر اندر گرفتار کر لئے گئے تھے۔

رکارڈ کی تصحیح کے لئے یہ بتانا بھی ضروری ہے کہ میرے خصوصی سیکرٹری راؤ عبدالرشید کو ۵ جولائی ۱۹۷۷ کو جرح است میں لے لیا گیا تھا اور اس طرح مسعود محمود ڈائریکٹر جنرل

لیفٹننٹ جنرل جیلانی نے تحریری طور پر اظہار کیا تھا اور میں اس کا متن دہراتا ہوں:
 ”ان (مسٹر بھٹو) کی قیادت، فہم اور مرتبے کا کوئی نعم البدل نہیں۔ اور کوئی بھی ان کے علم و فہم اور مرتبے کے قریب اس شعبے میں دستیاب نہیں۔“
 مسٹر بھٹو واحد رہنما ہیں، جو بین الاقوامی شناخت اور رائج رکھتے ہیں۔ جو بین الاقوامی پاور پالیسیوں کی تشکیل کا گہرا اور شدید علم اور تجربہ رکھتے ہیں۔ انہوں نے پاکستان کے لئے ایک معمار کی خدمات انجام دی ہیں۔ وہ پاکستان کے استحکام اور سلامتی کی علامت ہیں۔“

اس وقت جبکہ پاکستان کے غریب شہری ”جئے بھٹو“ کہنے کے جرم میں کوڑے کھا رہے تھے اور انہیں قید با مشقت کی سزائیں دی جا رہی تھیں۔ جب خواتین پر لائچی چارج کیا جا رہا تھا۔ ان پر انسولینس پھینکنی جا رہی تھی اور انہیں جیلوں میں اس لئے لے جایا جا رہا تھا کہ وہ دیوں کی درکاروں پر میرے لئے دعا کر رہی تھیں۔ یہ سمجھنا بہت دشوار ہے کہ کیسے سابق ملٹری چیف آف انٹیلیجنس، جو ایسی خوشامد رپورٹیں بھیجتا تھا۔ جن میں میری قیادت کو بالاتر قرار دیا جاتا۔ وہ اس فوجی ٹولے کے سیٹ اپ میں ایسی اہم حیثیت پر فائز و برقرار رکھا گیا۔
 اس حوالے سے یہ معاملہ غور و فکر کا حامل ہے کہ لیفٹننٹ جنرل جیلانی کی مجھے متاثر کرنے کی یہ کوشش کامیاب نہ رہی کہ چھ جرنیلوں کو عطا انداز کر کے اس وقت کے میجر جنرل ضیاء الحق کو چیف آف سٹاف کا عہدہ دیدیا جائے۔ یہ اس کہانی کا صرف ایک حصہ ہے۔ لیکن اس معمولی سے انکشاف کے ساتھ میں یہ پوچھنا چاہوں گا کہ کس نے کس کا استحصال کیا؟ کیا ملٹری انٹیلیجنس کے چیف اور اس کے چیف آف سٹاف نے میرا استحصال کیا یا میں نے ان کا استحصال کیا تھا؟

حال ہی میں میں نے ایچ۔ آر۔ ہالڈین کی کتاب ”دی اینڈز آف پاور“ کا مطالعہ کیا ہے۔ مجھے اس سلسلے میں معاف کیا جائے کہ میں اپنا موازنہ ایک سپر پاور سے کر رہا ہوں۔ لیکن چونکہ صرف یہی ایک موازنہ نہیں ہے جو میں کرنے کا ارادہ رکھتا ہوں اس لئے میں اپنے ریمارکس کی تمہید عاجزانہ معذرت کے کر رہا ہوں۔ ہالڈین صدر رچرڈ نکسن کا رفیع رضا تھا۔ اس کتاب ”دی اینڈز آف پاور“ میں ہالڈین نے اس یقین کا اظہار کیا ہے کہ صدر نکسن کے اخراج کے سلسلے میں سی آئی اے کو شبہ سے بالاتر قرار نہیں دیا جاسکتا۔ خواہ اس سلسلے میں بنیادی ادارہ اسے کمزور و معذور بنانا ہی کیوں نہ چاہتا ہو۔ اس کتاب کے صفحہ ۲۷ پر ہالڈین کہتا ہے ”اس بار سی آئی اے تیار تھی۔ اور حقیقت یہ ہے کہ وہ تیار ہی نہیں بلکہ اس کھیل میں کئی مہینے آگے

فیڈرل سکیورٹی فورس اور شیخ اکرام سہانہ ڈائریکٹر انٹیلیجنس بیورو کو بھی گرفتار کر لیا گیا تھا۔ میرا خیال ہے کہ سعید احمد، چیف سکیورٹی افسر کو جولائی کے وسط یا اگست ۱۹۷۷ کے درمیان گرفتار کیا گیا تھا۔ میرے سیکرٹری افضل، سعید کو اگست کے وسط میں گرفتار کیا گیا۔ سابق سیکرٹری داخلہ فضل حق کو فی الفور ملازمت سے نکال دیا گیا۔ اس وقت کے سیکرٹری داخلہ ایم اے کے چوہدری، جو اس وقت کے چیف جسٹس کے بھائی ہیں انہیں اس اعزاز سے محروم رکھا گیا۔ جب ان کے بھائی کا سپریم کورٹ سے اخراج ہوا تو اس کے نتیجے میں انہیں بھی اپنے ہتھیاروں کو الوداع کہنا پڑا۔

چیف آف ملٹری انٹیلیجنس لیفٹننٹ جنرل جیلانی کو پچھواچھ نہیں گیا۔ اس کے برعکس وہ وہیں آرام سے رہے جہاں تھے اور اس کے بعد انہیں ولادت و قلع میں سیکرٹری بنا دیا گیا۔ پانچ برس سے زائد عرصے تک وہ میرے مرکزی انٹیلیجنس افسر رہے اور وہ میرے بہت سے خیالات کا خزانہ تھے۔ کچھ حساس موضوعات سے جن پر میں نے ان کے ساتھ پاکستان کے دوبارہ وزیر اعظم بننے کے انتخابات کے سلسلے میں بحث اور تبادلہ خیالات کیا۔ چھپ رہے تھے:

(۱) وفاقی ڈھانچے کی، سیاسی اور تنظیمی دونوں پہلوؤں سے مکمل تنظیم کو
 (ب) مرکزی انٹیلیجنس ایجنسی کا ایک باوقار اور مستحکم انٹیلیجنس ڈپارٹمنٹ میں ادغام جو ان دو حصوں میں منقسم ہیں۔

(۱) داخلی

(۲) خارجی

(ج) اصلاحات

لیفٹننٹ جیلانی نے میرے مستقبل کے منصوبوں پر میرے ساتھ گہری اور بے تکلفانہ بات چیت اور بحث کی تھی۔ اگر فوجی ٹولہ واقعی اس انداز پر ناراض اور مشتعل ہے کہ جس طرح میں نے انٹیلیجنس ایجنسیوں کو استعمال کیا تو پھر لیفٹننٹ جنرل جیلانی ڈائریکٹر جنرل انٹرسروسز انٹیلیجنس ان کے ساتھی جنرلوں کا میرا ایک ہدف ہونا چاہئے۔

چیف مارشل لائیڈ سنٹرلر مجھے رسوا اور بدنام کرنے سے مطلق نہیں ٹھکتا۔ اس نے مجھے قاتل اور جدید میکاویلی کہا ہے۔ اس نے مجھے معیشت کی تباہی کا ذمے دار قرار دیا ہے۔ اس کا دعویٰ ہے کہ میری وجہ سے ملک خانہ جنگی کے دہانے تک پہنچا تھا۔ اس نے کئی مسلم ممالک اور چین کا دورہ سرکاری فائلوں اور دستاویزات کے ساتھ کیا ہے تاکہ وہ ان ملکوں کے رہنماؤں کو قاتل کر سکے کہ میں ایک قاتل اور خوفناک تشدد پسند انسان تھا۔ اس کے برعکس، حکومت کا فوج کے ذریعے تختہ الٹنے کے چند ماہ پہلے،

تھی، تاکہ نکسن اس طرف چل پڑے جس کے بارے میں احب میرا یقین ہے کہ وہ ایک پختہ تھا۔

مندرجہ بالا حوالہ یہ بات ثابت کر دیتا ہے کہ یہ موازنہ غیر ضروری نہیں ہے۔ اس میں مشابہت اتنی قریبی ہے کہ اس نے مجھے متحیر کر کے رکھ دیا ہے۔

(۱) نکسن نہ صرف یہ کہ کابینہ کے چار افراد کے استعفیوں کا مطالبہ کرتا، اور ان کی جگہ مضبوط تر افراد کو تعینات کرنا چاہتا تھا۔ (ان میں چار ایسے تھے جن کی حقیقت میں دوبارہ تقرری کی جانے والی تھی) وہ حکومت کے نئے ڈھانچے کے لئے ایک ڈرامائی بلکہ انقلابی ارادہ رکھتا تھا۔

(ب) اپنے دور اقتدار کے وسط میں نکسن نے اس انقلابی تبدیلی کے بارے میں ایک تنظیم نو کاہل متعارف کرایا تھا۔ اسے ایک بوکھلائی ہوئی کانگریس نے بڑی جگمگ میں مسترد کر دیا۔ اقتدار کے بارے میں واٹس ہاؤس کے ایک منجی بھر اسے ڈنڈ کی باتوں نے کانگریس کے حامیوں حتیٰ کہ نکسن نے شدید غصے میں کہا تھا اگر میں انتخابات جیت گیا تو میں اپنے صدارتی حکم سے تنظیم نو کا نفاذ کروں گا اور اسمبلی جیت میں جائے۔

(ج) نکسن نے اس بات پر رضامندی ظاہر کی ”میں یہ مشورہ دوں گا کہ ہم ہاؤس کی صفائی کریں۔ اب نئی ٹیم کا وقت آگیا ہے۔ وقت۔۔۔ میں یہ کہوں گا کہ جب ہم پہلے اقتدار میں آئے تو ایسا نہ کر سکے۔ لیکن اب ہمیں مینڈیٹ حاصل ہے اور اس مینڈیٹس میں سے ایک یہ ہے کہ ۱۹۶۸ میں ہم جو صفائی نہ کر سکے تھے، وہ اب کر کے رہیں۔“

(د) جنوری ۱۹۶۳ کے ”یو ایس نیوز اینڈ ورلڈ رپورٹ“ میں نکسن کی تنظیم نو کے چیلنج کے عنوان سے لکھتا ہے:

”وہ اسے ایک میجریل (انتظامی) انقلاب کہتے ہیں۔۔۔ جس انداز میں صدر فرائض اور ملازمتوں کو چھانٹ رہے ہیں اس کا ہدف کیا ہے۔۔۔ حکومت اس طرح کام کرے جیسے وہ چاہتے ہیں۔ انتظامی عہدوں کے مسلسل ہلانے جلانے کے نتیجے یہ امر ہے کہ۔۔۔

”پرچہ نکسن، بطور صدر اپنی دوسری میعاد صدارت میں یہ ارادہ کئے ہوئے ہیں کہ عظیم ایجنٹ فیڈرل بیورو کریسی پر کنٹرول کر کے اسے پالیسی کی سمت پر کامزن کیا

جائے۔ صدر یہ کام جزوی طور پر اس طرح کر رہے ہیں کہ واٹس ہاؤس کے متعدد نائبین کو عہدوں پر لگا رہے ہیں، جو چار برسوں سے نکسن کے کام کرنے کے طور طریقوں کی تربیت حاصل کر چکے ہیں۔ ان لوگوں کو علی کارروائی کرنے والے شعبوں میں کلیدی عہدے دئے جا رہے ہیں۔“

یہ مضمون یکم جنوری ۱۹۶۳ کو شائع ہوا تھا ”پوسٹ“ اور ”ٹائمز“ واٹرگیت کے بارے میں اپنی خبری کہانیاں چند ہفتے پہلے شائع کر چکے تھے۔ گیلپ پول نے رپورٹ دی تھی کہ نکسن کی مقبولیت، پسندیدگی اور تصدیق کی شرح) انتہا پر پہنچ گئی تھی۔

پھر واٹرگیت کا معاملہ کھلا جس کے ساتھ ووڈوارڈ اور برینٹن کے انکشافات بھی عوام کو مشغول کرنے میں ناکام رہے تھے۔ اور اب نکسن۔۔۔ ایک ایسا صدر تھا جو اس صدی میں ڈیموکریٹس اور ریپبلکنز کی سب سے زیادہ خوفزدہ صدر تھا۔ اس کے باوجود اپنے اقتدار اور قوت کے عروج پر تھا۔ اور حکومت کا کنٹرول مضبوطی سے اس کے ہاتھ میں تھا۔

اگر نکسن کی تنظیم نو کا سلسلہ جاری رہتا تو کیا ہوتا؟ اگر نکسن اپنے دفتر میں براہمان رہتا تو پھر کیا ہوتا؟ واشنگٹن کے بھیدی لرز رہے تھے۔ نہ صرف یہ کہ وہ اپنے آٹھ اعلیٰ افسروں کے ذریعے واٹس ہاؤس کی تمام کامیابیوں میں مضبوطی سے اپنے ہاتھ میں رکھتا بلکہ وہ حکومت کی ہر اجنسی میں اپنے لبرجنت۔۔۔ کلیدی عہدوں پر فائز کر دے گا۔

ان کے لئے جو نکسن سے خوفزدہ تھے یہ صورت حال بہت خراب تھی۔ اور پھر اچانک جیسے ایک پکا ہوا پھل درخت سے گرتا ہے، جنوری ۱۹۶۳ میں واٹرگیت کے دروازے زور سے کھل گئے۔ لو اس کے نتیجے میں کیا ہوتا؟ نکسن کو کمزور اور معذور بنایا جاسکتا تھا۔ اس سے بھی بدتر صورت یہ ہوتی کہ وہ مدافعت کی صورت اختیار کر لیتا اور اس قابل نہ رہتا کہ حکومت کو اپنی مضبوط گرفت میں اس طرح رکھ سکے جیسا کہ پہلے کبھی نہ ہوا تھا۔

(ب) واشنگٹن میں اقتدار کے ہلاک ہیں یہ آغاز سے ہی بہت اہم رہے ہیں۔

۱۔ پریس

۲۔ بیورو کریسی

۳۔ دی کانگریس

۴۔ انٹیلی جینس کمیونٹی

ان میں سے ہر ایک کو جنوری ۱۹۶۳ میں صدر سے خطرہ لاحق تھا۔ جو کہ اس وقت امریکہ میں اپنی عوامی مقبولیت کے عروج پر تھا۔ ان میں سے ہر ایک نے پوری شدت اور قوت کے

ساتھ رد عمل کا اظہار کیا کیونکہ صدر بھڑکھن تھا۔ فروری اور مارچ ۱۹۷۲ء کے مہینوں میں انہوں نے وائٹ ہاؤس پر چھ دوڑنے کا ارادہ کر لیا۔
میں اپنے آپ کو ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے صدر، یا اپنے ترقی پذیر ملک کو ایک سپر پاور کا ایک دوسرے کے مساوی قرار نہیں دے رہا ہوں۔ لیکن اگر واشنگٹن میں قوت کے چار بلاک تھے تو اسلام آباد میں بھی طاقت کے چار بلاک موجود تھے۔

۱۔ ملٹری

۲۔ بیوروکریسی

۳۔ بڑے تاجر

۴۔ سیاستدان

میں اس وقت عوام میں اپنی مقبولیت کی انتہا پر تعجب میرے خلاف سازش کا آغاز ہوا۔ حقیقت یہ ہے کہ پی اےن اسے کی تحریک عوام کو میرے خلاف مشتعل کرنے میں ناکام رہی تھی۔ میں بھی بڑے پیمانے پر زبردست تنظیم نو کرنے اور اصلاحاتی پروگرام کا نفاذ اپنے سے مینڈیٹ کی قوت کے بل بوتے پر جو مجھے مارچ ۱۹۷۷ء کے انتخابات میں حاصل ہوا تھا کرنا ہی پوری تیاری کر چکا تھا۔ اس پروگرام کو وہ لوگ جانتے تھے جنہیں پالیٹیمین نے "انٹیلی جنس کمیونٹی" کا نام دیا ہے۔ میری انتظامیہ میں ایک "گہرا ملن" موجود تھا، جو "اندرونی اطلاعات و معلومات" گزرتے مہینوں میں ایک اردو اخبار کو فراہم کرتا تھا۔ اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ میں کس طرح انٹیلی جنس ایجنسیوں کو اپنے ذاتی اور سیاسی مقاصد کے لئے استعمال کرتا تھا۔ پورے قریباً نصف میں یہ عجیب رمز موجود ہے۔ لیکن اب اس جگہ کو چھوٹا ہوں جو سب سے زیادہ درد کرتی ہے۔

ایوب خان اور یحییٰ خان کس طرح انٹیلی جنس ایجنسیوں کو استعمال کرتے تھے؟ یحییٰ خان نے انٹیلی جنس ایجنسیوں کو اپنے سیاسی مقاصد کے لئے سیاست دانوں میں پھوٹ ڈالوانے اور ۱۹۷۰ء کے انتخابات پر اثر انداز ہونے کے لئے استعمال کیا تھا۔ یہ میں سب کچھ جانتا ہوں کہ میں اس وقت اس کا آخری سرا تھا میری جماعت پر انٹیلی جنس ایجنسیوں کا شدید ترس دباؤ تھا۔ ۱۹۷۰ء کے انتخابات کے بعد اور حتیٰ کہ یحییٰ خان کے مارشل لاء کے خاتمے کے بعد بھی دونوں سول اور ملٹری انٹیلی جنس ایجنسیاں میری پارٹی پر دباؤ ڈالنے کے لئے ٹھسی ہوئی تھیں تاکہ منتخب نمائندوں کو اپنے اثر و رسوخ سے زیر کر سکیں۔
جنوری ۱۹۷۲ء میں لندن کے لئے جاتے ہوئے، شیخ مجیب الرحمن نے مجھے بتایا تھا کہ

مغربی پاکستان کے پانچ افراد پر ہاتھ ڈالنا چاہتا ہے اور انہیں پلٹن میدان میں پھانسی پر لٹکوا دینا چاہتا ہے۔ ان پانچ میں سے دو کا تعلق ملٹری اور سول انٹیلی جنس سے تھا۔ مجیب الرحمن نے سیاسی شعبے میں ان کی کھناؤنی کارروائیوں کی تفصیلات مجھے بتائی تھیں۔ میں نے انہیں بتایا کہ ہمارا تجربہ بھی اس سے مختلف نہیں ہے۔ ایوب خان بھی سیاسی مقاصد کے لئے انٹیلی جنس ایجنسیوں کو استعمال کرتا تھا۔ اس نے DAC (ڈیک) کو سول اور ملٹری انٹیلی جنس ایجنسیوں کے ذریعے توڑنے کی کوشش کی۔ اس نے انٹیلی جنس ایجنسیوں کے ذریعے پوری کوشش کی کہ میری پارٹی مضبوط نہ ہو سکے۔ اس نے ۳۰ نومبر اور یکم دسمبر ۱۹۶۸ء کو ہمارے بنیادی اجلاسوں کو سبوتاژ کرنے کی کوشش کی۔ اور اس نے انٹیلی جنس ایجنسیوں کے ذریعے ہی اس کی حکومت کے خلاف میری سرگرمیوں کو روکنے کی کوشش کی۔ ایوب خان کس طرح انٹیلی جنس ایجنسیوں کو استعمال کرتا تھا اس کی میں صرف تین نمائندہ مثالیں پیش کرتا ہوں۔

(۱) جب ۱۹۶۵ء کی پاک بھارت جنگ شروع ہوئی تو ملٹری انٹیلی جنس اس قابل نہیں تھی کہ بھارتی آرمرڈ ڈویژن کا اپنا پتہ معلوم کر سکیں۔ ایوب خان بہت مشتعل اور ناراض ہوا۔ اس نے انٹر سروسز کے ڈائریکٹر جنرل بریگیڈیر ریاض حسین (جو بعد میں جنرل بنے اور یحییٰ خان کے دور میں بلوچستان کے گورنر بھی بنے) کو راولپنڈی اپنے دفتر میں طلب کیا۔ وزیر خارجہ کی حیثیت سے میں بھی وہاں موجود تھا۔

ایوب خان نے ریاض حسین کو خوب لتاڑا اور اسے بتایا کہ ملٹری انٹیلی جنس نے ملک کو سرنگوں کر دیا ہے۔ میں نے بریگیڈیر ریاض حسین سے کہا بھارتی آرمرڈ ڈویژن بھجوسے ہیں گری ہوئی سوئی تو نہیں ہے کہ اس کا سراغ نہ مل سکے۔ مجروح ہلچے والی آواز میں صدر ایوب خان نے کہا۔ "یہ ایک جسیم عفریت ہے سوئی نہیں"۔ وہ بریگیڈیر ریاض حسین کو دہانا چلا گیا کہ وہ اسے بتائے کہ آخر ملٹری انٹیلی جنس میں کیا خرابی واقع ہوئی ہے۔ کانپٹی ہوئی آواز میں بریگیڈیر ریاض حسین نے جواب دیا۔ "جناب جون ۱۹۶۳ء کے ملٹری انٹیلی جنس کو سیاسی کام سونپے گئے ہیں کہ انتخابات اور انتخابات کے بعد کے معاملات کو دیا جاسکے"۔ چند دنوں کے بعد میں معلوم ہو گیا کہ بھارتی آرمرڈ ڈویژن کہاں ہے۔ یہ اپنا پتہ ملٹری انٹیلی جنس کی سرگرمیوں سے نہیں بلکہ حسن اتفاق سے مل گیا تھا۔ بھارت میں ایک مجاہد نے ایک بھارتی ڈسٹنچ سوار کو مار گرایا تھا۔ اس سوار سے جو کانڈات ملے تھے، ان سے ہمیں وہ معلومات مل گئیں جن کی ہمیں ضرورت تھی اور اور یوں ہمیں سکھ کا سانس آیا۔

(ب) ایوب خان کی خصوصی پالیسی کے تحت ، انٹیلی جنس ایجنسیوں نے ۱۹۶۴ء میں جنرل اعظم کو صدر آئی امیدوار اور صدر ایوب کا حریف بننے کے روکنے کی کارروائی کی ۔

(ج) نومبر ۱۹۶۴ء کے اوائل کا ذکر ہے کہ مشرقی پاکستان کے ایک نامور سیاست دان جو میرے انتہائی قریبی دوست تھے ۔ مجھے ملنے میری رہائش گاہ ، کلکتہ میں کراچی تشریف لائے ۔ وہ COP کے ایک سرکردہ رہنما تھے ۔ کھانے کے بعد اور رخصت سے کچھ پہلے ، انہوں نے اپنی چھوٹی آنکھوں کو سکیرا کر اور چھوٹی بنا تے ہوئے مجھے بتایا کہ ایک سابق وزیر اعظم پاکستان ایک ماہ کے اندر اندر ایک ایسا نام چلائیں گے کہ جس کے نتیجے میں ایوب خان اور ہم سب ہوا میں اڑ رہے ہوں گے ۔

میں نے ان کے اس ریمارک کو ایک مذاق سمجھا اور انہوں نے مجھے بتایا میرے دوست سنو ، میں اس کی تفصیلات سے آگاہ نہیں ہوں ۔ لیکن اس کا تعلق کسی ایسے ٹیلی گرام سے ہے جو ایوب خان نے اس وقت کے پاکستان کے وزیر اعظم کو صدر ناصر کے بارے میں واشنگٹن سے روانہ کیا تھا ۔ اس وقت ایوب خان پاکستان کی افواج کے کمانڈر انچیف تھے ۔ جب میں راولپنڈی آیا تو میں نے صدر ایوب سے اس بات چیت کا ذکر کیا ۔ وہ سوچنے لگا ، ایک منٹ تک چھت کو گھورتا رہا ۔ اپنی میز سے قہقہے اٹھائی اور اور مجھے بتایا ”لیکن اس واقعہ کو طویل عرصہ ہو چکا ہے ۔ اور مجھے یاد نہیں کہ میں نے کیا لکھا تھا ، پھر اس نے اس پر اضافہ کیا ”لیکن یہ نو سرکولیشن ٹیلی گرام تھا“ ۔ پھر اس نے مجھے مزید بتایا کہ اس نے اس ٹیلی گرام کی سفارت خانے کی کاپی کو واشنگٹن میں ہماری چانسری میں اپنے سامنے جلادیا تھا ۔ اور پھر پاکستان واپس آکر اس نے خود یہ معائنہ کیا تھا کہ دفاتر وزارت خارجہ کی نقل اور دوسری دو نقل کو بھی جلیا اور ضائع کیا جا چکا ہے ۔

میں نے اسے بتایا کہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ بوڑھے آدمی نے جب وہ وزیر اعظم نہیں رہا تھا تو سائفر ٹیلی گرام کو اپنے قبضے میں لے لیا ہو ۔ میں نے ایوب خان کو مشورہ دیا کہ وہ اس نے سائفر پیغام کے ساتھ کیا کیا تھا ، اس کے بارے میں سوچے ۔ اور یاد کرے کہ اس نے کیا لکھا تھا ۔ اس نے مجھے بتایا کہ اس سے کہیں زیادہ ناگزیر امر یہ ہے کہ یہ ٹیلی گرام کس طرح حاصل کیا جائے ۔ اس نے انٹرکونیکٹر کا بٹن دبایا اور اپنے ملٹری سیکرٹری سے کہا ”توازش ، ڈی آئی جی ، ڈی جی اور آئی ایس آئی کے ڈائریکٹروں سے کہو کہ وہ فی الفور مجھے آگرمیں ۔ نصف گھنٹے کے اندر وہ دونوں صدر کے دفتر میں تھے ۔ ایوب خان نے انہیں بتایا کہ میں نے اسے کیا بتایا ہے اور اس نے مجھے کیا بتایا تھا ۔ اس کے بعد وہ ان کی طرف آگے جھکا اور انہیں کہا :

”جنٹلمین ، مجھے وہ ٹیلی گرام چاہئے ۔ خواہ اس کی قیمت فورٹ ناکس کے پورے سونے کی قیمت میں ہی کیوں نہ ادا کرنی پڑے ۔

لگ بھگ بیس دنوں کے بعد صدر کے اے ۔ ڈی ۔ سی نے مجھے مطلع کیا کہ میں فوراً ایوب خان سے ملاقات کروں ۔ جب میں اس کے دفتر میں داخل ہوا تو مسرور اور پچھلے پرے کے ساتھ ایوب خان نے سائفر ٹیلی گرام کو ہوا میں لہرایا اور میرے ہاتھوں میں دیدیا ۔ اسے پڑھنے کے بعد میں نے کہا ”جناب صدر میری انگلیاں جلنے لگی ہیں ۔ اس دستاویز کو فوراً جلا دیں“ ایوب خان تباہ کن روشنی ترک کر چکا تھا ۔ میں سکارپینا تھا میں ماچس یا لائٹراپنے ساتھ کبھی نہ رکھتا تھا میں نے میز پر رکھے چاندی کے سگریٹ باکس کو اٹھایا اور اس میں سے دیا سلانی نکال کر ایوب خان کو پیش کی تاکہ وہ یہ رسم سوختنی ادا کر سکے ۔

یہ ایک شاندار سیاسی کارنامہ تھا جو ایک انٹیلی جنس ایجنسی نے انجام دیا تھا ۔ لیکن یہ کارنامہ ایک صدر کے لئے کیا گیا ۔ انتخابات میں اس کے مقاصد کے لئے انجام دیا گیا ۔

میں اور کئی مثالیں دے سکتا ہوں ، لیکن میں اپنا نکتہ واضح کر چکا ہوں ۔ میرے دور میں ایٹمی جینس ایجنسیوں نے وہ بھیانک کارنامے انجام نہیں دیے جو وہ مارشل لاء ڈکٹیٹروں کے لئے انجام دیتی رہی ہیں ۔ ہم جانتے ہیں کہ یہ ایجنسیاں اس وقت کیا کر رہی ہیں ۔ وقت آنے پر ہر بات کا انکشاف ہو کر رہے گا ۔

میچ بنانے والے

اس خاص وقت پر ، اس قرطاس ایٹش کے جاری کئے جانے کے بنیادی مقصد کے بارے میں وسیع خطوط پر اس کی تصنیف اور مصنف ، الیکشن کمیشن اور الیکشن کمیشن ، ماضی اور حال ، منصوبہ بندی اور دھاندلی کی تیاریوں کے مابین فرق ، جسے حکومت کی پالیسی بتایا گیا سرکاری افسروں اور حکمران پارٹی کے مابین تعلقات ۔ حکومت کے دائرہ کار کے تحت مختلف شعبوں اور وزارتوں سے فائدہ اٹھانا ، ان سب امور کے بعد اب میں ایسے کچھ افسروں پر بات کروں گا جنہیں قرطاس ایٹش میں بڑا کام تھا کیا گیا ہے ۔

قرطاس ایٹش میں بہت زیادہ جگہ میرے نام نہاد ”میچ میکرز“ (میچ بنانے والوں) کو دی گئی ہے ۔ چونکہ میرا میچ اس ملک کے محنت کش عوام کے ولوں پر نقش ہے اس لئے عوام

پر توجہ دینا وقت کا ضیاع ہو گا وزارت اطلاعات اور نشریات اور اس کے اعلیٰ اور طاقتور افسروں کا وہ کردار یاد کرتے ہوئے، جس کے ساتھ فیملی مارشل محمد ایوب خاں، مارشل لاء کے والد کا جو ایجن ان افسروں نے ”سنہری زمانے“ اور عشرہ اصلاحات کے درمیان بنایا، میں اس موضوع پر بحث کرنے سے گریز کروں گا۔

چند افسر جن کا بطور خاص ذکر ہے وہ ہیں۔
(۱) مسٹر وقار احمد شیپلسمنٹ اور کینٹ سیکرٹری

(ب) مسٹر محمد حیات مٹن سیاسی مشیر۔

(ج) مسٹر افضل سعید، سیکرٹری وزیراعظم۔

(د) مسٹر راؤ عبدالرشید سپیشل سیکرٹری۔

چونکہ میں نہ تو بیوروکریٹک اور نہ ہی فوجی سیاست دان ہوں، میرا ناقابل تفریق اصول یہ رہا ہے کہ اپنے سیاسی فیصلوں کے لئے سیاست دانوں کے مشوروں پر انحصار کروں۔ میں نے ہر طرف سے تجاویز اور مشوروں کا خیر مقدم کیا ہے، لیکن میرے سیاسی فیصلے میرے ذاتی سیاست دانوں کے مشوروں پر استوار تھے۔ اس کا ذکر میں بیوروکریسی کا ذکر کرتے ہوئے کر چکا ہوں۔ میں عوام کا ایک آدمی ہوں۔ میں عوام کی ایک تخلیق ہوں۔ اس لئے یہ میرے لیے تصور کرنا ہی محال ہے کہ میں سیاسی امور میں بیوروکریٹ پر انحصار کرتا ہوں یہ میرے سیاسی فلسفے اور میرے مزاج کے قطعی منافی ہے۔ واحد فیصلہ جو میرے لئے ہے وہ عوام کا ہے اور یہ امتحان سیاسی سطح پر حل کیا جاتا ہے نہ کہ بیوروکریٹک ذرائع سے۔

مسٹر وقار احمد میری انتظامیہ میں ایک کلیدی عہدے پر فائز رہے۔ ۱۹۷۴ء میں ان کی تقرری سے چند ہفتے پہلے تک، میں گزشتہ دس برسوں میں انہیں نہیں ملا تھا۔ حنیف راس نے پنجاب کا وزیر اعلیٰ بننے کے بعد ہی مجھے اکسایا، کہ میں ایک جگہ پہچانے سکال کو ملاقات کے لئے وقت دوں۔ جب اس شریف آدمی نے مجھ سے ملاقات کی تو اس نے واحد موضوع جس پر بات کی، یہ درخواست تھی کہ میں صوبہ پنجاب میں مسٹر مٹن کے تجربے قابلیت سے استفادہ کروں۔ میں نے کہا کہ میں اس کی سفارش پر غور کروں گا۔

اس روز جب حنیف راس مجھ سے ملے تو میں نے انہیں کہا کہ وہ مسٹر مٹن کو پنجاب میں مشیر بنانے کی درخواست براہ راست مجھ سے کر سکتے تھے۔ حنیف راس نے مکمل حیرت کا اظہار کیا کہ انہوں نے پنجاب میں مسٹر مٹن کی تقرری کی حمایت نہیں کی۔ اور اغلباً مجھے غلط فہمی ہوتی ہے۔ اس کے باوجود میں نے مسٹر راس کے دوست سے جو وعدہ کیا تھا اسے نبھاتے

ہوئے مسٹر مٹن جن کا پی پی پی سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ جو ضلع کیمپل پور کے ایک ریشٹرو سیاست دان تھے، میرے سیاسی مشیر بن گئے۔ اس کا سندھ کے دور دراز علاقے میں واقع نام نہاد اور پلان سے کوئی تعلق نہیں بنتا۔

راؤ عبدالرشید صوبہ پنجاب میں انسپیکٹر جنرل پولیس تھے۔ جب صادق حسین قریشی پنجاب کے وزیر اعلیٰ بنے تو معاملات سمجھانے کے بعد انہوں نے چاہا کہ صوبے میں ان کا اپنا آدمی انسپیکٹر جنرل پولیس بنے۔ میں نے راؤ عبدالرشید کو اپنا سپیشل سیکرٹری مقرر کر لیا، اس میں وزیر اعلیٰ پنجاب کی خواہش کو پیش نظر رکھا گیا تھا۔ اگر راؤ عبدالرشید روشن اور ایم کوٹ لکھتے تھے تو اس کا یہ مطلب نہیں نکلتا جو قرطاس امینض میں نکالا گیا وہ میرے پرنسپل ایڈوائزر بن گئے تھے۔ میں ان عام سرکاری افسروں اور وزیروں کا جن کا میرے ساتھ مستقل رابطہ ہوتا تھا حوصلہ افزائی کرتا تھا کہ وہ براہ راست اپنے خیالات کا اظہار کریں۔ قرطاس امینض اپنا راستہ بدل کر، یہ تاثر تخلیق کرتا ہے کہ راؤ عبدالرشید کا اثر و رسوخ مجھ پر مسلط ہو گیا اور وہ میری پالیسیوں کی تشکیل میں اہم کردار ادا کرتا تھا یہ بالکل غلط ہے۔

قرطاس امینض صفحہ ۱۷ پر بیان کرتا ہے اور اس نوٹ کو سابق وزیراعظم کے سامنے اس کے سپیشل سیکرٹری راؤ عبدالرشید خان نے پیش کیا۔ جو انتخابات اور سیکورٹی کے امور نمٹانے میں ایک طاقتور شخصیت کی حیثیت سے ابھرے تھے۔ صفحہ ۳۶ پر قرطاس امینض بیان کرتا ہے ”راؤ عبدالرشید خان، سابق وزیراعظم کے سپیشل سیکرٹری اور سیاسی امور میں اس وقت ان کے کلیدی مشیر نے چاروں صوبوں کا دورہ کیا اور ایک تفصیلی رپورٹ مسٹر بھٹو کے سامنے ۱۱ مئی ۱۹۷۹ کو پیش کی۔“

قرطاس امینض کے صفحہ ۶۹ پر بتایا گیا ہے۔ درحقیقت راؤ عبدالرشید اتنے طاقتور ہو گئے تھے کہ وہ آزادانہ مرکزی وزراء کی کارکردگی پر تنقید کرتے تھے۔ جن میں شیخ رشید اور ملک معراج خالد جیسے سینیٹرز اور پاداشی کے زعماء جیسے ڈاکٹر مبشر حسن، صوبائی وزراء اعلیٰ اور وزیر شامل میں اکثر و بیشتر ان کے ریکارڈ سخت ہوتے تھے جیسے ضمیمہ ۳۱ سے ظاہر ہے۔ ان کی تجاویز اور سفارشات پر مسٹر ڈیڈ اسے بھٹو کو مائل کرتے تھے۔ جیسا کہ ان کے متعدد دو حواشی کے نوٹس سے ظاہر ہے۔ جن کا ذکر کیا جا چکا ہے یا آئندہ باب میں ذکر ہو گا اور ان سے یہ ثبوت مل جاتا ہے۔

یہ قتل عام کی ایک کوشش ہے۔ اس منمولہ بیان میں میں پہلے سے ہی یہ نشاندہی کر چکا ہوں۔ کہ میں نے راؤ رشید کی متعدد سفارشات کو مسترد کیا تھا۔ اس کی تصدیق خود قرطاس

ایٹش کرتا ہے۔ میری اندرونی کونسل کی ایک بھی سیاسی میٹنگ میں راؤ رشید نے شمولیت نہیں کی۔ مسٹر محمد حیات مٹن نے ملٹری ایک دو سیاسی میٹنگوں میں شرکت کی تھی۔ لیکن اس کے بعد انہیں بھی اس سے خارج کر دیا تھا کیونکہ پارٹی کی مرکزی کمیٹی کے رکن اور ایک وزیر نے مسٹر مٹن کی شرکت پر اعتراضات کئے تھے۔ جو کہ راؤ رشید کے مقابلے میں سب سے زیادہ سیاستدان تھے۔ میری مشکلات اور پاکستان پیپلز پارٹی کی اخلاقیات ایسی تھیں کہ مجھے دیتے کہ میں ایک پیشہ ور ریورٹ کو استعفا تقور بنا دیا کہ جو میرے سیاسی ساتھیوں پر ایک مینار بن جائے۔ قرطاس ایٹش کے مصنفوں نے یہ تاثر دینے کے لئے ایک ”قانونی“ موٹائی بھی کی یہ جواز آور محرک ذہانت پر مبنی نہیں۔ مقصد قتل عام ہے۔

(۱) مارشل لاء کی نظربندی اور تحویل کے زمانے میں ”کلیڈیٹرز“ راؤ رشید کے قلعی طور پر مجھے جھوٹے کیسوں میں پھنسانے سے انکار کر دیا۔ مہینوں ان پر سخت لیکن ناکام مشقت کی کوششوں کے بعد، انہیں نظربند کرنے والوں نے انہیں ملازمت سے ڈسمس کر کے آزاد کر دیا۔

(۲) اپنی رہائی کے بعد انہوں نے سپریم کورٹ میں ایک بیان حلفی داخل کیا۔ جس میں وہ تمام تفصیلات بیان کی گئیں کہ کس طرح انہیں جائز اور ناجائز طریقے سے مجھے جھوٹے کیسوں جن میں میرا خیال ہے، انتخابات میں دھاندلی کا مقدمہ بھی ہے پھنسانے کے لئے آمادہ کرنے پر، دھمکیاں دی گئیں اور تنگ کیا گیا۔

(۳) جوہی انہوں نے، اس تاریخی نوعیت کے بیان حلفی کو سپریم کورٹ میں داخل کیا تو انہیں دوبارہ گرفتار کر لیا گیا اور ان کی بیوی کو گھر میں نظربند کر دیا گیا۔

(۴) انہوں نے بلوچستان میں فوج کی طویل موجودگی پر ایک تنقیدی تجزیہ تیار کیا تھا جس کا ذکر نہیں اس مشمولات میں پہلے ہی کر چکا ہوں۔ اور جو قرطاس ایٹش کے صفحہ ۷۲ سے ۷۹ پر شائع ہوا ہے۔ ان کا یہ ۱۳ جولائی ۱۹۷۶ء کا پُر جامع نوٹ، بطور ضمیمہ B-69 شائع کیا گیا ہے۔

(۵) راؤ رشید نے چیف سیکرٹری بلوچستان سید منیر حسین کے نظریات سے اتفاق کیا تھا جنہوں نے اپنے خط مورخہ ۲۹ اکتوبر ۱۹۷۶ء میں راؤ رشید کو مخاطب کر کے دیگر باتوں کے علاوہ کہا تھا۔

”اس میں کچھ شک نہیں کہ بلوچستان کے مقامی سول حکام میں فوجی افسروں کی سرکاری شعبوں میں کھیت کے بارے میں ناراضگی پائی جاتی ہے۔ درحقیقت بلوچستان

میں سول اور ملٹری تعلقات کے موضوع اور بطور خاص بلوچستان میں فوجی افسروں کی ثانوی حیثیت کا مسئلہ مسٹر راؤ رشید نے ۱۲ جون ۱۹۷۶ء کو اٹھایا تھا۔ نصر من اللہ جو بعد میں سید منیر حسین کی جگہ چیف سیکرٹری بنے۔ انہوں نے یہ کوئی ایک خاص پابند اجلاس میں فوجی افسروں کے کردار میں تحفیف کے حوالے سے اٹھایا تھا۔ وہ جنرل جنہوں نے اس کی کانفرنس میں شرکت کی ان میں اپنے کا انداز کا اتفاق تھا۔ اور یوں انہیں اپنے ان ریکارڈس کی اس طرح قیمت ادا کرنی پڑی کہ جو یہی مارشل لاء کا نفاذ ہوا، انہیں بلوچستان کے چیف سیکرٹری کے عہدے سے اتار دیا گیا۔

(۶) قرطاس ایٹش کے صفحہ ۲۳ پر راؤ رشید جو رائے دی گئی ہے وہ دکتی رگ کو چھوٹی ہے۔ اس میں بیان کیا گیا ہے کہ ”واحد اعزاز جو اس ملک میں فوج لے سکتی ہے وہ یہ ہے کہ اس نے پہلے اور منصفانہ انتخابات کرائے۔ اور یہ کہ“ فوجی افسر اب بھی اس کے بارے میں فخر سے گفتگو کرتے ہیں۔

راؤ رشید نے ملٹری کو اس کی فوجی کارکردگی پر کوئی کریڈٹ نہیں دیا۔ فوج نے منصفانہ انتخابات کرائے میں کتنا ہی اہم کردار کیوں نہ ادا کیا ہو۔ لیکن یہ کام بنیادی طور پر سول انتظامیہ کا ہے۔ اور یہ ملٹری کا کام ہے ہی نہیں۔ فوجی تاریخ میں یہ واقعہ رقم نہیں ہو گا۔ یہ ایسا ہی ہے کہ جیسے یہ کیا بات کہ سوویت روس میں سرخ فوج نے عوام کی بیداری کی تحریک چلائی یا یہ کہ چین کی لبریشن آرمی کو صرف یہ اعزاز حاصل ہے کہ اُس نے چین میں تمام پچھلا کر دینے پونٹنگ سیشنوں کو آدمیوں سے بھر دینا۔ لوگوں کے خون کو نہیں گرما سکتا۔

اس ریکارڈ میں جو میں سے اہم نکتہ پوشیدہ ہے وہ یہ ہے کہ مارشل لاء کے نفاذ کے نتیجے میں مستقبل میں فوج ہی اس قابل ہی نہیں رہے گی کہ منصفانہ انتخابات کرائے کا اعزاز بھی حاصل کر سکے۔ فوج نے اپنی جانبداری کے کردار کو معطل کر دیا ہے۔ اگر فوج غیر جانبداری کا کردار بھی ادا نہیں کرے گی، تو پھر یہ جھوٹا سا اعزاز ہی اُسے حاصل نہ ہو سکے گا اور عوام کے ہاتھ اپنے رشتے کے وجود کا جو از ہی پیش نہ کر سکے گی۔ یوں راؤ رشید جو کو میا انڈیک ترین مشیر اور معتد ثابت کر کے، دراصل یہ مقصد حاصل کیا جا رہا ہے کہ ان کے بیان حلفی کے الفاظ کی صداقت کو کم سے کم ثابت کیا جائے اور ان کا دائرہ بھی محدود کر دیا جائے۔ انہیں ایک آزاد گواہ کی حیثیت سے کوئی ثابت کیا جائے۔ اور ان کی گرفتاری اور حراست کے لئے کوئی دوسرا جواز فراہم کر لیا جائے۔ راؤ رشید نے بلوچستان میں فوج کی موجودگی کے بارے میں جو رائے دی، اور مجھے اس میں ملوث کیا وغیرہ وغیرہ۔۔۔ انہیں اس کی نہیں بلکہ اس بیان حلفی کی سزا دی جا رہی

ہے۔ ان کی رائے کو بڑھا چڑھا کر پیش کرنے کے اپنے مقاصد ہیں۔ ان کی اس طرح پروپگنڈا کرنا کہ وہ میری حکومت میں دوسرے طاقتور فرد تھے بلا جواز نہیں بلکہ اس پروپگنڈا سے میرے خلاف خاص مقاصد کا حصول ہے۔

(۶)

لاڑکانہ پلان

میں تیزی سے اس مسئلے سے نمٹنا چاہتا ہوں۔ جسے قرطاس ایض میں ”ماڈل ایکشن پلان“ کا نام دیا گیا ہے۔ ہر وہ شخص جو میرے طریق کار، زبان اور مسائل سے آشنا ہے۔ وہ فوراً یہ دیکھے گا کہ میں نے ایسا بے کار اور فضول پلان ڈرافٹ نہیں کیا۔ میں تو بنیادی اصولوں کا وسیع تر کا خاکہ پیش کرتا رہا ہوں اور میرے ساتھی میری گائیڈ لائن کے مطابق منصوبے بناتے رہے ہیں۔ اگر میں نے یہ خاکہ تیار کیا ہوتا تو میرے سیکرٹری مسٹر افضل سعید کے علم میں ضرور ہوتا۔ قرطاس ایض کے مطابق اس کے ۹۹ فل سکیپ ٹائپ شدہ صفحات تھے اور چار ٹائپ شدہ پروفارمات تھے۔ میرا سیکرٹری وزیراعظم کے ایسے بڑے کام سے کسی طرح بے خبر نہیں رہ سکتا تھا۔ اور قرطاس ایض کے صفحہ ۱۶۰ پر اس کا حوالہ دیا گیا ہے۔ جس میں اُس نے لکھا ہے ”یہ میرے علم میں نہیں ہے اس پلان کو کس نے تیار کیا تھا“۔

وہ میرے تمام کاغذات سنبھالتے تھے۔ اس کے بارے میں یہ فرض کیا گیا ہے کہ ایک غیر ملکی سربراہ حکومت سے اس نے میری طرف سے فنڈز لئے تھے، وہ پیکیوں پر دستخط کرتا تھا۔ میں جہاں بھی جاتا وہ میرے ساتھ سفر کرتا تھا۔ اس کے باوجود وہ یہ نہیں جانتا تھا کہ میں پاکستان میں انتخابات کے لئے ایک ماڈل پلان کی تیاری میں مصروف ہوں۔ یہ نام نہاد لاڑکانہ پلان ایک مجلس پیروکار کا تیار کردہ تھا۔ وہ اشتیاق و جوش سے چمکتا ہوا الم تفتی آیا تھا اور اس نے مجھے بتایا تھا کہ اس نے اس پر ایک دن میں بارہ گھنٹے کام کیا ہے۔ اس کے خیال میں یہ ایک شاہکار تھا۔ جب میں نے اسے دیکھے بغیر ایک طرف رکھ دیا تو صاف دکھائی دے رہا تھا کہ اسے کدھ ہوا ہے۔ بڑے چمچاتی انداز میں اس نے کہا سنا ہے اس نے تو اس پر ایک غلام کی طرح کام کیا ہے۔ اور میں ہوں کہ اس پر تھو کا کھج نہیں یہ وہ بات ہے جو اس نے سندھی زبان میں کی تھی۔ وہ ایک حساس اور بڑا جذباتی انسان ہے۔ یقیناً میں نے اسے بوکھلایا تھا اور شاید رنج پہنچایا تھا۔ اور وہ بھی کچھ دوسرے لوگوں کی موجودگی میں نہیں چاہتا تھا کہ کسی طرح اس کے

مجموعہ جذبات پر فوراً مریم لگا دوں۔ میں نے اس کا شکریہ ادا کیا اور اس پر دستخط کر دئے۔ اس پر دستخط کرنے کے بعد میں نے اسے کہا کہ اس کا منصوبہ نہیں بلکہ میرا منصوبہ ہے۔ اس پر سنسنی طاری ہو گئی۔ وہ شخص زندہ ہے اور کئی ایسے لوگ بھی موجود ہیں جو اس واقعے کے وقت موجود تھے۔

اس کے بعد میں نے اس پلان کو نہیں دیکھا۔ نہ اس دن اور نہ ہی اس کے بعد کسی اور دن۔ اس کا کورنگ نوٹ مورخہ ۱۱ اپریل ۱۹۶۶ء اور دوسرا نوٹ مورخہ ۱۲ اپریل ۱۹۶۶ء اسی وقت لکھے گئے تھے جب اس پلان اور فاضل مواد کو جو میرے ساتھی نے اپنے گھر جا کر بھیجا تھا، منانے کے لئے لکھے گئے تھے۔ شاید وہ اس فاضل مواد کو اپنے اصل کانڈاٹ کے ساتھ لانا قبول کئے تھے۔ وہ لوگ جو مجھے جانتے ہیں۔ انہیں علم ہے کہ میں فائلیں منانے میں کسی غیر ضروری تاخیر سے کام نہیں لیتا۔ یہ میری عادت نہیں تھی کہ ہر روز اپنے کام کا سامنا ہو چر منانے بغیر، اٹھ جاؤں۔ بعض اوقات اپنی اس عادت کی وجہ سے اگلے دن کی صبح تک کام کرنا پڑتا تھا۔ اس ساری تفصیل کو بتاتے ہیں یہ رمز موجود ہے یہ مشہور پلان اور اس کا ضمیمہ، ان چند دستاویزات میں سے تھے، جنہیں میں نے پڑھے بغیر آگے بھجوا دیا تھا۔

میرے پاس اتنا وقت کہاں تھا کہ میں ایسے پرو فارما لکھتا؟ اگر میرے پاس اتنا وقت ہوتا بھی تو میں ایسے پرو فارما جس میں نام والد کا نام ذات، مذہب اور ستمبر ۱۹۶۶ء کی عمر تک پچیس چیزیں سمو کر خود اپنی اہانت نہ کرتا۔ معمول کے مطابق، میں نے اسے مسٹر رفیع رضا کی توجہ کے لئے مارک کیا تھا۔ جو اس قسم کی سفارشات کے اہلکار تھے۔ اگر یہ نام نہاد ماڈل پلان میرا ہوتا تو میں کسی راڈ ڈوکری کے حلقہ نیابت کو بطور بنیاد منتخب نہ کرتا۔ بلکہ لاڑکانہ رتو ڈوکری کے حلقہ انتخاب یا میر و خان شہداد حلقہ انتخاب کو چنتا جہاں سے میں اور میرا خداندان انتخاب لڑتے رہے ہیں۔ میں ان دونوں حلقہ ہائے انتخابات کو یوں جانتا ہوں جیسے میری ہاتھ کی پشت ہوں۔ خاص طور پر لاڑکانہ، رتو ڈوکری حلقہ انتخاب۔ میں ان میں سے اس حلقہ انتخاب کو بھی منتخب نہ کرتا۔ جس سے میں ضلع لاڑکانہ کے تینوں حلقہ ہائے انتخابات میں میں کم آشنا تھا۔

ثانیاً یہ کہ اگر یہ میرا پلان ہوتا پھر اس کا کسی نہ کسی طرح نفاذ بھی کیا جاتا۔ اس کا نفاذ ہی نہیں کیا گیا۔ یہ الیکشن کے کانڈو میں کوئی بھی آئندہ کارروائی نہ کرنے کے لئے فائل کر دیا گیا تھا یہ کہنا انتہائی لغو بات ہے کہ اسے پورے پاکستان کے انتخابات کے لئے بنیاد بنایا گیا۔ اگر اس کی یہی حیثیت تھی تو پھر یہ فرضی کہانیاں کیوں، اڑائی گئیں کہ میرا ملٹری سیکرٹری اڈر کر ایٹ

آباد جا رہا ہے اور کئی دوسرے لوگ بھی تاکہ مداخلت کی جاسکے۔ میں پھر یہ بات دہراتا ہوں کہ میں نے یہ پلان کبھی دیکھا اور نہ ہی اسے کبھی طلب کیا۔ کبھی اس پر انحصار نہیں کیا۔ میں اس کے متعلق سب کچھ بھول چکا تھا۔

مجھ پر مقدمہ چل رہا تھا اور میں کوٹ لکھپت جیل میں تھا جب پہلی بار میں نے فیملی ویزن کی خبروں میں لاڑکانہ پلان کے بارے میں سنا۔ میرا اس میں رد عمل یہ تھا کہ معمول کے مطابق یہ حکومت پکاکندہ حرکتیں کر کے لنڈن پلان کے مقابلے میں یہ پلان تخلیق کر کے سیاسی ہتھکنڈہ برت رہی ہے۔ اس اعتبار سے اس رد عمل کا ایک جواز بھی تھا کہ نیپ کے صدر انہی دنوں رہا کئے گئے تھے وہ ان دنوں پنجاب کا طوفانی دورہ کرتے ہوئے بڑے جوش و خروش سے مجھے گالیاں دے رہے تھے اور تلے کر رہے تھے۔ انہیں بے پناہ ہالی وڈ جیسی پینلٹی مل رہی تھی۔ میں تو لنڈن پلان اور لاڑکانہ پلان کے مقابلے پر محظوظ ہو رہا تھا۔ جب میں نے قرطاس امتیض دیکھا۔ اس کے موضوعات پڑھے تو واقعات میرے ذہن میں تازہ ہو گئے۔

جیسا کہ میں بہت جذباتی واقعہ ہوں۔ میں نے کانڈ کے ایک ٹکڑے پر اس لئے اپنے دستخط کر دیے تھے کہ میری وجہ سے میرے انتہائی قریبی دوست کی جو دلآزاری ہوئی ہے، اس کی تلافی کر سکوں۔ میں اس وقت یہ تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ نیک ارادے کے لئے کی جانے والی یہ بات۔ اتنا بڑا مسئلہ بن جائے گی۔ اس وقت کون تصور کر سکتا تھا کہ خاص نسل کے خونخوار کتے خون کی خوشبو تلاش کرنے کے لئے چھوڑ دیئے جائیں گے؟ چلنے دلیل اور منطق کے لئے ہی سہی کہ اگر میں نے اس نام نہاد لاڑکانہ پلان کے بارے میں یہ قبول کر لیا ہے کہ یہ میرا ہے اور چٹائی چڑتال اور غور فکر کے لئے سفارش کی، تو اس کا یہ مطلب کہاں تھا کہ میں نے دھاندلی کی اور اس کے کسی ”غیر قانونی یا غیر مناسب عناصر۔۔۔ میری حکومت کے لئے میری سرکاری پالیسی بن گئی کہ اس پر حملہ کیا جائے؟

ایسے ”پلانوں“ خواہ وہ ماڈل ہوں یا خاص طور پر بنائے گئے۔۔۔۔۔ سے ہٹتے ہوئے اندازوں کی مشق کی طرف آتا ہوں عقل سلیم سے زیادہ کسی چیز کی ضرورت نہیں کہ یہ بات سمجھی جائے کہ مرتب اور اداریہ مجھے تبصرے اور اندازے، کبھی بروئے کار نہ لائے جاتے اگر الیکشن میں فراڈ کرنا ہوتا۔ اس میں ایک دوسرے کو کاٹتے ہوئے دھارے میں جو تضادات سے مملو ہوتے ہیں جیسے کہ ظہاراک ہوتا ہے ”پہلا ہی بات۔۔۔۔۔ میرے عزیز وائسن“ اب اس میں میں کیا کر سکتا ہوں کہ جب وائسن کے گھناؤنے تعصبات اُسے حقائق دیکھنے کی اجازت نہ دیتے ہوں۔

قربان ایض میں درج ہے کہ رفیع رضا نے انتخابی امور پر دو اجلاس منعقد کئے اور ۲ اکتوبر ۱۹۷۶ کو ایک نوٹ بھیجا۔ یہ نوٹ بطور ضمیمہ ۷، صفحہ ۵۵۸-۸ پر پورا منتقل کیا گیا ہے۔ اس نوٹ میں اس کے علاوہ کوئی بات نہیں کہ انتخابات کے لئے مشورے اور منصوبے پر پھر پور غور کیا جائے۔ اس میں درج ہے کہ انتخابی امور، دونوں مشفی اور مثبت پہلوؤں پر ان دونوں مینٹنوں میں تبادلہ خیالات کیا گیا۔ اس میں قبل از وقت ہی انتخابی امور جیسے معاملات۔۔۔ بھارت کے ساتھ تعلقات کا معمول پر لانا اور کشمیر کے مسئلے پر سمجھوتہ شامل ہیں۔ یہ اس کی وہ تعبیر ہے جو کی گئی۔ اور قربان ایض کے مصنفین نے انتہائی غیر فیاضانہ تشریح کی ہے۔ اور کس بنا پر محض ایک جملے پر جیسے ذخارک میں کوئی چیز بوجھوڑی ہو۔ قربان ایض کے صفحہ ۷۰ پر مسئلہ کشمیر پر سمجھوتے پر شک کا مبالغہ کیا گیا ہے۔ ایک ملفوف مسرت کے ساتھ قربان ایض میں کہا گیا ہے۔ ”ایک اہم نکتہ جو قابل ذکر ہے یہ ہے کہ جن امور پر تبادلہ خیالات کیا گیا۔ بھارت کے ساتھ تعلقات معمول پر لانا کشمیر کے مسئلہ پر سمجھوتہ شامل ہے۔“

مجھے بطور خاص نشانہ بنانے کے لئے یہ الفاظ ”مزید برآں کشمیر پر سمجھوتہ“ کے الفاظ بڑے اور نمایاں انداز میں لکھے گئے ہیں۔ رفیع رضا کے نوٹ میں ایسی کوئی بات نہیں کہ میری حکومت نے کشمیر کی پوزیشن پر کسی قسم کا سمجھوتہ کیا ہے۔ یا یہ کہ اس حیثیت پر ان بنیادوں سے حملہ کیا جائے گا۔ ہر طرح کے جھوٹ اور بے معنی الزامات اپوزیشن انتخابی مہم میں لگائی تھی۔ جب میں شملہ سے واپس لوٹا تو بڑے زور و شور سے اپوزیشن نے مجھ پر یہ الزام لگایا کہ میں سب کچھ ”منج آیا ہوں“ جب میں امریکہ سے لوٹا اور اس برس سے اس کی فراہمی پر پابندی اٹھا لی گئی تو مجھے خراج تحسین پیش کرنے کے بجائے اپوزیشن نے مجھ پر یہ الزام تھوپ دیا کہ میں نے بلوچستان میں امریکہ کو ایک اڈہ دے دیا ہے۔ جب میں نے ایران اور شہنشاہ ایران کے ساتھ فوجی اور اقتصادی اشتراک و تعاون میں اضافہ کیا، جن میں ایک بلین ڈالر کی امداد اور مشترکہ صنعتی منصوبوں کی تکمیل بھی شامل تھی تو اپوزیشن نے یہ جھوٹ بولا کہ پاکستان میں تیل پر میرے اور ایران کے مابین ایک پگس خفیہ معاہدہ ہوا ہے۔

اپوزیشن کی ذہنیت کو سمجھتے ہوئے میری حکومت محض پیشگی سطح پر ایسے جھوٹوں کا اندازہ لگا رہی تھی جو اپوزیشن کے زرخیز دماغوں کی طرف سے انتخابی مہم کے دوران بولے جائیں گے۔ ان میں سے سب سے پسندیدہ موضوع ہمیشہ سے کشمیر رہا ہے۔ اس کے سوا اس کا کچھ مقصد نہیں تھا کہ الیکشن میں جو امور سامنے آئیں گے ان کا پیشگی جائزہ لیا جائے۔ خواہ وہ امور مثبت تھے یا منفی، جھوٹے تھے یا سچے، ایسے کئی واقعات اور شواہد موجود ہیں جن سے یہ واضح

نتیجہ نکلتا ہے کہ میری حکومت جموں اور کشمیر کے عوام کے حق خود اختیاری پر پختگی سے قائم تھی۔ یہ تو چیف مارشل لائیڈ منسٹر ہے جو اس وقت سمجھوتے کی انتہائی کوشش کر رہا ہے۔ اپنے لئے راستہ بنانے کے لئے، بڑی فریب کاری سے وہ عوام کو یہ تاثر دینے کی کوشش بھی کر رہا ہے کہ کشمیر کے مسئلے میں کوئی ”خفیہ شق“ وجود رکھتی ہے۔

یہ بھی دیکھئے کہ قربان ایض یحییٰ خان کے مقدمے کے بارے میں نوٹ پر انتخاب کا جو مسئلہ اٹھایا گیا ہے اس کے بارے میں یکسر خاموش ہے۔ صفحہ ۶۳ پر بتایا گیا ہے کہ میرے مشیروں نے یہ پیشگی اندازہ لگایا کہ ”اسمبلی کے اندر اور باہر یہ زور دار مطالبہ کیا جا رہا ہے کہ یحییٰ خان اور دیگر افراد پر مقدمہ چلایا جائے“۔ یحییٰ خان پر مقدمے کے حوالے سے قربان ایض یکسر خاموش ہے۔ فوجی حکومت کے دل میں اپنے بدنام پیشرو کے بارے میں نرم گوشہ موجود ہے۔ اور چیف مارشل لائیڈ منسٹر اسے میرے خلاف استعمال کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ اس لئے اس مقدمہ پر ایک حرف تنقید بھی سامنے نہیں آتا۔

قربان ایض کے صفحہ ۱۰۹-۱۱۳ پر ”عوامی رائے کی پولنگ“ سے بحث کی گئی ہے۔ اگر انتخابات سے پہلے انتخاب کے بارے میں عوامی رائے کی پولنگ انتخاب میں بد عنوانی کے زمرے میں آتی ہے تو پھر ریاست ہائے متحدہ امریکہ جمہوریت کو نقصان اور دھوکا دینے والی سب سے بڑی حکومت ہے۔ اور پھر اس کے قریب قریب برطانیہ، فرانس، وفاقی جمہوریہ جرمنی، کینیڈا اور دوسرے جمہوری ملک بھی دکھائی دے گے۔ ان حالات میں ضیا اور مولو تو برادران ہی جمہوریت پسند ثابت ہو پائیں گے۔ یہ برادران اور ان جیسے دوسرے ہی کیلپ پولز نہیں جو کھلے دیتے۔ کیونکہ یہ حضرات یہاں ایک مقدس مشن پر آئے ہیں۔ یہ عوام کے جھمبون کے اوپر دوڑتے ہیں۔ انہیں انسانی سروں کو گننے کے لئے پولز کی ضرورت نہیں پڑتی۔

بدقسمتوں کی تیاری اور بہترین کی امید کے جذبے کے تحت راؤ عبدالرشید نے ۲۵ جون ۱۹۷۶ کو ایک نوٹ مجھے پیش کیا۔ جس کا عنوان تھا ”بنیادی انتخابی امور جن کا سرکاری پارٹی کو سامنا کرنا پڑے گا“۔ جب میں نے راؤ عبدالرشید کو یہ ہدایت دی تھی کہ وہ ان امور پر ایک نوٹ تیار کر س جو ان کے خیال میں اپوزیشن انتخابات میں اٹھائے گی تو میں نے انہیں بتایا تھا کہ وہ مجھے ممکن حد تک تاریک تصور پیش کریں۔ میں نے انہیں بتایا تھا کہ مجھے ایک ایسے نوٹ کی ضرورت ہے جو مجھے چوکس کر دے۔ لہذا نوٹ نہیں جو مجھے زیادہ آرام دہ حالت کا احساس دلائے۔ لیکن وہ تمام تر مایوسی جو ایک نوٹ میں جمع ہو سکتی تھی، اس کا اقتصادی حصہ یوں

ہے۔ ”حکومت کسی طرح بھی، ایسے تمام الزامات جو خارجہ پالیسی سے تعلق رکھتے ہیں، کا مقابلہ کرنے میں کسی قسم کی دشواری محسوس نہیں کرے گی۔ بلکہ حکمران پارٹی اپنی ٹوٹی کے لئے سابقہ تمام حکومتوں کے مقابلے میں زیادہ پڑوں کا دعویٰ کر سکتی ہے۔ وزیراعظم کی قیادت میں پاکستان نے تیسری دنیا میں رہنما ملک کی حیثیت حاصل کر لی ہے۔ ۱۹۷۱ء سے آغاز ہوتا ہے جب یہ ایک شکست خوردہ قوم تھی۔ اس نے اسلامی سربراہی کانفرنس کا انعقاد کیا جو اسلام کی تاریخ کے ایک بے مثل اور شاندار کارنامے کی حیثیت سے زندہ رہے گی۔ اس میں جو کلاسیابی حاصل ہوئی اس کی نظیر نہیں ملتی۔ دولت مشترکہ سے نکلنے کا بہادرانہ فیصلہ، شمالی کوریا اور ویت نام کے ساتھ تعلقات کا قیام، وزیراعظم کے مختلف ملکوں کے دورے، امریکہ کی سپلائی پر امریکہ کا پابندی اٹھانا، دوطرفہ تعلقات کے حوالے سے بڑی طاقتوں کے ساتھ تعلقات میں توازن، تیل پیدا کرنے والے ممالک کی پاکستانی صنعتوں میں سرمایہ کاری وغیرہ ہمیشہ یاد رہنے والے واقعات ہیں۔ بھارت کے معاملے میں بھی پچانوے ہزار جنگی قیدیوں کی واپسی، ان علاقوں کی واپسی جو جنگ میں بھارت کے تسلط میں چلے گئے تھے، بنگلہ دیش کے ساتھ تعلقات کا آغاز اور فرخا پور راج کے مسئلے پر بنگلہ دیش کے موقف کی حمایت ثابت کرنے میں کہ پاکستان بھارت کے کسی دباؤ میں نہیں آیا جبکہ شملہ کانفرنس ٹیبل میں ہمارے ہاتھ میں کوئی کارڈ نہیں تھا۔“

(قرطاس ایضاً کا صفحہ ۱۲۲)

انتخابات کے زمانے میں جس غلاط، دشنام، بے بودگی اور کمینگی کا مظاہرہ پی ایس اے نے کیا اس انحطاط اور غیر شائستگی کی مثال پوری دنیا پیش نہیں کر سکتی۔ پی ایس اے جو نظام مصطفیٰ کی تبلیغ کر رہی تھی، اس نے بد اخلاقی اور شرمناک الزام تراشی کی تاریک ترین تصویر پیش کی۔

اندازوں اور منصوبوں کی رینج میں قرطاس ایضاً میں مزید بن باتوں کو شامل کیا گیا ہے ان میں کچھ یوں ہیں:

(۱) وہ تجاویز اور مشورے جو مجھے عوام الناس نے بھیجے۔ اور ایسے افراد نے جنہیں میں نہیں جانتا تھا۔

(ب) ایسے مشورے اور تجاویز جو ان لوگوں نے مجھے بھیجے جنہیں میں جانتا تھا لیکن وہ میرے قریب نہیں تھے۔

(ج) وہ مشورے اور تجاویز جو پارٹی کے کارکنوں اور رہنماؤں کی طرف سے بھجوائے گئے۔

(د) پارٹی کے رہنماؤں وزیروں اور پارٹی ورکروں کی شکایات۔

(ر) نئے آئیڈیا۔ جو صحافیوں نے بھجوائے۔

(س) وزیراعظم کی حیثیت سے میرے وہ دورے جو میں نے ملک کے اندر کئے۔

(ش) کسانوں کا ہفتہ، مزدوروں کا ہفتہ، طالب علموں کا ہفتہ، خواتین کا ہفتہ، کے علاوہ دوسرے ہفتوں کی تقریبات جن میں اقلیتوں کا ہفتہ بھی شامل ہے۔

(ص) وسیع پیمانے پر ہمناسک کے مظاہرے، جسے میں اپنی حکومت کی بڑی کلاسیکوں میں سے ایک سمجھتا ہوں۔ اور اس میں شرکت کرنے والے نوجوان ووٹ دینے کے مجاز نہیں تھے۔

(ض) بیلے۔ اگر میں راولپنڈی جیل کے اس بیلے کمرے میں یہ نہ لکھ رہا ہوتا تو میں ہنس ہنس کر بے حال ہو جاتا۔ قرطاس ایضاً نے کوئی موقع فروغداشت نہیں کیا ہے۔ یہ تو ”بیو یا مر جاؤ“ کا معاملہ ہے۔ اسی لئے دشمن کے خلاف جنگی منصوبے میں ایک بیلے بھی شامل کر دیا گیا ہے۔

(ط) غیر ملکی مبصروں کی آراء۔

(ظ) انتخابی منشور کی تیاری۔

یہ اور اسی طرح کے دوسرے مضحکہ خیز الزامات قرطاس ایضاً میں مجھ پر، انتخابات میں دھاندلی اور بد عنوانی ثابت کرنے کے لئے لکائے گئے ہیں۔

انتخابات کے نتیجے کے سلسلے میں مختلف اوقات میں جو تجزیے اور اندازے تیار کیے گئے، ان سے منفی نتائج حاصل کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ آخری تجزیوں میں سے ایک لاہور میں ۴ مارچ ۱۹۷۷ء کو لکھا گیا۔ یعنی پولنگ کی تاریخ سے تین دن پہلے۔ فی الواقع یہ ۵ مارچ ۱۹۷۷ء کی تاریخ تھی۔ اس سیننگ کا آغاز سوادو بجے اس وقت ہوا جب میں لاہور میں ایک شاندار جلوس اور جلسے کے بعد لوٹا تھا۔

محسوس یہ ہوتا ہے کہ قرطاس ایضاً کے خیال میں، افراد کے وہ اندازے اور تجزیے جو وہ انتخابی نتائج کے متعلق لکھتے ہیں حتمی نتائج ہوتے ہیں۔ جبکہ افراد اپنے اندازوں اور تجزیوں میں غلط یا صحیح بھی ہو سکتے ہیں۔ ۱۹۷۸ء میں امریکہ کے صدارتی انتخابات میں ہر شخص کا یہ خیال تھا کہ تھامس ایچ ڈیوی، ری پبلکن امیدوار اولائیویاڈک کا گورنر بڑی آسانی سے صدر ہیری ایلس ڈرومین کو شکست دیدے گا۔ صدر ڈرومین نے یہ انتخابات مخالفوں کو انتہائی مصیبت میں

مبتلا کر کے کاری قسم کے ذریعے اس دھمکی کے ساتھ جیت لے کہ وہ انیسویں کانگریس کو دوبارہ طلب کرے گا۔

امریکی پی این اے - ڈیوی کی فتح کے بارے میں اس حد تک پریقین تھے کہ شکاگو ٹریبیون نے اپنی ۱۹۴۸ کی شدہ سرخی یہ لکھی کہ ”ڈیوی نے ٹرومین کو ہرا دیا“ ایسے ہی عناد کی بنا پر، قرطاس ایض کے مصنفین میری فتح کے ثمرات سے منکر ہو رہے ہیں کہ پارٹی نے پنجاب کے چیف سیکرٹری اور سیکرٹری جنرل پنجاب کے انداز سے بھی زیادہ لکھتیں جیت لیں۔ یہی عناد ہے جو فحشی سے جا ملتا ہے۔

اس کے باوجود میری پارٹی کی فتح کو قرطاس ایض میں صفحہ ۲۰۷ پر تسلیم کیا ہے، یہ اس کا علی حصہ ہے۔

”یہ صاف دیکھا جاسکتا ہے کہ جو حتمی نتائج سامنے آئے وہ تمام اندازوں سے، جو ڈی آئی جی / آئی ایس آئی نے ۴ مارچ ۱۹۷۷ء (ضمیمہ ۱۸۷) کو پیش کئے، ان سے بہتر تھے۔ یوں پی پی پی کو ایک سو بائیس نشستیں مل گئیں جن میں وہ نشستیں بھی شامل تھیں جو ”ریڈکرس“ کالم میں زیر غور آتی تھیں۔ پنجاب کے متعلق اس کالم میں یہ سفارشات پیش ہوئی تھی ”چونکہ یہ اہم ترین صوبہ ہے اس لئے کوئی دقیقہ فرو گذاشت نہ کیا جائے“۔ یہ مشترکہ تجمینہ ایک کورنگ نوٹ کے ساتھ ڈائریکٹر انٹیلی جنس بورڈ کے باقاعدہ دستخطوں کے ساتھ بھیجا گیا تھا۔“

ڈی آئی بی / آئی ایس آئی نتائج کے بارے میں تجمینہ رپورٹ ۴ مارچ ۱۹۷۷ء کو تیار ہوئی، یعنی پولنگ کی تاریخ سے صرف تین دن پہلے، جسے بطور ضمیمہ ۱۸۷ صفحہ ۵۱۶ - اسے پر نقل کیا گیا ہے۔ متذکرہ ڈی آئی بی / آئی ایس آئی کی مشترکہ رپورٹ نمبر ۴ آر / ۱۲۷۹ مورخہ ۴ مارچ ۱۹۷۷ء کے پہلے پیر اگر افری کی پہلی سطر میں بتایا گیا ہے۔

”ہدایت کے مطابق ایک تازہ کنزرویٹو تجمینہ - جو قومی اسمبلی کے سات مارچ ۱۹۷۷ء کو منعقد ہونے والے عام انتخابات کے بارے میں ہے، وزیراعظم کی معلومات و توجہ کے لئے پیش کی جا رہی ہے، اس رپورٹ کے پیرا گراف نمبر ۳ میں بیان کیا گیا ہے ”مجموعی طور پر صوبے پر مبنی تجمینہ ”جو آج کے مطابق“ ہے، ضمیمہ اسے میں پیش کیا جا رہا ہے۔“

اس اہم مشترکہ رپورٹ کو قرطاس ایض میں شامل کرتے ہوئے، ”ایک تازہ کنزرویٹو تجمینہ“ کے الفاظ جس پر مصنفین نے زبردستی لکیر لکائی تھی، حذف کر دیئے ہیں۔ اسی طرح

قرطاس ایض کے متن میں مشترکہ رپورٹ کا پیرا گراف نمبر ۳، جو مندرجہ نہیں اور ”آج کے مطابق“ الفاظ جن پر قرطاس ایض کے مصنفین نے خط کھینچا تھا، حذف کر دیئے گئے ہیں۔ اس انداز سے قرطاس ایض نے اصل دستاویز میں ضمیموں کو مسخ اور توڑ پھوڑ کر پیش کیا ہے۔ یقیناً یہ توڑ پھوڑ خاص مقصد کے تحت کی گئی ہے۔ اور اس کا مقصد یہ ہے کہ عوام تک سارا مواد اس طرح پہنچایا جائے کہ مجھے اور میری حکومت کو گھناؤنا بنا کر پیش کیا جائے۔

ڈی آئی بی / آئی ایس آئی کی مشترکہ رپورٹ مجموعی طور پر یہ دکھاتی ہے کہ یہ تجمینہ ”کنزرویٹو“ اور ”آج کے مطابق“ تھا۔ ”آج کے مطابق“ کے الفاظ اتنے ہی اہم ہیں جتنا کہ ”کنزرویٹو“ کا لفظ۔ کیونکہ ۲۶ فروری ۱۹۷۷ء کے بعد میری پارٹی کی پوزیشن ہر کھینٹے کے بعد بہتر ہو رہی تھی۔ حکمران جماعت کے حق میں پوری فضا چوکی تھی۔ یہ حقیقت جانتے ہوئے مشترکہ رپورٹ میں ”آج کے مطابق“ کے الفاظ استعمال ہوئے اور انہیں خط کشیدہ کیا گیا۔

قرطاس ایض میں بیان کیا گیا ہے ”یہ صاف دیکھا جاسکتا ہے کہ جو حتمی نتائج سامنے آئے، وہ تمام اندازوں اور تجمینوں سے جو ڈی آئی بی / آئی ایس آئی نے ۴ مارچ ۱۹۷۷ء کو پیش کئے، ان سے بہتر تھے۔ یوں پی پی پی کو ایک سو بائیس نشستیں مل گئیں“۔ یہاں ابتدا میں جان بوجھ کر یہ نہیں بتایا گیا کہ یہ محض ایک تجمینہ ہے۔ حقیقی نتائج اس سے بہتر یا بدتر ہو سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ دانستہ طور پر یہ درج نہیں کیا گیا کہ مشترکہ رپورٹ محض ایک ”کنزرویٹو (دروستی) رپورٹ“ ہے۔ تیسری بات یہ ہے کہ یہ جانتے ہوئے کہ ہوا کارخ ہیمپلز پارٹی کی حمایت میں ہو چکا ہے۔ قرطاس ایض میں جان بوجھ کر ”آج کے مطابق“ کے الفاظ حذف کر دیئے گئے۔ دستاویز کو اپنی مرضی کے مطابق ”سنیے“ اور تیار کرنے کی اس ایک مثال سے ہی ثابت ہو جاتا ہے کہ کس حد تک عناد اور تعصب پایا جاتا ہے۔ اس ایک مثال سے قارئین یہ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ وفاقی اور صوبائی سیکرٹریٹ کی دوسری فائلوں کا کیا حشر کیا گیا ہو گا۔ اس میں اہم ترین حقیقت اور عنصر ملٹی انٹیلی جنس کے چیف لیفٹننٹ جنرل جی جیلانی ہیں جن کے فوجی غلے نے اس رپورٹ کو تیار کیا۔ وہ میری حکومت کو انتخابات میں بدعنوانیوں سے بری الذمہ قرار دیتی ہے۔ یوں اس کا دوسرا مقصود یہ نکلتا ہے۔ فوج انتخابات میں فراڈ سے میری حکومت کو بری الذمہ سمجھتی ہے۔ میری پارٹی کی پوزیشن، میری حکومت اور خود میری ذات کو ڈی آئی بی / آئی ایس آئی کی اس رپورٹ کے ذریعے انتقام کا نشانہ بنایا جا رہا ہے، جو دراصل مسلح افواج کی شہادت کی حیثیت رکھتی ہے۔

یہ مستند دستاویز یہ دکھاتی ہے کہ ملٹری انٹیلی جنس کا چیف اس پختہ رائے کا حامل تھا کہ میری حکومت بڑی آسانی سے انتخابات میں اکثریت حاصل کرے گی۔ یہ اس کا کردار یہ ٹو ٹھینڈ تھا کہ میری حکومت قومی اسمبلی میں ایک سو پانچس نشستیں حاصل کرے گی۔ اس کے بعد اس نے اس یقین کا اظہار کیا کہ صورت حال زیادہ سے زیادہ میری پارٹی کی حمایت اور موافقت میں جاری رہے۔ اس کا مفہوم یہ ہے کہ مسلح افواج اس تصویر میں پوری طرح موجود تھیں۔ یعنی جرنیل یہ جانتے تھے کہ میری پارٹی صاف ستھرے مقابلے میں انتخابات میں جیت رہی ہے۔ اور پھر اس کے علاوہ صرف یہی نتیجہ اس رپورٹ سے نکالا جاسکتا ہے کہ خود جرنیل بھی انتخابات کے نتائج میں میری حکومت کے ساتھ سازباز میں شامل تھے۔

ایک صاف ستھری ، منصفانہ لڑائی

میں یہ دکھا چکا ہوں کہ کس طرح انتہائی سطح پر قوطاس اندیش کی ضخیم جلدوں میں بے اثر انداز میں بد عنوانی کو ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ وہ تمام شہادتیں اور ثبوت جو تحریری اور زبانی تھے اور جو میری بے گناہی کا ثبوت فراہم کرتے تھے وہ پوری قوت سے دباؤ اور تباہ کر دئے گئے۔ میں یہ کہہ چکا ہوں کہ میں نے اپنے اعلیٰ عہدیداروں ، وفاقی اور صوبائی وزراء کو کوئی بار ایسی تحریری ہدایت جاری نہیں کی جن میں سخت ترین الفاظ میں انتہاء کیا گیا تھا کہ کسی قسم کی بد عنوانی اور دھاندلی نہ کی جائے۔ مجھے ابھی طرح اپنا وہ مراسلہ یاد ہے جو میں نے ۹ ستمبر ۱۹۷۶ کو اپنے تمام صوبائی وزراء کو روانہ کیا تھا۔ اس میں میں نے کہا تھا ”میں نے اپنے عوام سے منصفانہ انتخابات کا وعدہ کیا ہے اس لئے ایک لڑائی کی طرح انہیں تیار کرنا چاہیے۔“ انتخابات کے امور پر غور و فکر کے لئے بلانی جانے والی وفاقی اور صوبائی سطح کی متعدد کانفرنسوں میں بھی میں نے اسی طرح انتہاء کیا۔ وزیروں اور سرکاری افسروں نے ان کانفرنسوں میں شرکت کی تھی۔

ایک صوبائی وزیر اعلیٰ نے مجھ سے استفسار کیا کہ میں کیوں بار بار یہ دہراتا ہوں کہ انتخابات منصفانہ ہونے چاہئیں۔ میں نے اسے بتایا کہ میں اپنی انتظامیہ کو انتخابات کی ماضی کی تاریخ یاد دلانا چاہتا ہوں اور اس لئے بھی کہ چونکہ میں سرسوز کے امور کے بارے میں اس کے مشوروں پر انحصار کرنا نہیں چاہتا اور نہ ہی سیاست اور نہ ہی الیکشن کے امور کے بارے میں تکیہ کرنا چاہتا ہوں۔

اس کی شہادت کی کوئی وقعت باقی رہتی ہے نہ اسے قابل غور ہی سمجھا جاسکتا ہے۔ اس کے باوجود قاری کو یہ یقین کرنے کی ترغیب دی گئی ہے کہ اس نے میرے خلاف جو گواہی دی ہے اس پر یقین کر لیا جائے۔ بس اتنا کہنا ہی کافی ہو گا ، مشرینگی بختیار اس کے لئے یہ الفاظ لکھنا پسند کرتے کہ افضل سعید گندی نالی میں جاگرا۔ اس کی مذمت صرف میں نے ہی نہیں کی بلکہ انہوں نے بھی اسے ذلیل کیا جو یہ چاہتے تھے کہ اس کی بات پر یقین کر لیا جائے۔

محمد حیات ٹن کو میں اس وقت سرسری طور پر جانتا تھا جب وہ مغربی پاکستان کی حکومت میں ریلوے کے وزیر تھے۔ جرنیل چونکہ غیر منصفانہ انتخابات کا بہانہ کر کے اقتدار پر قبضہ کرتے رہے ہیں۔ میں نے انہیں بتایا تھا کہ فوج بارہ سال یا اس سے بھی زیادہ عرصے سے سیاسی اقتدار پر قابض رہی ہے۔ فوجی پالیسی سیاسی اقتدار سے اس حد تک لطف اندوز ہونے کی عادی ہو چکی ہے کہ مشرقی پاکستان کے عظیم المیہ کے بعد بھی ، ایک سال کے اندر کچھ اعلیٰ افسر حکومت کا تختہ الٹنے کی سازش تیار کر رہے تھے۔

میں نے انہیں بتایا کہ اگر وہ مشرقی پاکستان کو اتنی آسانی سے فراموش کر سکتے ہیں اور ۱۹۷۴ میں حکومت کا تختہ الٹنے کی سازش بنا سکتے ہیں تو پھر وہ یقیناً کسی ایسے موقع کی تلاش میں رہیں گے کہ بارکوں کو چھوڑ کر گورنمنٹ ہاؤسز میں براجمان ہو جائیں۔ مزید برآں میں نے انہیں بتایا کہ پہلی فوجی سازش اور حکومت کا تختہ الٹنے کے نتیجے میں آدھا ملک ہاتھ سے جا چکا ہے۔ ایک دوسری سازش پورا کام مکمل کر دے گی۔ اس بنا پر میں انہیں کوئی ایسا موقع فراہم نہیں کرنا چاہتا تھا کہ وہ کسی بھی بہانے تیسری بار آسکیں۔

جب میں نے پنجاب کے تمام کشنوں کو لاہور میں ۴ مارچ ۱۹۷۷ کو بلوایا تو میں نے ان پر واضح کر دیا کہ بہترین طریقہ جس سے وہ میری حکومت اور ملک کی خدمت کر سکتے ہیں یہ ہے کہ انتخابات منصفانہ اور غیر جانبدارانہ ہوں۔ مجھے یاد ہے کہ میں نے انہیں بتایا تھا کہ وہ مجھے رحمدلی کے تحت نہ گریں۔ میں نے دو نوٹ کھر درے الفاظ میں انہیں بتایا تھا کہ اگر انہوں نے بد عنوانی کی اجازت دی تو اس سے شاید میری پارٹی کچھ زیادہ نشستیں حاصل کر لے لیکن یہ پرہوس قدیم بادشاہ پری جس کی فتح ہوگی۔ فوج اندر آ جائے گی۔ اسی سطح پر میں نے پارٹی کارکنوں کو بھی وارننگ دی۔ میرا یہ رویہ قوطاس اندیش کے صفحہ ۱۱۲ پر صاف دکھائی دیتا ہے ”میں اپنے انتخابات کے بارے میں سوچ رہا ہوں ، میں ایک جدید حکومت کی ضروریات اور تقاضوں کے بارے میں سوچتا ہوں۔“

ایک ریاست اور حکومت جتنی جدید ہوگی ، ملک بھی اتنا ہی آگے بڑھے گا۔ اور اس

قرطاس ایض میں مسٹر افضل سعید کا ذکر میری پارٹی کے فنڈز اور اس الزام کے حوالے سے کیا گیا کہ ایک بے نام سربراہ مملکت نے ہمیں فنڈز کا عطیہ دیا۔ مسٹر افضل سعید کے بارے میں میں اس وقت بات کروں گا جب اس موضوع کا ذکر ہو گا۔ اس موقع پر میں صرف یہی اصرار کرنا چاہتا ہوں کہ اس سرکاری افسر کی وقعت اور کارکردگی کو خود قرطاس ایض نے تباہ و برباد کر کے رکھ دیا ہے۔

مثلاً صفحہ ۷۷ پر قرطاس ایض بتاتا ہے ”لیکن مسٹر افضل سعید خان، جو ہمیشہ مسٹر بھٹو کی برتری کے موڈ کے لئے مستعد رہتے تھے، فوری طور پر ضرورت کے مطابق کیس تیار کرتے“ پھر صفحہ ۲۱۸ پر لکھا ہے ”مسٹر افضل سعید خان، بہر حال، یہ نوٹ کر کے کہ میں ہوا کہ تحقیقات نے ان محلات کو ثابت کر دیا ہے جو مسٹر علی حسن منگی کے کردار کے بارے میں تھے۔ انوں نے مسٹر ممتاز علی بھٹو سے اس کا ذکر نہ کیا؟“

یہ ملحوظ رکھنا ضروری ہے کہ مسٹر افضل سعید خان کو وسط اگست ۱۹۷۷ء میں نظر بند کر دیا گیا اور پھر نظر بندی کے کئی ماہ کے بعد اسے گھر میں زیر حراست رکھا گیا۔ اس لئے یہ کہنا بے جا نہ ہو گا اور قرطاس ایض بھی اس کی تصدیق کرتا ہے کہ افضل سعید خان ”دورانہ پیش اور میں“ تھا۔ وہ واضح طور پر سمجھتا تھا کہ ”دورانہ پیشی اور الگ تھلگ رہنا شجاعت کا بہتر حصہ ہے۔“ جبکہ وہ اس وقت مارشل لاء کے آہنی ہاتھوں کے تکلیف دہ طوفان میں گھرا ہوا تھا۔ اگر یہ افسر ایک سول وزیر اعظم کے ”برتری کے موڈ کے سامنے چوکس“ رہتا تھا تو یہ تو قلع کرنا بلحاظ آواز نہ ہو گا کہ وہ فوجی ڈکٹیٹر کے برتری کے موڈ کے سامنے کتنا بے بس ہو گا۔ جس نے میرے خلاف اپنی نفرت کو بھی چھپانے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔

یہ ذکر بھی ضروری ہے کہ مسٹر افضل سعید کی بیوی مولانا مودودی کی بھانجی ہے۔ اس کی نشاندہی تھی اس وقت کی کئی کئی جب میں سیکرٹری کی حیثیت سے اس کی تقرری پر غور کر رہا تھا۔ اس رشتہ داری پر مبنی اعتراض کو میں نے اس لئے مسترد کر دیا تھا کہ میرے پاس چھپانے کو کچھ نہیں تھا۔ اب مودودی، اور اس کی پارٹی کا چیف مارشل لاء ڈیپارٹمنٹ سرے جو الحاق و تعلق ہے اسے سب اچھی طرح جانتے ہیں۔ قرطاس ایض میں افضل سعید کے وقار کی مذمت کی گئی ہے اور اس کی شخصیت کو بھی قابل اعتراض اور قابل گرفت قرار دیا ہے۔ اس میں اس کی یوں خاکہ کشی کی گئی ہے کہ وہ برتر مودودی مراثمت کرنے کا نااہل اور ایک کمزور آدمی تھا۔ جب ذوالفقار علی بھٹو، اس کے خاندان اور اس کی پارٹی کا معاملہ ہو تو پھر مارشل لاء کے برتر مودودی کے بارے میں کسی مبالغے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ افضل سعید کو اس انداز میں پیش کیا گیا ہے کہ

میں یہ عنوانی کے امکانات بہت کم ہوتے ہیں۔

لاہور میں مقدمے کی سماعت کے دوران دو یا تین مواقع پر پبلک پراسیکیوٹر نے عدالت میں یہ غلط الزام لگایا کہ اپریل ۱۹۷۷ء سے، یعنی حکومت کا تختہ الٹنے سے تین ماہ پہلے، میں اپنے سیکرٹری سے تمام شہادتیں و دستاویزات بنانے میں مصروف تھا۔ اگر میں نے واقعی ایسا کیا ہوتا تو میں شہادتیں و دستاویزات جن کا تعلق انتخابات سے تھا ایک یا دو دستاویزات غائب کرنے کی بجائے، تمام دستاویزات غائب کر دیتا۔ انتخابات میں یہ عنوانی کا بہانہ بنا کر، فوج ان دستاویزات کو میرے خلاف استعمال کرے گی۔ اگر میں واقعی ایسا سمجھتا تو پھر دوسری تمام دستاویزات پر انتخابات سے متعلق دستاویزات کو ترہج دے کر میں انہیں غائب کر دیتا۔

ثانیاً یہ کہ میں نے ایسا کوئی کام ذاتی طور پر نہیں کیا۔ ایسے کاموں کی ذمہ داری تو وفاقی سطح کی ٹیموں اور چاروں صوبوں کی ٹیموں پر عائد ہوتی ہے جو پہاڑ جیسے اونچے دستاویزات کے ذخیرہ کو ختم کر سکتے ہیں۔

یہ اکیلے آدمی کا کام نہیں ہو سکتا۔ یہ ذخیرہ سالوں جمع ہوتا رہا ہے۔ میں ضرورت محسوس کرتا ہوں کہ قرطاس ایض کے تعارف صفحہ (۱) اور صفحہ (۲) پر جو معاندانہ اور ظالمانہ ریمارکس دئے گئے ہیں ان پر بات کروں۔

”دستاویزات، بڑی تکلیف دہ تھوڑے بعد، متنوع ذرائع سے جمع کی گئی ہیں۔ مسٹر بھٹو کی انتظامیہ سے جو لوگ بہت قریب تھے، ان کی طرف سے یہ کوششیں کی گئی تھیں کہ شہادتوں/دستاویزات کو تباہ یا ضائع کر دیا جائے۔ لیکن ایک عجیب و غریب انداز میں مسٹر بھٹو کے بارے میں یہ محسوس کیا جاتا ہے کہ وہ یہ یقین رکھتے تھے کہ وہ ناگزیر ہیں اور ان کی کامیابی یقینی ہے۔ اس لئے وہ اور ان کے ساتھی اس خوف میں مبتلا نہ ہوئے کہ ان کی اپنی باتوں کو تحریری تخفیف میں لائیں۔ وہ اپنے پیچھے ایک ایسا ریکارڈ چھوڑ گئے، جو کم و بیش مکمل ہے۔ اور ادھر سے بن یا قیاس آرائی کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔“

یہ ایک لکھنؤی وضاحت ہے۔ آئیے قرطاس ایض کے نفسیاتی الجھاؤ میں مبتلا مصنفین کی اس بات سے اتفاق کر لیں کہ میں ”اپنی ناگزیریت اور فتح“ پر یقین رکھتا تھا۔ لیکن اس کے باوجود، اپریل ۱۹۷۷ء کے آغاز میں میں یہ بھی ناگزیر سمجھنے لگا تھا کہ میں ایسی تمام دستاویزات ضائع کر دوں جو مجھے انتخابات کی بدعنوانی میں ملوث کر سکتی ہیں۔ جیسا کہ قرطاس ایض میں اعتراف کیا گیا ہے کہ ایسا نہیں ہو سکا تھا۔ ایسا اس بنا کی وجہ سے نہیں ہو سکا جس کے

ذہنی حالت کا بہتر انداز میں علم ہوتا ہے کہ وہ سیاسی دوستوں اور دشمنوں کے بارے میں کیا سوچتے تھے۔
اس سے قطع نظر کہ میں اس نوٹ کا حوالہ دے رہا ہوں، یہ ظاہر کرتا ہے کہ جو کچھ بھی میرے ذہن میں ہو، بد عنوانی کا خیال تک نہیں تھا۔ ورنہ میں ان تمام مشیروں کے بارے میں یوں پریشان نہ ہوتا۔ جن پر قیوم خان اس خاص وقت میں ہونے کی کوشش کر رہے تھے۔

”اپنے افسروں اور ماتحتوں کو ہدایات جاری کرتے ہوئے“ براہ کرم اس نوٹ کو انتہائی رازداری میں رکھیں، میں نے دو وفاقی وزیروں کے ناموں کا ذکر حفظ ماتقدم کے طور پر کیا ہے۔ ہم موجودہ تنظیم و ترتیب میں کوئی خلل ڈالنا نہیں چاہتے۔ ہم انتخابات تک انہیں اپنے ساتھ رکھنا چاہتے ہیں۔ اور اگر ہم جیت گئے تو انتخابات کے بعد بھی انہیں ساتھ رکھنے کے خواہاں ہیں۔ لیکن ان کی حالیہ سرگرمیوں کے پیش نظر ہمیں تمام واقعات کے لئے پہلے سے تیار رہنا چاہیے۔ ہماری طرف سے غیر دانشورانہ غلطی اور توڑ پھوڑ کا کوئی قدم نہیں اٹھایا جائے گا۔ لیکن اگر ”ہمارے دوست“ اپوزیشن کے ذریعے گمراہ ہو گئے اور ان کے پیچھے میں پیچھے گئے تو پھر انہیں اور ان کے مفادات کو جو نقصان پہنچے گا ہم اس کے ذمے دار نہیں ہوں گے۔“ (صفحہ ۱۹۷)

یہ نوٹ ظاہر کرتا ہے کہ میں نے یہ تصور نہیں کیا تھا کہ ہم انتخابات میں جیت جائیں گے۔ میں نے اس میں کہا ہے ”اگر ہم جیت گئے“۔ میں ایسے الفاظ بھی استعمال نہ کرتا، اگر انتخابات کے بارے میں میرے مختلف خیالات ہوتے۔ اس میں قطعی طور پر کوئی ایسی نامناسب بات نہیں ہے کہ میری کابینہ کے مسلم لیگی ارکان اگر گمراہ ہو جائیں تو پیشگی احتیاطی تدابیر اختیار نہ کی جائیں۔ وہ چالیں چل رہے تھے اور ان کا طرز عمل بگڑ رہا تھا۔ میرا طرز عمل مثالی تھا۔ میں نے کہا کہ ان کے تمام ہتھکنڈوں کے باوجود، میں انتخابات میں جیت جانے کے بعد بھی انہیں اپنی کابینہ میں شامل رکھوں گا۔ تا آنکہ وہ میرے لئے جلیبیوں رام نہیں بننے۔ ایک قول ہے کہ ”سیاست اجنبی لوگوں کو بستر کا سا تھی بنا دیتی ہے۔“

میں یہ اجازت نہیں دے سکتا تھا کہ قیوم خان کی زندگی بھر کا یہ خواب اس طرح سچ ہو جائے کہ میں اسے ایک جی پست پر ایک سندھی پیر اور وزیر سے کاشریک بستر بنا دوں۔ جیسا کہ مسلم لیگ کے صدر اور وزیر اعظم پاکستان کے ساتھ اشتراک تھا۔ اس طرح سے میرے ذہن کی گہرائی کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ میں اپنے سیاسی دوستوں اور دشمنوں کے بارے میں کیا

تحت یہ منصوبہ وضاحت پیش کی گئی ہے۔ یہ اس لئے نہیں ہوا تھا کہ ہمارے پاس ایسی کوئی وجہ نہیں تھی کہ ہم اپنے کو مجرم سمجھتے۔ یہی وجہ تھی جس کی بنا پر میں اور میرے ساتھی باتوں اور پیروں کو ضبط تحریر میں لانے سے خوفزدہ نہیں ہوئے تھے۔ سخی کہ ایک نام کا مسلمان، استیسا مسلمان ہے کہ وہ یہ جانتا ہے کہ آدمی فانی ہوتا ہے۔ ہمارے ارادے باوقار تھے۔ ہم کوئی غلط کام نہیں کر رہے تھے کہ اس غلطی کو چھپاتے۔

مزید برآں قرطاس ایض میں ایسا مواد موجود ہے جو یہ ثابت کرتا ہے کہ بد عنوانی اور دھاندلی کا ارتکاب نہیں ہوا تھا۔

(۱) انکوائری کمیٹی کے سامنے پیش ہو کر شمال مغربی سرحد کی صوبے کے سلیک چیف سیکرٹری سید منیر حسین نے دوسری باتوں کے علاوہ جو بیان دیا وہ صفحہ ۱۸۳ پر دیا گیا ہے۔

”صحیح ہے کہ فروری ۱۹۷۷ء کے وسط کے لگ بھگ راولپنڈی میں ایک میٹنگ طلب کی گئی تھی۔ جس کی صدارت سابقہ وزیر اعظم نے کی تھی۔ بعض وفاقی وزراء کے علاوہ اس میں چاروں وزرائے اعلیٰ، چاروں چیف صوبائی سیکرٹریوں اور وزیر اعظم کے سٹاف کے کچھ ارکان نے شرکت کی تھی۔ آئی جی حضرات نے بھی اس میں شرکت کی لیکن انہیں بہت بعد میں بلوایا گیا۔ وہ موضوعات جو زیر غور آنے ان میں پارٹی کے امیدواروں کی کالیابی کے امکانات کے اندازے تھے، جو ہونے والے انتخابات میں حصہ لے رہے تھے اور امن و امان کی مجموعی صورت حال اور اس کی بہتری کا معاملہ زیر غور آیا۔ صوبہ سرحد کے وزیر اعلیٰ نے یہ تجویز اور اندازہ پیش کیا کہ صوبے کی کل ۳۶ قومی اسمبلی کی نشستوں میں سے پارٹی ۱۵/۱۶ نشستیں حاصل کر سکے گی۔ جب مجھے رائے دینے کے لئے کہا گیا تو میں نے یہ نقطہ نظر پیش کیا کہ یہ اعداد و شمار جانیت پر مبنی ہیں۔ اور پارٹی اتنی نشستیں حاصل کرنے کے قابل نہیں ہے۔ اس کے بعد میں اس کا شفرنس سے چلا آیا کیونکہ اب دوسرے صوبوں کی باری تھی۔“

اگر میری حکومت بد عنوانی کرنا چاہتی تو پھر صوبے کا چیف سیکرٹری ایسے خیالات کا اظہار نہ کرتا۔ وہ خاموش بیٹھا دور سے مسکراتا رہتا۔ لیکن اس نے اپنی رائے کا اس طرح سے اظہار کیا کیونکہ اسے ایسی کوئی ہدایت نہیں دی گئی تھی کہ وہ بد عنوانی میں شامل ہو۔

(ب) صفحات ۱۹۵ اور ۱۹۷ پر میرا وہ نوٹ نقل کیا ہے جو میں نے کوئٹہ سے ۵ اپریل ۱۹۷۶ کو تحریر کیا تھا۔ اس نوٹ سے یہ تاثر دینے کی کوشش کی گئی ہے کہ اس طرح ”مسٹر بھٹو کی

سوچ رکھتا تھا۔ لیکن۔۔۔ قرطاس ایٹش کے مصنف کو پکڑنے کے وہ ایک دیانت دارانہ نتیجے تک آسکے!

(ج) صفحہ ۱۹۷ پر ہی بتایا گیا ہے ”جب مسٹر اور شہد خان نے ۲۶ اکتوبر ۱۹۷۶ کو وزیراعظم کے سامنے یہ تجویز پیش کی کہ انٹیلی جینس بیورو سے یہ کہا جائے کہ پیپلز پارٹی کے پسندیدہ امیدواروں سے متعلق مسائل پر ہر حلقہ انتخاب پر توجہ دے۔ تاکہ پارٹی کے نقطہ نظر کے حوالے سے بہترین امیدواروں کا انتخاب ہو سکے اور وقت اور روپے کی بچت کی جا سکے۔ مسٹر بھٹو نے مندرجہ ذیل انتکامات جاری کئے۔ ”میں اپنی تجویز سے رضامند ہوں۔ یہ اس حد تک ہی محدود ہونی چاہئے جو کچھ کہ آخری پیرا اضافہ میں بیان کیا گیا ہے۔“

اگر ہمارے دماغ میں یہ بدعنوانی اور دھاندلی کا خیال ہوتا تو ہم انتخابات میں مقابلہ کرنے والے موزوں ترین امیدواروں کے لئے ایسی زبردست تلاش نہ کرتے۔ ہم بہترین کا چناؤ نہ کرتے بلکہ انتہائی اطاعت گزاروں کو چنتے۔ جہاں تک اس معاملے میں انٹیلی جینس بیورو کے تعاون اور کارگزاری کا تعلق ہے تو میں اس کا جداگانہ جواب دے چکا ہوں کہ کس طرح ماضی اور حال میں انٹیلی جینس ایجنسیوں کی کیا حیثیت رہی ہے۔

(د) ہماری یہ فکر مندی کہ موزوں ترین امیدواروں کو تلاش کیا جائے جو منصفانہ انتخابات میں صاف ستھرا مقابلہ کر سکیں اس کا اظہار قرطاس ایٹش کے صفحہ ۲۰۵ پر بھی ہوا ہے۔ ”آپریشن وکٹری“ کے تحت پاکستان پیپلز پارٹی کے لئے موزوں متوقع امیدواروں کے لئے تمام مواد جمع کیا گیا۔ تاکہ ان کی موزونیت کا جائزہ لے کر انتخابات میں انہیں نکل دیا جاسکے۔“

(ر) قرطاس ایٹش صفحہ ۲۰۵ پر مزید بتاتا ہے ”انٹیلی جینس ایجنسیوں نے ”انتخابی اندازے“ کے کام کو انتخابات کے آغاز سے پہلے تک جاری رکھا۔ ضمیمہ جات ۱۸۷ اور ۲۰۰ ان کورنگ نوٹس کی نقول ہیں جو بالترتیب ۱۹ فروری اور ۳ مارچ ۱۹۷۷ کو تفصیلی جائزہ رپورٹیں جو ہر حلقہ انتخاب کا احاطہ کرتی تھیں۔ اس وقت کے وزیراعظم کو ڈائریکٹر انٹیلی جینس بیورو کی طرف سے روانہ کی گئیں۔ ان اندازوں اور تخمینوں کا ایک خلاصہ بھی منسلک تھا جو ضمیمہ جات نمبر ۱۸۷ اور ۲۰۰ میں دیکھا جاسکتا ہے۔

تسلسل کے ساتھ جاری رہنے والی یہ کوششیں ایسی صورت میں کوئی ضرورت نہ رکھتی تھیں اگر ہماری پالیسی بدعنوانی کرنے کی ہوتی۔ قرطاس ایٹش کے صفحات ۲۰۵، ۲۰۶، ۲۰۷ اور

۲۰۸ یہ نشاندہی کرتے ہیں کہ مقابلہ دیانتدارانہ اندازوں اور تخمینوں پر مشتمل تھا اور ایسے ہی اندازے پیش اور حاصل کئے گئے۔ اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ بدعنوانی کا کوئی خیال نہ تو حکمران پارٹی کے دماغ میں تھا اور نہ ہی انتظامیہ کے ذہن میں۔

(س) دسواں باب بعنوان ”مابعد“ قرطاس ایٹش کے صفحہ ۲۸۲ پر اپنے ہی الفاظ میں یہ نتیجہ نکالتا ہے کہ بدعنوانی میرا جرم نہیں تھا اور نہ ہی یہ میری پالیسی تھی۔ یہ کوئی معاملہ نہیں کہ کیا کوئی مینٹگ منعقد ہونی تھی اور اس مینٹگ میں کیا کہا گیا تھا۔ اور اگر انعقاد ہوا، تو پھر بدعنوانی کی پالیسی پر میری حکومت داؤں پر لگی تھی۔ یہ وہ حقیقت ہے جس کی رپورٹ قرطاس ایٹش پیش کرتا ہے۔

”مارچ کو پیپلز پارٹی کی پولنگ پر واضح اور قطعی کالیسیاں نے اس کے حریفوں اور عوام کے ایک بڑے حصے کو ششدر کر دیا۔ حتیٰ کہ مسٹر بھٹو کا اپنا رد عمل بھی تعجب کے ایک عنصر کے بغیر نہیں تھا۔ انہوں نے مرعوب کر دینے والی مشینری کو منظم کر کے اپنی تحویل میں لیا تھا تاکہ واضح فتح حاصل کی جاسکے۔ جو پچھ انہوں نے حاصل کیا وہ اس سے بھی کہیں زیادہ بڑا اور شاندار تھا۔ جو کہ وہ نتائج کے حوالے سے دیکھ سکتے تھے۔ اپوزیشن نے ۱۰ مارچ کے صوبائی انتخابات کا کامیاب بائیکاٹ کر کے، شک کے سامنے کو تاریک کر دیا۔ تین دنوں کے بعد مسٹر بھٹو نے ایک اعلیٰ سطحی کانفرنس سے خطاب کیا جس کا انعقاد پرائم منسٹر ہاؤس میں ہوا اور جس میں دوسروں کے علاوہ تمام ڈیڑنل کمشنروں نے شرکت کی تھی۔ جہاں، موجودہ انتظامیہ کی تحقیقات کے نتیجے میں سامنے آنے والے حقائق کے مطابق، انہوں نے اپنے خطاب کا آغاز اس پریشان کن انداز سے کیا ”تم نے یہ میرے لئے کیوں کیا؟“ جس کا مطلب یہ ہے کہ سول انتظامیہ نے اپنے باجیوں کو بہت زیادہ کھیدا تھا۔“

اگر میں اس جرم کا سرخیل ہوتا تو میں اپنے خطاب کا آغاز اس پریشان کن انداز سے ان الفاظ میں نہ کرتا۔ ”تم نے میرے لئے یہ کیوں کیا؟“ تمام شبہات سے ماوراء، یہ ثبوت ہے کہ اگر بدعنوانی ہوتی تھی تو پھر انفرادی سطح پر ہوتی تھی اور اس سطح پر بدعنوانی کی عداری کرنے پر میں پریشان ہوا تھا۔ میں محسوس کرتا تھا کہ ان کی خود غرضی اور ضعف البصری اس مرعوب کرنے والی مشینری پر ایک وجہ تھی۔ میں نے منصفانہ اور غیر جانبدارانہ انتخابات کے لئے تنظیم کی تھی۔ ان کی انفرادی طاقتوں کے میری انتہائی کاوشوں کو واغدار کر دیا تھا۔ یہ واحد نتیجہ ہے جو اس سے اخذ کیا جاسکتا ہے۔ قرطاس ایٹش کے اس پیرا گراف سے اگر کوئی بریت اور

بے خطا ہونے کا دعویٰ کر سکتا ہے تو وہ ذوالفقار علی بھٹو ہے۔

قرطاس اینٹض، تعارف کے صفحے (iii) پر میری اس تقریر کا حوالہ دیتے ہوئے جو میں نے عام انتخابات کا اعلان کرتے ہوئے، جنوری ۱۹۷۷ء کو کی تھی، مجھے بدفہم ملتا ہے۔ میں نے اس تقریر میں کہا تھا ”مجھے امید ہے کہ ہونے والے انتخابات صاف ستھرے اور منصفانہ انتخابات ہوں گے۔ لیکن صرف میرا وعدہ کافی نہیں ہے۔ دوسری پارٹیوں کو بھی اپنے ایسے ہی ارادوں اور پالیسی کا اظہار کرنا چاہئے۔ دوسری جانب کو بھی لازمی طور پر یہ مظاہرہ کرنا چاہئے کہ وہ جاستے ہیں کہ صاف ستھرے اور منصفانہ انتخابات کا کیا مفہوم ہوتا ہے۔ میں اپ کو یقین دلاتا ہوں کہ ہم انتظامی اہلیت کے حامل ہیں کہ صاف ستھرے اور منصفانہ انتخابات کا انعقاد کرا سکیں۔“

میری تقریر کے اس حصے کو دہرانے کے بعد، قرطاس اینٹض یہ سوال اٹھاتا ہے ”انتخابات کئے صاف ستھرے اور منصفانہ تھے؟“ مسٹر زید اے بھٹو کے ان الفاظ کے پہلی معنی کیا ہیں؟ جبکہ یہ الفاظ پوری سنجیدگی اور ایمانداری سے میں نے قومی اسمبلی کے سامنے جنوری ۱۹۷۷ء کو دہرائے تھے۔ بعد میں آنے والے تنقحات میں اس سازشی اور پوشیدہ سوال کا جواب موجود ہے۔

عجیب بات یہ ہے کہ خود قرطاس اینٹض میرے ارادوں کی راستی کو تسلیم کرتا ہے۔ اس میں ایک نوٹ نقل کیا گیا ہے۔ جو فارشید نے پیش کیا اور میں نے اس کی تائید کی تھی۔ یہ نوٹ یوں ہے ”پنجاب میں امیدواروں کی اکثریت اس تاثر کے تحت ہے کہ چونکہ انہیں پی پی پی کا ٹکٹ دیدیا گیا ہے۔ اس لئے یہ انتظامیہ کا کام ہے کہ وہ اس سلسلے میں کام کرے۔ امیدواروں کو اس تاثر سے سمجھو کر ٹکٹا چاہیئے۔“

اس امر کی ایک اور تصدیق، میری ہدایات کے متعلق اس خط میں ملتی ہے جو گورنر عباسی نے مجھے لکھا تھا۔ اس میں کہا گیا ہے، ”میں نے ملتان ڈویژن کے محکموں کے سربراہوں کی ایک میٹنگ بلوائی تھی اور اس میں ان پر یہ واضح کر دیا گیا کہ وہ اور ان کے ماتحت شاف سے یہ سو فیصدی توجہ کی جاتی ہے کہ وہ وزیراعظم کے ہدایت نامہ پر عمل کریں گے اور وہ انتخابات میں سو فیصدی غیر جانبدار رہ کر، ہر چیز سے ماوراء ہو کر انتخابات کا منصفانہ انعقاد کرائیں گے۔“

میں اس سے پہلے انتخابات کے انعقاد کے بارے میں جنرل ضیاء کے رہا کس کا حوالہ دے چکا ہوں۔ جو حکومت کا تختہ الٹنے کے فوراً بعد اس نے دئے تھے۔ میں اس پر پھر اصرار

کروں گا کہ اس نے کہا تھا ”فوج کے پاس یہ ثبوت موجود ہے کہ مسٹر بھٹو بد عنوانی کے ذمے دار نہیں تھے۔“

بد عنوانی کا الزام لگا کر قطعی طور پر مجھے استقام کا نشانہ بنایا جا رہا ہے۔ میں نے جب حزب اختلاف سے بات چیت کی تو بہتر تعلقات پر قومی اسمبلی میں پرزور انداز سے اصرار کر چکا تھا۔ یہ وہ اہم امور ہیں جن سے قرطاس اینٹض نے جان بوجھ کر پہلو تہی کی ہے۔ ہم نے انتخابات میں صاف ستھرے انداز میں مقابلہ کیا جیسے کہ سویز کے مشرق میں منصفانہ انتخابات ہو سکتے ہیں۔

میرے پاس ایسی کئی وجوہات ہیں جن کی بنا پر منصفانہ انتخابات ضروری تھے۔ اور میں اس کا اعتراف کرتا ہوں وہ تمام وجوہات ایثار پر مبنی نہیں تھیں۔ اور میں یہ جانتا ہوں:

- (۱) اپوزیشن دھڑوں میں تقسیم اور نااہل تھی۔
- (ب) میری حکومت کی کامیابیوں کا کارڈ شاندار تھا۔
- (ج) عوام میرے اور میری پارٹی کے ساتھ تھے۔ بالخصوص آبادی کا اسی فیصدی دیہاتی حصہ۔

(د) میں پاکستان کی تاریخ کو ایک بے مثال موڑ دے کر، بہتر اور سول برتری دینا چاہتا تھا۔ (ر) میں تاریخ میں اپنے آپ کو ”انتخابات میں بد عنوانی کرنے والا“ کی حیثیت سے زندہ رکھنا نہیں چاہتا تھا اور نہ ہی ”انتخابات میں سازباز“ کرنے والے کی حیثیت دینا چاہتا تھا، جیسے کہ میرے پیشتر پیشرو تھے۔

(س) اور ان سب سے بڑھ کر اور اہم خصوصیت رکھنے والا سبب یہ تھا کہ میں اقتدار کے بھوکے جرنیلوں کے لئے تو معمولی ترین موقع فراہم کرنا نہیں چاہتا تھا، تاکہ وہ مداخلت کر کے اس نامکمل کام کی تکمیل کر سکیں جو ان کے بے وقعت پیشرو سنجی خان نے شروع کیا تھا۔ میرا یہ طویل خوف محفوظ اور محتاط زبان میں بیان ہوا ہے اور مارشل لا کے صفحہ ۳۹۰ پر مٹی اس کا ذکر موجود ہے۔

”وزیراعظم نے اس سلسلے میں اطمینان و مسرت کا اظہار کیا۔ ایک روز پہلے ہونے والی میٹنگ میں یہ محسوس کیا گیا تھا کہ کسی قسم کی رعایت پی این اے کو نہیں دی گئی۔ اور ان سے کہا گیا کہ جو جس مجھوتے تک پہنچ گیا ہے وہ اس کے پابند رہیں۔ ڈیڈ لاک کے نتائج پر غور و فکر کیا گیا۔ اہم ترین مسائل تھے جیسے، ملک کا امیج، استحکام، اور اس کا مستقبل۔ اگر اس مجھوتے پر عمل نہ ہوا تو پی این اے احتجاج کا سلسلہ شروع کر دے گی اور یہ بھی فرض کیا گیا کہ اگر احتجاج پر کنٹرول کر لیا گیا اور امن و امان بحال کر دیئے

(۷)

انتخابات میں بد عنوانی یا منصفانہ رویہ

اس سے قطع نظر کہ یہ ثابت کرنے میں مکمل ناکامی ہوئی کہ میری حکومت نے انتخابات میں بد عنوانی کی تھی اور یہ کہ میری حیثیت کو نقصان پہنچانے میں پوری آزادی کے باوجود یہ تماشائی بھی خوب ہے کہ ۳۲۲ ریاستی دستاویزات مارکیٹ میں پھینک کر قانون کے ساتھ دھوکہ بازی کی گئی۔ کیونکہ سرکاری دستاویزات کو خفیہ رکھا جاتا ہے۔ میں نے ایک بھی سرکاری دستاویز کو لوگوں کے سامنے اس وقت تک نہیں رکھا جب تک کہ طے شدہ چینلز پر عمل نہ کر لیا ہو۔ اس کی ایک مثال دیتا ہوں کہ جب میں وزیراعظم کی حیثیت سے خارجہ پالیسی کے حوالے سے ”دوطرفہ تعلقات“ پر لکھ رہا تھا، تو میرے خصوصی معاون نے ایک سرکاری خط ۱۴ اکتوبر ۱۹۷۶ کو سیکرٹری وزارت خارجہ کے نام بھیجا۔ جس میں یہ درخواست کی گئی تھی کہ وزارت خارجہ، وزیراعظم پاکستان کو وزارت خارجہ کی بعض دستاویزات کی اشاعت کی اجازت دیدے۔ ۲۳ اکتوبر ۱۹۷۶ کو وزارت خارجہ کے سیکرٹری نے جواب دیا اور اس میں لکھا کہ وہ ان دستاویزات کی اشاعت کی اجازت دیتے ہیں۔ جن کا ذکر منسلک فہرست میں دیا گیا ہے۔

قلمی ایض میں کئی بار ”باوقار نشستوں“ کا ذکر آیا ہے۔ اس حوالے کو بار بار دہرانے کا قصہ نسخہ ۳۴ پر سامنے آتا ہے۔ مسٹر یحییٰ بختیار کے بیس پر بات کرتے ہوئے کہا گیا ہے ”باوقار نشستوں“ کے خفیہ اشارے کو کھولا جائے تو اس کا مقہوم یہ ہے کہ یہ نشستیں ہر قیمت پر جیتی ہیں۔ یقیناً اس راز اور کوڑے کے معنی موجودہ مارشل لا حکام کا انکشاف ہے۔ کیونکہ کسی دوسرے کے نہ تو اسے ذرائع ہو سکتے ہیں اور نہ ایسی زیر دست قوت متیہ کہ ایسی دریافت کر سکے۔ ”باوقار نشستیں“ کے الفاظ تو انتخابات میں عام طور پر استعمال ہوتے ہیں۔

ہر بار جب موجودہ حکومتی گولہ مارچ ۱۹۷۷ کے انتخابات کا گھیراؤ کرتا ہے تو کمشنر ہزارہ ڈویژن کا نام ضرور لیا جاتا ہے۔ اس کا حوالہ ”پرسنلٹی کلٹ“ کے باب میں صفحہ ۶۵ اور ۶۶

گئے تو کسی مرحلے پر مضافاتی مذاکرات دوبارہ شروع کئے جاسکتے ہیں۔ تاہم محض امن و امان کی بحالی اور کنٹرول سے ہی مسئلہ حل نہ ہو گا۔ ایک دوسرا اہم عنصر یہ تھا اگرچہ مسلح افواج حکومت کے ساتھ کڑی ہیں لیکن اگر دوسرا احتجاج ہوا تو شدید تردد من متناؤ میں آ سکتی ہیں۔

ان خیالات کا اظہار کابینہ کی ایک میٹنگ میں کیا گیا۔ مجھ سے یہ توقع نہیں کی جاسکتی تھی کہ میں اپنے وزیروں کو یہ بتاتا کہ ان میں موجود بعض ہوس پرست احمقوں نے دوسرے ہوس پرست بزرگ خود اپنے بارے میں چاکلیٹ سیریز کی رائے رکھنے والوں کے لئے دروازے کھول دئے ہیں کہ وہ اقتدار پر قبضہ کر کے ایک باز لطیفی نڈ فین کر سکیں!

”بدعنوانی“ کے باب میں صفحات ۲۳۵ سے ۲۳۹ تک، اور پھر صفحات ۲۵۳ سے ۲۵۷ تک ملتا ہے۔ محسوس ہوتا ہے کہ وہ خاص پسندیدہ فرد ہے۔ سپریم کورٹ میں سیکم نصرت بھٹو کی آئینی درخواست کی سماعت کے وقت بھی اس کا کام حوالہ بنا۔ میں نے جواب دعویٰ کے طور پر شامل کئے جانے والے اپنے بیان حلفی میں اس کے ”مادہ پو لوے بحری سفر“ کا جواب دیا تھا۔ ہزارہ ڈویژن کے کمشنر کی رپورٹ مورخہ ۲۱ ستمبر ۱۹۷۷ء تصدیقات سے بھری ہوئی ہے اور قانون کے نزدیک اس کی کوئی اہمیت نہیں۔ یہ ایسی ناقص رپورٹ ہے کہ خود کمشنر نے اس رپورٹ کے پہلے صفحے پر تسلیم کیا ہے کہ ”چونکہ ایک طویل عرصہ گزر چکا ہے، اس لئے یہ ممکن نہیں کہ صحیح طور پر ٹھیک ٹھیک کی نشاندہی کی جاسکے کہ بروی آئی پی فرودے افسروں کو کرنے کے لئے کیا کہا تھا۔“ کمشنر کا دعویٰ ہے کہ وہ مہذب انسان ہے۔ قانون کا احترام کرتا ہے اور ایک صاحب ضمیر انسان ہے۔ اگر اس میں ان خوبیوں میں سے کوئی ایک خوبی بھی ہوتی تو اس کا یہ فرض تھا کہ وہ تحریری رپورٹ اپنے صوبائی وزیر اعلیٰ کے سامنے پیش کرتا اور اس میں پیشگی کی تفصیلات بیان کر کے اپنی یوزیشن واضح کر لیتا۔ کمشنر نے اتنے دنوں اور مہینوں تک اپنے وزیر اعلیٰ کو تارکی میں کیوں رکھا؟ اور وہ ان انکشافات کے ساتھ ۲۱ ستمبر ۱۹۷۷ء کو ہی سامنے کیوں آیا جبکہ اس کا فریضہ تھا کہ وہ اپنے صوبائی چیف ایگزیکٹو کو ۵ مارچ ۱۹۷۷ء کو یہ رپورٹ پیش کرتا؟ یہ تمام مہینے اس نے اپنے ضمیر کی جبین کو محسوس کرتے انتظار میں گزار دیے۔ لیکن اس کی رپورٹ کی کوئی اہمیت اور قیمت نہیں اور کوئی بھی ایسا ثبوت پیش نہیں کرتی جسے قانونی اصطلاح میں قانونی ثبوت کہا جاسکے۔ اس میں بیان کیا گیا ہے کہ سرکاری افسروں نے سیاسی صورت حال پر بحث کی۔ سیاسی صورت حال پر تبادلہ خیالات کرنے میں کیا نقصان تھا؟ مارچ میں سیاسی صورت حال فزوں تر ہوئی اور اس موضوع پر ہر طرف بات چیت جو رہی تھی۔ اس تحریک شدہ رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ افسروں نے میری قیادت کے بارے میں اندازے پیش کئے۔ ایسے اندازے لگانے میں کسی قسم کی کوئی خرابی نہیں ہے۔ جبکہ حقیقت یہ ہے کہ انہوں نے میری جو قدر و قیمت متعین کی اس قدر و قیمت اور اندازے سے زبردست یکسانیت رکھتی ہے جو چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر نے میری قیادت اور پاکستان کے لئے ناگزیر قرار دی تھی۔ ان دنوں میں جب میں وزیر اعظم تھا اور اس کے بعد بھی تہران کے اخبار کہیاں انٹرنیشنل“ تک میں۔

اگر سرکاری افسروں میں کوئی انتخابات کے نتائج کے بارے میں پیشگوئی کرتا ہے تو اس سے ان پر کسی جرم کے الزام کا بوجھ نہیں پڑتا۔ ان دنوں ہر شخص ایسی پیشگوئیاں کر رہا

تھا۔ جن میں چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر بھی شامل تھا۔ اگر میں اصغر خاں اور گوہر ایوب کی شکست کے بارے میں ایسے شدید محسوسات رکھتا تھا کہ میں نے اپنے اعلیٰ افسروں کو اس لئے ایسٹ آباد بھیجا کہ انہیں یقین دلادیں کہ ”وہ کسی طرح بھی اپنے نشستوں پر کامیاب نہیں ہو سکتے۔“ تو پھر وہ دونوں کس طرح سے منتخب ہو گئے۔ اگر میں انتخابات میں بڑے پیمانے پر، بلکہ قومی سطح پر بدعنوانی کے لئے حربے اختیار کر سکتا تھا تو پھر یہ کیسے ہوا کہ ملک کے ایک دور اقتادہ حصے میں ضروری اور مطلوبہ نتائج حاصل نہ کر سکا؟ اور خاص طور پر اس صورت میں جبکہ میں نے اپنے ملٹری سیکرٹری اور سیاسی مشیر کو یہ ذمہ داری سونپی کہ وہ سیدھے ایسٹ آباد آ کر اصغر خاں اور گوہر ایوب کو ان کی ناکامی کی ضمانت دیدیں کہ وہ کسی طرح بھی کامیاب نہیں ہو سکتے۔“ اس کے علاوہ اگر میرے سرکاری افسر صوبہ سرحد اور ہزارہ ڈویژن میں انتخابات میں بدعنوانی کے لئے خصوصی ہدایت لے کر گئے تھے تو پھر ان کے لئے یہ ممکن نہیں تھا کہ وہ میرے احکام کو انسی آسانی سے منظر انداز کر دیتے اور ہزارہ کے کمشنر سے اسی لئے متفق ہو جاتے جب اس نے کچھ بے ہودہ اعتراضات کئے تھے۔ میں ایک پسندیدہ شخص کی گھڑی ہوئی کہانی پر اب مزید وقت ضائع کرنے کا ارادہ نہیں رکھتا۔

ایک پورا باب جو مسٹر یحییٰ بختیار کے لئے وقف کیا گیا اس کے علاوہ ساتویں باب کا ایک حصہ جو صفحات ۲۳۵ سے ۲۵۲ پر محیط ہے، اور انفرادی کیسوں کے بارے میں ہے، جیسے کہ آنجواں باب ہے۔ موت کی اس کوٹھی میں مجھے وہ سہولتیں حاصل نہیں کہ میں ہر ایک انفرادی کیس سے نمٹ سکوں۔ افراد نے اپنی انفرادی حیثیتوں میں جو بدعنوانیاں کیں، ان سے میرا کوئی تعلق ہے اور نہ ہی میں اس میں ملوث ہوں۔ یہ بدعنوانیاں میری کی ہوئی نہیں ہیں، الیکشن کے قوانین اور الیکشن سروسٹنز متاثرہ اور مجروح فریقین کے لئے اندمال فراہم کرتے ہیں۔ رشتہ دائر کرنے کی سہولت بھی انہیں حاصل ہے۔ اس کے علاوہ میں نے اچھی نیت کے الیکشن کمیشن کو ایسے اقتدارات سے مسلح کیا تھا کہ وہ ایسی شکایات کا فیصلہ خود کر سکتا تھا۔ ان غیر معمولی اقتدارات کو کیوں واپس لیا گیا۔ اس کی وجوہات بیان کی جا چکی ہیں۔ بہر حال اپنی اخلاقی ذمہ داری کو پورا کرنے کے لئے بے ترتیبی سے سہی میں چند انفرادی کیسوں پر بات کروں گا۔ ان میں یہ کیس شامل ہیں۔

- (۱) مسٹر یحییٰ بختیار، انٹرنی جرنل پاکستان۔
- (ب) مسٹر ممتاز علی بختو، لاڈکانہ ضلع بے وفائی وزیر۔
- (ج) مسٹر غیبی خان احمد سلطان چانڈیو، ضلع لاڈکانہ۔

(د) مسٹر ذوالفقار علی بھٹو، وزیر اعظم پاکستان -

غیبی خان اور ممتاز علی بھٹو کو اس حوالے سے یہ اعزاز نہیں دیا گیا جو ذیلی عنوان ”بلامقابلہ انتخابات“ میں آتے ہیں۔ اس سلسلے میں اس سادگی کو اپنی جگہ نظر رکھنے کی ضرورت ہے کہ کم از کم یہ دو ایسے کیس ہیں جن کے بارے میں موجودہ حکومتی ٹولے نے یہ عنایت کی ہے کہ یہ دونوں بلا مقابلہ، کسی بد عنوانی کے بغیر منتخب ہو گئے تھے۔ یہ ایک تباہ کن صورت ہوئی کہ موجودہ مارشل لا حکام کو سچائی کے ساتھ کسی قسم کی وفاداری اور وابستگی کا اعزاز دیا جائے۔ شاید میں وہ حوالہ بھول گیا ہوں۔ ایک دوسرے متن میں، غیبی خان چاندیو کو بھی نہیں بخشا گیا۔ مزید برآں، چونکہ ممتاز علی بھٹو اور غیبی خان چاندیو کا تعلق ایک دہائی قبل اور انقلابی منصوبے سے ہے اور وہ بلا مقابلہ کامیاب ہوئے تھے۔ اس لئے میں ان کے کیسوں پر بات کروں گا۔ ان چار کیسوں کو پیشے ہوئے میں اس عدم مساوات اور بے تدبیری کے بارے میں کوئی عناد نہیں رکھتا جو قرطاس ایض کے صفحات میں پکسی ہوئی ہیں۔ ان میں سے بہت سی باتوں کامیں پر وہ چکر چکا ہوں۔

قرطاس ایض یہ ثابت کرنے میں ناکام رہا ہے کہ میری حکومت یا میں بطور وزیر اعظم پاکستان مارچ ۱۹۷۷ء کے انتخابات میں کسی قسم کی بد عنوانی اور دھاندلی میں ملوث ہوئے ہیں۔ اس میں ایسی کوئی شہادت پیش نہیں ہوئی جس سے میں ذاتی طور پر بد عنوانی کرنے کے احکامات جاری کرنے یا انتخابات میں بد عنوانی کرنے میں ملوث ہوا ہوں۔

چیف الیکشن کمشنر مسٹر سجاد احمد جان کی شہادت نہیں لی گئی۔ اگرچہ وہ اس سلسلے میں کلیدی اور ناگزیر گواہ تھے۔ ان کے بارے میں جتنے حوالے دیئے گئے وہ سیکرٹری الیکشن کمیشن مسٹر زیڈ اے فاروقی نے ”سنی سنائی“ باتوں پر دیئے ہیں۔ جنہوں نے نامعلوم وجوہات کی بنا پر جھوٹی اور معاندانہ گواہی دی ہے۔ مسٹر فاروقی، لیکن اسے فاروقی کے جھنجھٹے ہیں جن کی بیوی مسعود محمود کی بیوی کی بہن ہے۔ جو کہ لاہور میں مقدمہ قتل میں بڑا اور بنیادی وعدہ معاف گواہ ہے۔

وائٹ پیپر اپنے تضادات خود پیش کرتا ہے۔ یہ خود ساختہ شہادتوں اور مستند جھوٹوں سے بھرا ہوا ہے۔ جو ایک سیاسی خود کشی ہے۔ تمام دستاویزات جنہیں استعمال کیا گیا، انتہائی حد تک منتخب ہیں اور انہیں کثرتِ صوت کر کے سی کر الزامات کے مطابق تیار کیا گیا ہے۔ یہ قسمت کی ایک عجیب چال ہے کہ قرطاس ایض مجھے ہر الزام سے بری بھی قرار دیتا ہے اور میری حیثیت کا استحکام بھی لیتا ہے۔

پنجاب، بلوچستان، اور صوبہ سرحد کے چیف سیکرٹریوں نے اپنے بیانات میں مجھے بد عنوانی سے بری الزمہ قرار دیا۔ بعض بیانات دوسروں سے زیادہ مثبت ہیں، لیکن یہ تینوں چیف سیکرٹری میری حمایت میں ہیں۔ جبکہ کسی چیف سیکرٹری کی شراکت اور اسے پھنساؤ بغیر صوبائی سطح پر انتخابات میں بد عنوانی ہو ہی نہیں سکتی۔ چوتھے اور سندھ کے چیف سیکرٹری کا اس میں کوئی نام اور حوالہ نہیں ملتا۔ اس کا بیان اس لئے خارج کر دیا گیا ہے کہ پی این اے نے وسیع پیمانے پر منظم تشدد کے ساتھ صوبہ سندھ میں جو بد عنوانیاں کیں ان پر الزام لگایا گیا ہے۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ اس حاسدانہ دستاویز میں پی این اے کی بد عنوانیوں کا کوئی اندراج نہیں ملتا۔

ڈی آئی بی/آئی ایس آئی نے مورخہ ۴ مارچ ۱۹۷۷ء کی مشترکہ رپورٹ میں مجھے بد عنوانی سے بری الزمہ قرار دیا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ مسلح افواج نے ایک ادارے کی حیثیت سے مجھے اس میں نہیں پھنسا یا۔ مزید برآں چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر کے متعدد سرکاری بیانات جو اس نے حکومت کا تختہ الٹنے کے بعد دیئے۔ ان میں بھی مجھے ہر قسم کی دھاندلی اور بد عنوانی سے بری الزمہ قرار دیا گیا۔ لیکن ان حوالوں کا اندراج بھی قرطاس ایض میں نہیں ملتا۔

پنجاب کے کمشنروں کے بیانات، جنہیں بطور خاص غیر مبہم الفاظ میں میں نے لاہور میں ۳ مارچ ۱۹۷۷ء کو حکم دیا تھا کہ وہ بد عنوانی اور دھاندلی کی کسی طرح بھی اجازت نہ دے۔ اس کا قرطاس ایض میں سرے سے ذکر موجود نہیں ہے۔ نہ ہی انسپکٹر جنرل آف پولیس اور اسی طرح کے کلیدی افسروں جیسے سیکرٹری داخلہ کا ذکر ہی موجود نہیں۔ سیکرٹری داخلہ سندھ اور میرٹھ سیکرٹری افضل سعید کے بیانات اس وقت لئے گئے جب وہ مارشل لا کے گلیڈیئرز کی حراست و نظربندی میں تھے۔ میرا خیال ہے کہ سیکرٹری داخلہ سندھ اب بھی نظر بند ہیں۔ اور مسٹر افضل سعید کی نظربندی ختم کر کے اسے گھر میں زیر حراست رکھا گیا ہے۔

قرطاس ایض، ایک ایک طرف، جعلی اور جھوٹی اور گھڑی ہوئی مرتب کردہ دستاویز ہے جسے ۲۵ جولائی ۱۹۷۸ء کو جاری کیا گیا ہے۔ صرف ایک مقصد کے تحت، کہ میرے خلاف عناد اور تعصب کو اس وقت پھیلایا جائے جبکہ موت کی سزا کے خلاف میری اپیل کی سماعت سپریم کورٹ آف پاکستان میں ہو رہی ہے۔

میں ابھی ان وضاحتی معروضات کو ساتویں باب بعنوان ”سٹرینجی“ کے آخری پیرا گراف پر ختم کرتا ہوں۔ اس میں مسٹر وقار احمد کے بیان سے حوالہ دیا گیا ہے۔ جو میرے سابقہ کیسٹ سیکرٹری تھے اور یہ بیان ان سے ۳ جنوری ۱۹۷۸ء کو لیا گیا۔ یہ قرطاس ایض کے صفحہ

۲۵۱ پر ہے اور یوں بیان کرتا ہے: ”مجھے مسٹر اکرام شیخ نے اطلاع دی کہ انتخابات کے دن اسٹر بھٹو کنٹرول روم میں تھے اور بارہ بجے کے لگ بھگ وہ اشتعال میں آگئے کہ پی پی پی ہار رہی ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ عین اس وقت متعدد ہدایات چیف سیکرٹری پنجاب کو روانہ کی گئی تھیں جن کے نتیجے میں بد عنوانی اور دھاندلی ہوئی تھی۔ اس وقت میں صرف انہی امور کو ہی یاد کر سکا ہوں۔ لیکن میں بعض دوسرے امور پر بھی روشنی ڈالنے کے قابل ہو جاؤں گا۔ اگر وہ میرے نوٹس میں لائے گئے یا میں بعد میں انہیں مجتمع کر سکا۔“

میں اپنی وزیراعظم کی رہائش گاہ سے چلتا ہوا اس مشہور کنٹرول روم جو میرے سیکرٹریٹ میں تھا، میں اپنے فضائیہ کے اسے ڈی۔ سی خالد ہارون کے ہمراہ ۱۹۷۷ء کو سائرس چار جے سر پر کے لگ بھگ گیا۔

رفیغ رضا اور جنرل مٹھان نصف گھنٹے کے بعد وہاں آئے۔ ہم چائے پر چائے پیتے رہے حتیٰ کہ ٹیلی ویژن پر نتائج آنے لگے۔ نصف شب کے وقت جسے تقریباً بارہ بجے مانا گیا ہے۔ ایسی کوئی سرسری اور معمولی سی وجہ بھی سامنے نہ آئی کہ جس سے میں مشتعل ہو جاتا اور کہتا کہ پی پی پی ہار رہی تھی۔ بارہ بجے تک تو یہ ظاہر ہو چکا تھا کہ پی پی پی ہماری اکثریت کے ساتھ جیت رہی ہے۔ اس کی تصدیق ریڈیو اور ٹیلی ویژن کی ٹیموں، فلموں اور دوسری دستاویزی شہادتوں سے کی جاسکتی ہے۔

اس کے باوجود اگر یہ جھوٹ سچ تھا تو بتائیے کہ چیف سیکرٹری پنجاب نے کس مواصلاتی سیارے کے ذریعے پورے صوبے میں پھیلے ہوئے ریفرنگ افسروں کو یہ ہدایات پہنچائیں کہ وہ آخری لمحے میں نتائج تبدیل کر دیں؟ چیف سیکرٹری پنجاب نے یہ الزام عائد نہیں کیا اور نہ ہی اکرام شیخ نے۔ ایک بار پھر سنی سنائی کے اصول کا اطلاق کیا گیا ہے۔ قرطاس ایضاً کے مرتبین کو ایسے بے ہودہ جھوٹ کی تصدیق کی کوشش کرنی چاہئے تھی۔ بارہ بجے تو پوری دنیا جان گئی تھی کہ پی پی پی نے شاندار جسامت کے ساتھ جیت رہی تھی۔ یہ صرف میں تھا کہ جو اس بات پر مشتعل ہوا کہ پی پی پی ہار رہی ہے۔ یہ پاگل پن کا بارہواں گھنٹہ ہے۔ جھوٹ اس طرح سے گھڑے اور کہے جاتے ہیں کہ جھوٹ پر ایک مقالہ لکھا جائے کہ جھوٹ کس طرح بولنا چاہئے۔ اس سفید جھوٹ پر اپنے اختتامی نوٹ کے بعد، میں ان چار اشفرادی کیسوں کی طرف

لوٹتا ہوں۔

چالیس سے زائد صفحات پر مشتمل ایک پورا باب مسٹر یحییٰ بختیار کے لئے وقف کیا گیا ہے۔ جو سپریم کورٹ میں سزائے موت کے خلاف ایپل میں میرے سینئر وکیل دفاع میں۔

صفحہ ۳۴۱ پر قرطاس ایضاً رقم طراز ہے:

”مسٹر یحییٰ بختیار کا کیس ایک خصوصی کیس ہے صرف اس لئے نہیں کہ یہ ان نشستوں میں سے ایک نشست ہے جو انتہائی مقابلے کی ملک میں نشستیں تھیں، بلکہ اس لئے بھی کہ اس وقت مسٹر یحییٰ بختیار انٹرنی جنرل پاکستان کے عہدے پر فائز تھے۔ اور اپنی اس حیثیت میں وہ قانون کی حکمرانی کے کسٹودین بھی تھے۔“

مسٹر یحییٰ بختیار کا کیس ایک بہت خصوصی کیس ہے۔ اس کے بارے میں دو باتیں نہیں کہی جاسکتی ہیں۔ تاہم اس کے خصوصی کیس ہونے کے بارے میں جو وجوہات قرطاس ایضاً میں دی گئی ہیں۔ وہ ان وجوہات سے قطعی طور پر مختلف ہیں۔

سپریم کورٹ میں میری ایپل کے دوران، جبکہ دو ماہ سے مسلسل مسٹر یحییٰ بختیار، اپنے قدموں پر کھڑے دفاع کے لئے دلائل پیش کر رہے تھے۔ ان سے فیڈرل انویسٹی گیشن ایجنسی کے ایک سرکاری افسر نے ان فوجداری اور عدالتی کارروائی کے بارے میں تحقیقات اور پوچھ گچھ کی، جو انتخابات میں بد عنوانی سے تعلق رکھتی تھیں اور الزام لگایا گیا تھا کہ ان کا ارتکاب مارچ ۱۹۷۸ء میں ہوا تھا۔ بہر حال ان کے خلاف مقدمہ ۲۵ مارچ ۱۹۷۷ء کو اس وقت قائم کیا گیا جب لاہور ہائی کورٹ مجھے موت کی سزا سنائی تھی اور ۱۸ مارچ ۱۹۷۸ء کو انہوں نے دوست مالک سے یہ ایپل کی وہ پاکستان کی موجودہ حکومت پر اپنا اثر و رسوخ استعمال کریں۔ انہیں قبل از گرفتاری کی ضمانت کے لئے درخواست دینی پڑی۔

سنگینوں کے ان چوکوں پر سب سے اہم اور سرفہرست یہ قرطاس ایضاً آتا ہے۔ جس میں آپہنچیں ایک خاص کیس کی حیثیت دے کر علحدہ کیا گیا۔ اس کا مقصد ان کا بیچ تباہ کرنا ہے۔ ان کی کارکردگی اور کردار کو نیست و نابود کرنا ہے اور لوگوں کی نظروں میں انہیں حقیر بنانا ہے۔ اور انہیں یہ بتانا کہ وہ مسعود محمود اور غلام حسین اور دوسروں کو بھول جائیں کیونکہ ”غیرات گھر سے شروع ہوتی ہے۔“ مقصد انہیں ہراساں اور خوفزدہ کرنا ہے۔ انہیں دبانے اور پریشان کرنا ہے۔ اس وقت جبکہ وہ میری ایپل میں دلائل دے رہے ہیں۔ ایک ہی جگہ میں عقاب، ایک پنچے میں موکل اور دوسرے میں اس کے وکیل کو صاف کر دینا چاہتا ہے۔

استقام کی بُو

مسٹر یحییٰ بختیار کو قائد اعظم جانتے تھے۔ میں نہیں سمجھتا کہ قائد اعظم کے دیرینہ ساتھی اس سلسلے میں مجھ سے اختلاف کس کے کہ اگر میں یہ کہوں کہ قائد اعظم مسٹر یحییٰ بختیار کو بہت پسند کرتے تھے۔ مس فاطمہ جناح ان پر اعتماد کرتی تھیں۔ میں انہیں کد نشہ میس برس سے جانتا ہوں لیکن وہ آغاز سے ہی کونسل مسلم لیگ میں رہے۔ اکتوبر ۱۹۷۴ء میں وہ مسلم لیگ چھوڑ کر پاکستان پیپلز پارٹی میں شامل ہوئے۔ جبکہ اس وقت اعلیٰ مسلم لیگ کی باقی چٹکریاں بھی بچھ چکی تھیں۔ وہ پختہ ترمیم اصولوں کے مالک انسان ہیں۔

پاکستان کے انارنی جنرل کی حیثیت سے رضا کارانہ روح کے ساتھ پاکستان کی خدمات انجام دیں اور پارلیمنٹ میں احمدیوں کے حساس ترمیم مسئلے کو پیش کیا۔ انہوں نے بڑی کامیابی سے پاکستان کی عالمی عدالت انصاف میں بھارت کے ساتھ، مشرقی پاکستان جانے والی ناجائز پروازوں اور بھارت میں پاکستانی جنگی قیدیوں کے امور میں غائب کی کی۔ وہ ریاست کی طرف سے نیپ کے ریفرنس اور دوسرے اہم کیسوں میں پیش ہوئے اور اب انہیں ان کی حب الوطنی کی سزا دی جا رہی ہے۔ انہوں نے تین انتہائی مفید اور متاثر کن بیورو سٹس کانفرنسوں کا اہتمام کیا۔ جن میں بعض ممتاز غیر ملکی قانون دانوں نے شرکت کی۔ انہوں نے اپنا اعلیٰ عہدہ راست اور صاف ستھرے ریکارڈ کے ساتھ چھوڑا۔ ان کا برتاؤ کسی کیڑے یا مکڑی کا نہیں تھا۔ وہ قانون کی حکمرانی کے اسی طرح محافظ اور کسٹودین تھے، جس طرح ایک رومن کارڈ بواپنے نظام میں انہوں نے ہمیشہ قانون کی بالادستی کی حفاظت کی۔

وہ پارلیمنٹ میں آتے اور جوابدہ ہوتے تھے۔ وہ اونچی لڑیوں کو استعمال کر کے پنچوں کے بل چلتے۔ کبھی گھنیا سازشوں اور جوڑ توڑ میں شریک اور ملوث نہ ہوئے۔ وہ باوقار آزادی کے ساتھ جمہوریت کے عمومی ڈسپلن کے تحت عمل کرتے تھے۔ ۱۹۷۷ء کے موسم بہار کی گزرتے دنوں میں، انہوں نے اپنی ہی تحریک و منشا پر، یحییٰ بختیار فارمولہ پیش کیا۔ میں نے اسے اچھی نیت کے ساتھ قبول کیا کیونکہ یہ ایک اچھے انسان کی طرف سے ایک اچھی نصیحت تھی۔

مارشل لا کے زمانے میں انارنی جنرل کا دفتر جمہوریت کے پہرے پر ایک تھپڑ کے مترادف ہے۔ قانون کے بغیر ایک نظام میں کسی انارنی جنرل کے لئے کوئی جگہ نہیں ہوتی۔

قرطاس انیض میں یہ سمجھا گیا کہ انارنی جنرل قانون کی حکمرانی کا محافظ ہوتا ہے۔ مارشل لا کے تحت، انارنی جنرل کو سپریم کورٹ کو یہ بتانا ہوتا ہے کہ اس کے آقاؤں نے آئین کو منسوخ یا غصب کر لیا ہے اور تمام قوانین مارشل لا کے تابع ہو چکے ہیں۔ اسے یہ بتانا چاہیے کہ ضرورت کا تقاضا یہ ہے کہ پاکستان کے عوام خنزیر کا گوشت کھائیں۔

دوسری جنگ عظیم کے تقاضے اور ضرورت کے تحت برطانوی عوام مچھلی اور چپس پر گزر اوقات کرتے رہے لیکن پارلیمنٹ بند نہ کئی گئی۔ وی ۲ طیاروں کی کانوں کو پھاڑ دینے والی آوازوں سے لندن ملے کا ڈھیر بن گیا۔ ہتھیاروں کے تصادم کے باوجود لارڈ آئینک میں یہ جرات تھی کہ لیور پیج بنام اینڈرسن مقدمے میں آزادیوں کی تحفیف پر ناراضی کا اظہار کیا۔ پاکستان میں، فوجی ٹولے کا انارنی جنرل سپریم کورٹ میں یہ وکالت کرنے آتا ہے کہ فوجی جبر سے حکومت کا تختہ الٹنے والوں کو دستور پر فوقیت دی جائے اور جنرلوں کی حکمرانی کو قانون کی حکمرانی پر ترجیح دی جائے۔ یہ سے فرق، دو انارنی جنرلوں میں، ان کے کردار میں جو وہ بطور محافظ قانون کے ادا کرتے ہیں۔ یہ حکومت ان پر قابل اعتراض ناقص حکمت کو اپنی مضبوط ترمیم دلیلوں کی حیثیت سے پیش کرنے میں خصوصی مہارت رکھتی ہے۔ اس حوالے سے قرطاس انیض کے مصنفین نے یحییٰ بختیار کے بارے میں جو دلائل دیئے ہیں۔ ان کا اندازہ ان حقائق سے کیا جا سکتا ہے۔ استقام کی بُو دُور سے سوچنی جا سکتی ہے۔ یحییٰ بختیار کے خلاف ان کی نفرت ڈھکی چھپی نہیں۔ مسٹر یحییٰ بختیار کے کیس میں استقام کی بُو صاف محسوس ہوتی ہے۔ اور صرف اسی وجہ سے، یہ ایک خاص کیس ہے۔

قرطاس انیض اپنے صفحہ ۳۴۲ پر بیان کرتا ہے۔ ”اس نشست کی کچھ بین الاقوامی اہمیت بھی تھی۔“ قنوطیت جو اس ریمارک میں شامل ہے اسے کوئی بھی شخص خواہ سیاسیات سے کتنا ہی دور کیوں نہ ہو غلط انداز نہیں کر سکتا۔ کیونکہ یہ نشست ایک سرحدی ضلع میں واقع ہے۔ اسی طرح کے قبائل جیسے اچکزئی اور کاکڑ سرحدی کے علاقے میں آباد ہیں۔ برطانوی افغان جنگوں کے زمانے سے، ہمدرد داؤد خان کی حکومت کے زمانے تک جب مخالفانہ کاروائیاں ختم کر دی گئیں۔ چمن اور پشین انتہائی حساس علاقے تھے۔ اور اب بھی ان کی حساسیت باقی ہے۔ ماضی میں بہت سے سیاسی مسائل اور پریشانیاں اسی راستے سے آتی رہیں۔ بلوچستان کا کوئی باسی خواہ وہ بلوچ ہو یا پختون، اس پر یقین نہیں کرے گا جیسا کہ قرطاس انیض میں کہا گیا ہے کہ۔۔۔

”سرحدوں کے اس پار سے کچھ مداخلت قطعی ممکن ہے“ صرف قرطاس انیض کے

مرتب ہیں ہی، جو بلوچستان کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتے، اس بیان کو مسٹر یحییٰ بختیار میامیری وفاقی یا صوبائی حکومت کے خلاف استعمال کرنے کی کوشش کر سکتے ہیں۔

قرطاس ایضاً ہمیں بتاتا ہے ”مسٹر غازی خان ہمیں بطور خاص ہتھیاروں سے چمن اس لئے منتقل کیا گیا تھا کہ وہ امن و امان کی صورت حال کی دیکھ بھال کر سکیں اور بطور خاص قبائلی علاقوں کے امن و امان کو دیکھیں، دراصل انہیں چمن اس لئے تبدیل کیا گیا تھا کہ وہ انتخابات میں مسٹر یحییٰ بختیار کی مدد کر سکیں۔ قرطاس ایضاً کے صفحہ ۳۴۳ پر مسٹر غازی خان کے بیان کا حوالہ دیا گیا ہے۔ جس میں انہوں نے بیان کیا ہے کہ بلوچستان کے چیف سیکرٹری نے انہیں مسٹر یحییٰ بختیار کی مدد کے لئے بھیجا تھا۔ صوبہ بلوچستان کے چیف سیکرٹری نے اس کی تردید کی۔ مسٹر نیر آغا، سابق اسٹنٹ کمشنر چمن نے بیان کیا ہے ”مسٹر غازی خان کو قبائلیوں کے وراثتی کروار اور اس علاقے میں جو سماجی نظام رائج ہے اس کی وجہ سے کاسیائی نہیں ہو سکتی تھی۔“

چیف سیکرٹری بلوچستان کا کیا ارادہ تھا اور سابق اسٹنٹ کمشنر چمن کا نظریہ کیا کہتا ہے اس سے قطع نظر مسٹر غازی خان کا بیان اس تنازعے اور اختلاف کو ختم کر دیتا ہے۔ مسٹر غازی خان نے کہا ہے ”میں اس آئیڈیا کو کہ سرکاری امیدوار کی مدد چیف سیکرٹری کی خواہش کے مطابق کروں، چھو بھی نہیں سکتا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ ہر طرح کے بائو تھیبے کے باوجود، اس کا نتیجہ امن و امان کے سنجیدہ نتیجے کی صورت میں نکلے گا۔“ یہ بیان سارے مسئلے کو ختم کر دیتا ہے۔ چیف سیکرٹری کا ارادہ، جس کی چیف سیکرٹری نے پر زور تردید کی ہے، اس پر عمل ہی نہیں کیا گیا تھا۔ اس پر کیوں عمل نہ کیا گیا اس کی وضاحت اس مواد اور مسئلے سے باہر کی ہے۔ مسٹر غازی خان نے خود صفحہ ۳۴۳ پر بیان کیا ہے کہ وہ ”سرکاری امیدوار کی مدد کرنے کی جرات ہی نہیں کر سکتے تھے۔“ اس کے بعد اس خواہش کا باقی حصہ ”پلے بوائے“ میگزین میں جاسکتا ہے۔ قرطاس ایضاً تسلیم کرتا ہے کہ اس ”حلقہ انتخاب میں ماحول بڑا تند و تیز تھا۔“ صفحات ۳۴۳ اور ۳۴۴ پر بلوچستان کے سابق چیف سیکرٹری نصر منہ اللہ کا حوالہ دیا گیا ہے، جس میں وہ کہتے ہیں:

”وہ تین حلقہ ہائے انتخابات جہاں، مارچ ۱۹۷۷ء کو انتخابات ہونے والے تھے ان میں پشین خاص طور پر گریڈ کا مقام تھا جہاں بہت زیادہ تناؤ تھا۔ پختون خواہ پارٹی نے اپنی بڑی قوت پشین میں اپنے سربراہ مسٹر محمد خان اپکنزی کی مدد اور حمایت کے لئے مرکوز کر دی تھی۔ ایسی اطلاعات موجود تھیں کہ جہاں کہیں ان کی قوت موجود ہے وہاں وہ طاقت سے بھی اپنا راستہ بنائیں گے۔ پی پی پی نے اپنے امیدوار اٹارنی جنرل کی مدد اور حمایت

کے لئے اپنی بڑی طاقت پشین میں مجتمع کر دی تھی۔ کمشنر اور ڈی سی نے جس قدر زیادہ فورس حاصل ہو سکتی تھی اس کی حاضری کے لئے درخواست کی تھی۔ اس کا انتظام پولیس، بلوچستان کانسٹیبلری اور فائر بریڈ کی تعیناتی سے کیا گیا۔ فوجی اعانت بھی حاصل کی گئی۔ مزید برآں دوسرے اضلاع سے تعلق رکھنے والے افسروں کو بھی یہاں اس عرصے کے لئے ڈی سی پشین کی مدد کے لئے بلوایا گیا۔ ان افسروں کا انتخاب ڈی سی اور کمشنر نے کیا تھا۔ یہ خالصتاً ایک انتظامی عمل تھا اور اس کے نتیجے کوئی سیاسی جواز نہیں تھا۔“

اگر سابق چیف سیکرٹری کے اس بیان کو جو تیز و تند ماحول کے بارے میں تھا تسلیم کیا جاتا ہے تو پھر اس کا مطلب یہ نکلتا ہے کہ افسران کی منتقلی ایک انتظامی عمل تھا جس کا کوئی سیاسی مقصد یا جواز نہیں تھا۔

اس کارفرنس سعید احمد کو جو اس وقت افسر آن سپیشل ڈیوٹی حیدر آباد ٹرینوئل تھے، پیش کیا گیا۔ میں نے سعید احمد کو بتایا کہ وہ تمام سیاسی امور سے نکل جائے اور حیدر آباد ٹرینوئل میں صرف او ایس ڈی کی حیثیت سے شرکت کرے۔ اسی لئے میں کسی طرح بھی اسے ایک انتخابی کام جو حساس اور ممتاز نشست کے بارے میں تھا، سونپ نہیں سکتا تھا۔ سعید احمد مارشل لا کی تحویل میں رہا ہے۔ اور قصوری کیس میں اس نے میرے خلاف گواہی دی ہے۔ اس کا حوالہ دینا یاد کرنا کوئی وزن نہیں رکھتا۔

مسٹر افضل لونی، سابق ڈپٹی کمشنر کوئٹہ اور قرطاس ایضاً کے مطابق ”اس پورے ڈرائے گا ایک بنیادی گواہ“ کا بڑی تفصیل سے ذکر کیا گیا ہے۔ مسٹر لونی کا کہنا ہے کہ اسے چیف سیکرٹری اور کمشنر نے یہ ہدایت دی تھی کہ وہ یہ یاد رکھے کہ یہ نشست کتنی اہمیت رکھتی ہے۔ ایسا ہو سکتا ہے لیکن چیف سیکرٹری اور کمشنر دونوں نے اس سے انکار کیا ہے۔ مزید برآں صفحہ ۲۰۹ پر چیف سیکرٹری نے بیان کیا ہے کہ ”یحییٰ بختیار مسٹر لونی کے بارے میں یہ رائے رکھتے تھے اور اس پر الزام دہرے تھے کہ اس کا پختون خواہ کی طرف جھکاؤ ہے۔“

صفحہ ۳۵۱ پر اس وقت کے اسٹنٹ کمشنر چمن نے بیان دیا ہے کہ مسٹر غازی خان نے ”مسٹر یحییٰ بختیار کے لئے کچھ بھی نہیں کیا تھا۔“ اس طرح مسٹر غازی خان کے بیان کی تصدیق ہو سکتی ہے۔ اس وقت کے چمن کے اسٹنٹ کمشنر نے یہ بھی بیان کیا ہے کہ ”یہ چمن تھا جہاں مسٹر یحییٰ بختیار کو بہت کم ووٹ ملے۔ اور یہاں یہ ہوا کہ پولنگ شیٹوں پر ان لوگوں نے قبضہ کر لیا جو مسٹر یحییٰ بختیار کے مخالف تھے۔“

قرطاس ایض میں انتخابات کے نتائج کے بارے میں شدید نوعیت کے تضادات پائے جاتے ہیں۔ کہیں تو یہ کہا جاتا ہے کہ انتخابات کے نتائج کا اعلان بہت جلدی کر دیا گیا اور کہیں یہ کہا گیا ہے کہ نتائج کا بہت دیر سے اعلان کیا گیا۔ اس کیس میں جو بات نکالی گئی وہ سب سے مختلف اور متضاد ہے۔ یہ منظر انداز کر دیا گیا کہ ۸ مارچ کو نتیجے کا اعلان اس لئے ہوا کہ یہ حلقہ دور افتادہ علاقے میں واقع ہے۔ علاقے کی پسماندگی اور مواصلات کی مناسب سہولتوں کے فقدان کو بالکل نظر انداز کر دیا گیا۔

قرطاس ایض صفحہ ۳۵۱ پر رقم طراز ہے ”یہ بات توجہ کے قابل ہے کہ اس طرح مسٹر یحییٰ بختیار نے یہ نشست صرف ۱۳۸۹ ووٹوں بہت کم اکثریت کے ساتھ حاصل کی۔“ یہ تو انتخابات کے منصفانہ ہونے کی ایک دلیل اور اعتراف ہے۔ اگر میری حکومت نے اس نشست کو جیتنے کے لئے زمین آسمان ایک کر دیئے تو پھر فتح کا یہ فرق اتنا کم نہیں ہونا چاہئے تھا۔ اس کے بعد پھر قرطاس ایض ایک منفی نتیجہ نکالتے ہوئے کہتا ہے ”وہ ووٹ جو فائل بندی نہ کئے ان کی تعداد بہت زیادہ، ۱۰،۹۹۳ تھی۔“ ایسا کیوں ہوا اس کی دو بڑی وجوہات ہیں۔ ایک یہ کہ اس حلقہ انتخابات میں امن و امان کا ماحول ٹوٹ پھوٹ گیا۔ اور دوسری وجہ یہ کہ پی این اے نے بلوچستان میں انتخابات کا بائیکاٹ کر دیا تھا۔ بعض حلقہ ہائے انتخابات جیسے پشین اور کوئٹہ میں اس کے ووٹروں نے ووٹ کی پریسیوٹوں پر دہری مہرین لگادی تھیں۔ تاکہ وہ اپنے احتجاج کو رد کارڈ کرا سکیں۔ یہ حلقہ انتخاب ملک کے انتہائی پسماندہ علاقے میں ہے۔ جہاں لوگ ووٹ کی پرچی پر نشان لگانے میں غلطی کر جاتے ہیں۔ قبائلی علاقوں میں زیادہ آبادی بھی نہیں ہے۔ شہری مراکز جہاں پی این اے نے ایسا ہی عمل کیا وہاں اوسطاً پندرہ سے بیس فیصدی ووٹ کاسٹ کرنے کی شرح ہے۔

صفحہ ۳۵۲ پر مسٹر لونی ڈپٹی کمشنر اور ریٹائرنگ افسر نے کہا ہے کہ، مارچ ۱۹۷۷ کی صبح چیف سیکرٹری نے پشین کا دورہ کیا اور انہیں ہدایت دی کہ ”پی پی پی کے امیدوار کی حمایت کے لئے کچھ کروں“ اس سے پہلے اسی صفحے پر وہ یہ بتاتا ہے کہ اس نے کس طرح ”پی پی پی کے امیدوار کی حمایت کے لئے کچھ کیا“، ”مجھے چمن کے اسٹنٹ کمشنر مسٹر تیر آغا سے رپورٹیں موصول ہو رہی تھیں کہ چمن میں مسٹر محمود خان اپکڑنی کے حامیوں نے بعض پولنگ سٹیشنوں پر کس طرح جھگڑا کیا ہے۔“ پولنگ سٹاف کو باہر نکال پھینکا گیا اور محمود اپکڑنی کی حمایت میں غیر قانونی ووٹ بٹھائے گئے۔“

یہ بات کسی بھی جھگڑے سے زیادہ اہم ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ سرکاری افسروں

سے ان کے اعتبارات چھین لئے گئے۔ اس کا مفہوم یہ ہے کہ تشدد کے ذریعے، جارحیت سے، ووٹ کے عقد س کو مجروح کیا گیا۔ یقیناً جو تادوسری ٹانگ میں ہے۔ مسٹر لونی صفحہ ۳۵۵ پر مزید کہتے ہیں کہ ایک پولنگ سٹیشن پر انہوں نے باہر کھڑے لوگوں کو بلوایا اور انہیں کہا کہ وہ مسٹر یحییٰ بختیار کی حمایت میں ووٹ ڈالیں۔ اس میں وہ مزید یہ اضافہ کرتے ہیں کہ وہ ”سب مسٹر اپکڑنی کے حامی تھے۔“ وہ پی پی پی کے ووٹروں سے یہ توقع نہیں رکھ سکتے تھے کہ مسٹر اپکڑنی کو ووٹ ڈالیں۔ یہ ایک بے معنی بات ہے کہ ان لوگوں کو اس امیدوار کے لئے ووٹ ڈالنے کو کہا جائے جسے وہ ووٹ ڈالنے آئے تھے۔

اسلام بہادر خان کمشنر کوئٹہ کی شہادت صفحات ۳۵۵ اور ۳۵۶ اس کا اختتامی حصہ صفحہ ۳۵۶ پر ہے جس میں کہا گیا ہے ”مندرجہ بالا حقائق سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ پختونخواہ نیپ کے حامی اور اسی طرح آزاد امیدواروں کے حامیوں نے دانستہ سوچ سمجھ کر امن و امان کے لئے سنگین مسئلہ پیدا کیا جس کے نتیجے میں امن و امان قائم کرنے والی ایجنسیوں کو غیر مؤثر بنا کر رکھ دیا۔ چمن کے علاقے میں کم از کم ۱۰/۹ پولنگ سٹیشنوں پر پختون خواہ نیپ کے حامیوں نے قبضہ کر لیا۔ پی پی پی، پولنگ سٹاف اور الیکشن ایجنٹ سے ہاتھ پائی کے بعد انہیں باہر پھینک دیا گیا۔ اسی طرح قلعہ عبداللہ، کرملہ، پیر علی زئی اور بارشور کے علاقوں میں بھی مقامی انتظامیہ کو بد امنی کی صورت حال کا سامنا کرنا پڑا۔“

اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ قرطاس ایض کے نوٹس باب کا نام ”مسٹر محمود خان اپکڑنی کا کیس“ ہونا چاہئے تھا۔ نہ کہ ”مسٹر یحییٰ بختیار کا کیس“ کیونکہ مسٹر یحییٰ بختیار نے نہیں بلکہ مسٹر محمود اپکڑنی نے بے قاعدگیوں کا ارتکاب کیا اور صورت حال کو قبضہ میں لے کر اپنے مفاد میں استعمال کیا۔ بلوچستان کے چیف سیکرٹری نے صورت حال کی مزید تصدیق صفحہ ۳۵۶ پر ان الفاظ میں کی ہے۔ ”پشین پہنچنے پر مجھے ڈپٹی کمشنر نے اطلاع دی کہ چمن میں کچھ پولنگ سٹیشنوں پر پختون خواہ کے کارکنوں نے طاقت سے قبضہ کر لیا ہے۔“

اگر قرطاس ایض پر یقین کیا جائے تو پھر ایف آئی اے کے افسروں کو مسٹر بختیار کو نہیں بلکہ مسٹر اپکڑنی کے خلاف کارروائی کرنی چاہئے اور مسٹر اپکڑنی کو ہی ضمانت قبل از گرفتاری کی درخواست دینی چاہئے۔

صفحہ ۳۵۷ کے نوٹس میں مسٹر ۳۵۸ پر سابق چیف سیکرٹری بلوچستان کے ریمارکس قابل توجہ ہیں۔ یہ کہنا غلط ہے کہ ڈپٹی کمشنر مسٹر لونی، ایڈیشنل ڈپٹی کمشنر مسٹر غازی خان کسی بھی دوسرے سرکاری افسر کو کسی بھی مرتبے میں نہیں نے ہدایات دی تھی کہ وہ پی پی پی کے امیدوار کی مدد کریں۔ انتظامیہ کے ساتھ میرا رابطہ عمومی طور پر کمشنر کے ذریعے تھا۔ مسٹر یحییٰ

اس پر اعتماد نہیں کیا جاتا تھا۔ ان حالات میں اس پر انحصار کرنے یا اس سے مدد لینے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا کہ بد عنوانی کرنے کی اجازت دی جائے گی۔ یہ بیانات خود واضح کرتے ہیں کہ اس کا کسی قسم کی بد عنوانی اور دھاندلی میں ہاتھ نہیں تھا۔

پھر یہ بھی تو قابل غور ہے کہ اگر میری حکومت اس ”ممتاز“ نشست کے لئے تجربہ کاری سے ہی سہی، غور و فکر کر رہی تھی تو میں انتخابات سے چند ماہ پہلے مسٹر نصر من اللہ کو صوبہ بلوچستان کا چیف سیکرٹری مقرر نہ کرتا۔ صفحہ ۳۹۰ پر مسٹر نصر من اللہ کا بیان ہے کہ مسٹر یحییٰ بختیار بلوچستان کے ان دو پی پی پی کے سیاست دانوں میں سے صرف واحد امیدوار تھے جو وزیراعظم کی حمایت سے کبھی محروم نہ ہوئے۔ اگر سابق اٹارنی جنرل صوبے کے کسی بھی دوسرے پی پی پی کے سیاست دان کے مقابلے میں مجھ پر زیادہ اثر و رسوخ رکھتے تھے تو وہ آسانی سے مجھ سے یہ بات منوا سکتے تھے کہ میں صوبہ بلوچستان میں ایسا چیف سیکرٹری نہ بجھاؤں جن پر وہ اعتماد نہیں کرتے۔ مسٹر یحییٰ بختیار اور چیف سیکرٹری کے مابین تعلقات میں تناؤ موجود تھا۔ لیکن میری حکومت کسی چیف سیکرٹری کو انتخابات میں دھاندلی یا کسی غلط مقصد کے لئے استعمال کرنا نہیں چاہتی تھی، اگر مسٹر یحییٰ بختیار کے چیف سیکرٹری کے ساتھ دوستانہ مراسم نہیں تھے تو اس سے بھی معمولی سا فرق نہیں پڑ سکتا تھا۔

پختون خواہ

صفحہ ۳۵۸ پر چیف سیکرٹری نے بیان کیا ہے کہ ”قیاس غالب ہے کہ ان کے (مسٹر بختیار) افسروں سے تعلقات تھے“۔ صفحہ ۳۷۲ پر مسٹر نصر من اللہ بھر بیان کرتے ہیں ”مسٹر یحییٰ بختیار کا ایکشن ایک اداس کہانی تھی۔ جو نئے افسروں نے جو بد عنوانی کی وہ انتہائی دباؤ کے تحت طے ہوئی۔ اور ان پر یہ شدید دباؤ، اٹارنی جنرل کی بجائے ان کے مخالف دوسرے گروہ کا تھا۔“ لیکن اس سے پہلے مسٹر نصر من اللہ نے صفحہ ۳۵۸ پر بیان دیا تھا کہ مانتے تھے اور پولنگ سٹاف کے پختون خواہ کی طرف جھکاؤ کے بارے میں مسٹر یحییٰ بختیار کے اندیشے قطعی طور پر بے بنیاد نہیں تھے۔ پختون خواہ کے کارکن، مقامی انتظامیہ کے تعاون کے بغیر پولنگ سٹیشنوں پر قبضہ نہیں کر سکتے تھے۔ اس پشت پناہی کے بغیر یہ بات ناقابل عمل ہی نہیں بلکہ ناقابل قیاس بھی ہے۔ لیکن پختون خواہ کارکنوں اور مسٹر اچکزئی کے حامیوں نے کئی پولنگ سٹیشنوں پر زبردستی قبضہ کر لیا تھا۔ یہ وہ بات ہے جو چیف سیکرٹری نے صفحہ ۳۵۸ پر بیان کی ہے۔ ”وہ

بختیار مسلسل افسروں کے خلاف شکایات کر رہے تھے۔ ان کا یہ الزام تھا کہ ان کی اکثریت کا جھکاؤ پختون خواہ کی طرف ہے۔ انہوں نے بطور خاص ایڈیشنل کمشنر پشین مسٹر اعظم خان اور اے۔ ڈی۔ وی۔ جی مسرعت عزیز کرد کے خلاف شکایت کی۔ ان کی یہ بھی شکایت تھی کہ پریزائٹنگ افسروں اور پولنگ سٹاف کی اکثریت پختون خواہ کی حامی ہے۔ چمن اور بعض دوسرے مقامات پر جس طرح پولنگ سٹیشنوں پر قبضہ کیا گیا وہاں کے پریزائٹنگ افسروں کے کردار کا خود اظہار کرتا ہے۔ مسٹر بختیار کا خوف قطعی بے بنیاد نہیں تھا۔“

چیف سیکرٹری نے قطعی اور حتمی انداز میں نہ صرف اس کی تردید کی کہ انہوں نے مذکورہ افسروں میں سے کسی کو پی پی پی کے امیدوار کی مدد کے لئے ہدایت نہیں دی تھی۔ اس سے بھی آگے جاکے وہ مسٹر بختیار کے خوف کو بیان کرتے ہیں کہ پولنگ سٹاف اور پریزائٹنگ افسروں کی اکثریت کا جھکاؤ پختون خواہ کی طرف تھا۔ اور ”یہ خوف قطعی طور پر بے بنیاد نہیں تھا۔“ چیف سیکرٹری نے مسٹر بختیار کے اندیشوں کی تصدیق، پولنگ افسروں، پولنگ سٹاف اور اپنے افسروں کی جانبداری اور پختون خواہ امیدوار کی طرف جھکاؤ کی بنیاد پر کی ہے۔ اپنی غیر جانبداری کا انہوں نے اس حد تک دفاع کیا ہے کہ نہ صرف اپنے ماتحتوں کو کسی قسم کی ہدایت دینے کی تردید کی ہے کہ وہ مسٹر یحییٰ بختیار کی مدد کریں، بلکہ صفحہ ۳۵۸ پر وہ مزید یہ بیان دیتے ہیں :

”مسٹر یحییٰ بختیار نے متعدد مواقع پر مجھ سے رابطہ قائم کیا لیکن اپنے پس منظر کی وجہ سے وہ مجھ پر اعتماد نہیں کر سکتے تھے۔ یوں مجھے ایسی خوش قسمت حیثیت حاصل ہو گئی کہ مسٹر بختیار نہ مجھ سے کچھ طلب کر سکتے تھے نہ ہی مجھے ہراساں کر سکتے تھے۔ غالباً یہ ہو سکتا ہے کہ دوسرے افسروں کے ساتھ ان کا معاملہ ہو۔“

اگر یحییٰ بختیار کی ”ممتاز“ اور ”بین الاقوامی اہمیت“ کی نشست اہم ترین نشستوں میں سے ایک تھی کہ مجھے پشین میں بطور خاص دورہ کرنا پڑا، اگر ذاتی اور سیاسی وجوہات قومی اور بین الاقوامی اسباب کے اعتبار سے، یحییٰ بختیار کی کامیابی ضروری تھی تو پھر میں بلوچستان میں ایک ایسا چیف سیکرٹری مقرر نہ کرتا جس پر بلوچستان میں میرے انتہائی طاقتور ساتھی کو اعتماد تک نہ تھا۔ چیف سیکرٹری کے قول کے مطابق یہ بد اعتمادی اتنی گہری تھی کہ سابق اٹارنی جنرل اس قابل نہیں تھے کہ وہ چیف سیکرٹری سے ”کچھ مانگ سکتے“ یا ”انہیں ہراساں کر سکتے“۔ یوں یہ معاملہ ختم ہو جاتا ہے۔ جس پہمانے پر بد عنوانی اور دھاندلی کا الزام لگایا گیا ہے، بلکہ دوسری طرح بھی عملاً چیف سیکرٹری کے تعاون کے بغیر ممکن نہیں جو کہ صوبے کا بنیادی افسر ہوتا ہے۔ چیف سیکرٹری بڑی شہد سے اپنی جانبداری کا اظہار کرتا ہے۔ وہ بیان کرتا ہے کہ

تھام گزرتا جو چمن پر پی اور یوراک میں ہوئی تھی ، اسے دیکھنے کے بعد ، میں ڈی سی پر برس پڑا اور اسے کہا کہ وہ ضمانت دے کہ یہ گزرتا دوسرے علاقوں بالخصوص پارشور میں نہیں ہوئی ۔

اسی بیان میں ہی صفحہ ۳۵۸ پر چیف سیکرٹری نے کس طرح پختون خواہ کے غول اور ٹولوں کو قانون شکنی کرتے ہوئے نہ روکا کیا اور بتایا ”پہ آدمی رات کا وقت تھا جب کاشنر نے مجھے اطلاع دی کہ ڈی ۔ سی واپس آ گیا ہے ۔ اس کی حالت خراب ہے اور اسے راستے میں ایک جگہ روک کر پکڑ لیا اور انہوں نے اسے زدوکوب بھی کیا ۔“ اسی جگہ پر مسٹر محمد اعظم ایکسٹرا اسٹنٹ کمشنر پشین نے بیان کیا ”پولنگ کے دن“ چیف سیکرٹری نے پشین ریست ہاؤس میں ہدایت جاری کی کہ ”جس قدر (زیادہ) ممکن ہو پولنگ سٹیشنوں پر قبضہ کر کے سیکرٹریوں پر مسٹر یحییٰ بختیار کے حق میں مہربیں لکھ دو“ ۔ مسٹر محمد اعظم مزید بتاتے ہیں ”لیکن میں نے فوراً جواب دیا نہیں جناب ، یہ ممکن نہیں ہے“ ۔

ایک عجیب تصویر ظہور میں آتی ہے ۔ چیف سیکرٹری اپنے ملوث ہونے سے انکار کر کے اپنے ماتحتوں کو مورد الزام ٹھہراتا ہے ۔ اس کے ماتحتوں کا دعویٰ ہے کہ مداخلت کرنے کے بارے میں انہوں نے چیف سیکرٹری کے احکامات کی خلاف ورزی کی اور امن و امان برقرار رکھنے کی کوشش کرنے والوں کو ایکڑی کے حامیوں نے پیٹ ڈالا ۔ یوں اس طرح اس ممتاز نشست کو جو بین الاقوامی اہمیت رکھتی تھی ، لاڑکانہ کے ماڈل پلان میں مستحکم کیا گیا تھا ۔

کوئٹہ کے کمشنر اسلام بہادر خان کا اکثر حوالہ دیا گیا ہے ۔ صفحہ ۳۵۵ پر ان کا بیان ہے کہ دونوں امیدوار اتنے ذرا لٹے رکھنے والے اور بارسوخ تھے کہ ”انتخابات حقیقے کے لئے یہ اہلیت رکھتے تھے کہ امن و امان کی سنگین صورت حال پیدا کر سکیں“ ۔ اگرچہ اس نے دونوں امیدواروں کو یکساں صلاحیت کا مالک قرار دیا ہے ۔ تاہم صفحہ ۳۶۲ پر وہ بیان کرتا ہے ”جب پولنگ ختم ہو گئی تو یحییٰ بختیار نے مجھ سے ٹیلی فون پر رابطہ قائم کیا اور نتائج جانتا چاہے ۔ جو معلومات اس وقت فراہم تھیں ان کی بنیاد پر میں نے بتایا کہ اس کی پوزیشن بہت کمزور ہے“ ۔

یہ اچانک یحییٰ بختیار کی پوزیشن کس طرح ”بہت کمزور“ ہو گئی ۔ اس کی وضاحت کوئٹہ کے کمشنر کے اسی بیان میں موجود ہے ۔ وہ اپنا بیان جاری رکھتے ہوئے صفحہ ۳۶۲ پر بتاتا ہے ۔ ”اس دوران میں نیپ پختون خواہ کے حامیوں نے مکمل طور پر پشین ریست ہاؤس کا گھیراؤ کر لیا ۔ جہاں میں الیکشن سٹاف کے ساتھ ٹھہرا ہوا تھا ۔ قانون نافذ کرنے والی ایجنسیاں بشمول اسے سی پشین پختونخواہ نیپ کو وہاں سے ہٹانے میں غیر موثر ہو گئے“ ۔

اگر کمشنر کے الزام کے مطابق ، حکمران پارٹی کے امیدوار کی پوزیشن خراب ہوئی تو اس کی ذمہ داری ایوزیشن کی غنڈہ گردی اور بد عنوانی پر عائد ہوتی ہے ۔ ٹیلی فون کالیں اور ہدایات ،

اگر واقعی دی گئی تھیں ، جس پر میں یقین نہیں کرتا کہ یہ سچ ہے ، تو امانی جنرل نے اس لئے دی تھیں کہ امن و امان کو بحال کیا جائے اور پختون خواہ کے ہاتھوں میں سیلٹ باکس جانے سے بچائے جائیں ۔ یہ امر کہ انتظامیہ غیر موثر ہو گئی یا اس نے خود اپنے آپ کو غیر موثر بنالیا ، اس کا اعتراف چیف سیکرٹری نے قرطاس ایض کے صفحہ ۳۶۲ پر یوں کیا ہے :

”صوبے میں پی پی پی کے رہنما ، یحییٰ بختیار اور ان کے ایجنٹ زور و شور سے جینچ و چلا رہے تھے کہ ان کے پولنگ ایجنٹوں کو زدوکوب کیا جا رہا ہے اور متعدد پولنگ سٹیشنوں سے انہیں پختون خواہ کارکنوں نے زبردستی محال دیا ہے ۔ اور انتظامیہ انہیں تحفظ دینے کے لئے کچھ بھی نہیں کر رہی تھی ۔ سات تاریخ کی سہ پہر جب پی پی پی کے صوبائی صدر مسٹر عیسیٰ مجھے پشین ریست ہاؤس میں ملے تو انہوں نے کہا ”ایسا منظر آتا ہے کہ یہاں پختون خواہ کی حکومت ہے نہ کہ پی پی پی کی حکومت ۔ میں نے پشین میں دیکھا ہے کہ انتظامیہ نے اس وقت مداخلت کرنے کی زحمت تک گوارا نہ کی جب پختون خواہ کے کارکن پولنگ سٹیشنوں پر طاقت سے قبضہ کر رہے تھے ۔ میں نے انہیں بتایا کہ انتظامیہ نے امن و امان بحال رکھنے کی پوری کوشش کی ہے ۔ اور یہ منصفانہ رویہ تھا خواہ حکومت پی پی پی کی ہے یا پختون خواہ کی“ ۔

چیف سیکرٹری نے ، مسٹر عیسیٰ سینئر وزیر اور سابق گورنر بلوچستان کو بڑی بے یارگی سے بتایا کہ انتظامیہ نے امن و امان بحال کرنے کی پوری کوشش کی ہے ۔ اور یہ اس کا منصفانہ رویہ تھا ۔ اپنے ایک ضمنی بیان میں چیف سیکرٹری صفحہ ۳۶۴ پر بیان کرتا ہے :

”واحد نشست جس میں دھاندلی ہوئی ، پشین کی نشست تھی اور جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے وہاں یہ دھاندلی بڑے پیمانے پر ہوئی ۔ تاہم اس نشست پر بڑی دھاندلی اس وقت ہوئی جب الیکشن ختم ہو چکا تھا۔ اس سے پہلے جو کچھ ہوا ، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ انتظامیہ نے بہت سے طریقوں سے جو عمل کیا وہ یحییٰ بختیار کے مفادات کے خلاف تھا۔ کئی پولنگ سٹیشنوں پر پی پی پی کے امیدوار کے خلاف کئی صورتوں میں جبری طور پر نہیں ہو سکتا تھا۔ کئی مقامات پر اغلباً پولنگ سٹاف نے مسٹر یحییٰ بختیار کے مخالفوں کے کھیل میں حصہ لیا۔ انتخابات کے دن ، پشین سے واپسی کے بعد ، یحییٰ بختیار نے جو کچھ کہا تھا ، میں اس پر بہت حد تک قائل ہو چکا تھا کہ جونیئر افسروں کی پختون نوازی کے بارے میں انہوں نے جو کچھ کہا تھا وہ بے بنیاد نہیں تھا۔“

یہاں ہمیں چیف سیکرٹری کے وہ الفاظ مل جاتے ہیں جس سے صاف ظاہر ہے کہ

یہ خاصی دلچسپ اور پر لطف بات ہے کہ مسٹر یحییٰ بختیار کے الیکشن میں بدعنوانی کو ثابت کرنے کے لئے وہی طریقے استعمال کئے گئے ہیں جو میرے خلاف لاہور ہائی کورٹ میں استعمال کئے گئے تھے۔ استغاثہ کے گواہوں اور شہادتوں میں اور ان دونوں کیسوں میں یہ طریقے مشترک تھے:

(۱) مسٹر ٹیلی فون -

(ب) سنی سنائی گواہیاں اور

(ج) بیورو کریٹ -

اس میں اور بھی بہت سی مشترک چیزیں شامل ہیں جو وہ میرے جیسے مہندی پر بھی پوری طرح عیاں ہیں۔ افسروں کو ڈرایا دھمکایا اور خوفزدہ کیا گیا۔ انہیں اس طرح ضمنی بیانات دینے پڑے جیسے وعدہ معاف غلام حسین نے ایک ضمنی بیان کوٹ لکھتے جیل سے دیا۔ وہ ایک دوسرے پر الزام عائد کرتے ہیں تاکہ آپ کو بری الزام قرار دے سکیں۔ مسعود محمود نے ساری ذمہ داری اپنے ماتحتوں پر ڈال دی اور انہوں نے اس پر پھینکنے کی کوشش کی۔ یہی کچھ اس کیس میں ہوا ہے۔ چیف سیکرٹری بدعنوانی میں ملوث ہونے سے انکار کرتا ہے اس کے ماتحت یہ کہتے ہیں کہ اس نے انہیں حکم دیا کہ وہ یحییٰ بختیار کی مدد کریں، لیکن انہوں نے اسے بتایا ”نہیں سر، یہ ممکن نہیں ہے۔“

اس سے میں لاکڑ کانہ میں تین بلامقابلہ جیتنے والوں کے موضوع پر آتا ہوں۔ پہلے مسٹر ممتاز علی بھٹو -

جیسا کہ عیاں ہے قرطاس امتض ان کے بلامقابلہ انتخابات کے بارے میں خاموش ہے۔ میں اس پر دو مختصر آراء دوں گا۔ یہ میری پختہ رائے ہے کہ کراچی اور حیدر آباد کی چند نشستوں اور شاہدہ دیہی سندھ میں ایک نشست چھوڑ کر، پی پی پی کے امیدوار اور میری حمایت اس مسٹر ممتاز علی بھٹو یا قیامندہ صوبہ سندھ میں زیر دست کامیابی حاصل کر سکتے تھے۔ وہ نشست جس پر وہ بلامقابلہ کامیاب ہوئے اس میں نصف علاقہ وہ شامل ہے جس میں سے ان کے والد نبی بخش خان بھٹو نے ۳۶-۱۹۵۵ء میں آزاد امیدوار کی حیثیت سے حصہ لیا تھا۔ انہوں نے مسلم لیگی امیدوار قاضی فضل اللہ کو شکست دی تھی۔

اب میں محترمہ احمد سلطان چانڈیو کا ذکر کروں گا۔ قومی اسمبلی میں ۲۸ مارچ ۱۹۷۷ء کو میں نے اپنی تقریر میں جو کچھ کہا، اس کا حوالہ میں قرطاس امتض کے صفحہ ۱۹ اور ۱۰ سے دے کر اس کی تصدیق کرتا ہوں۔

مقامی انتظامیہ نے مسٹر یحییٰ بختیار کی نہیں بلکہ اچمری کی مدد کی تھی۔ یہ امر قابل توجہ ہے کہ یہ اعتراف ایک ضمنی بیان میں کیا گیا ہے۔ قرطاس امتض میں کئی افسروں کے ضمنی بیانات شامل ہیں۔ اور ریکارڈ میں بیانات سے مطمئن نہ ہوتے ہوئے جو جبری استبدادی ہتھکنڈوں سے حاصل کئے گئے تھے۔ مزید استبداد و جبر کے بعد وہ بیانات حاصل کئے گئے اور غلط انداز میں ضمنی بیانات کے نام سے لئے گئے۔ اس بنا پر بیشتر ضمنی بیانات زیادہ تر الزامی حیثیت میں سامنے آتے ہیں۔ وہ بیان نور ہر حوالہ ہے، چیف سیکرٹری نے زیادہ معلومات فراہم کی ہیں۔ لیکن چونکہ وہ ذہین ہے اس لئے اس نے سچائی کے کچھ پھینکنے بھی ڈال دیے ہیں۔ صفحہ ۳۶ سے عیاں ہوتا ہے کہ کمشنر کوئٹہ کو پاکستان پیپلز پارٹی اور اس کی وفاقی باصوبائی حکومت کے کوئی لگاؤ نہیں تھا۔ قرطاس امتض میں بتایا گیا ہے کہ وہ ایک صاف ستھرے ریکارڈ کا حامل ہے۔ اس کا یہ نفیس ریکارڈ اس لئے تھا کہ کیونکہ:

ڈیڑہ اسماعیل خان کے ڈی سی کی حیثیت سے اس نے اپنے آپ کو مرحوم شیر پاؤ کی مخالف سمت میں پایا۔ کیونکہ وہ مقامی پی پی پی کے کارکنوں کو خوش نہیں کر سکتا تھا اور اس لئے بھی کہ اس کا صوبائی میں حقیقی بھائی جماعت اسلامی کا ایک پرہوش کارکن تھا۔ جو فوری طور پر پی پی پی کے خلاف کام کر رہا تھا۔ واحد حکمران سیاست دان جس کے ساتھ اس کا لگاؤ تھا وہ اس وقت کے صوبہ سرحد کے وزیر اعلیٰ مفتی محمود تھے۔ اس سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ یہ باب اسلام بہادر خان سے کیوں بچا ہوا ہے۔ فطری امر ہے کہ وہ پی پی پی کے کارکنوں کا استہجابی مخالف تھا جتنے کہ پی پی پی کے کارکن اس کے صوبائی میں رہنے والے حقیقی بھائی کے خلاف تھے فرق تھا تو یہ کہ کمشنر کی حیثیت سے اسلام بہادر خان پی پی پی کے کارکن اور ان کی حکومت کو نقصان پہنچا سکتا تھا۔ جبکہ پی پی پی کے کارکن اس کے بھائی کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتے تھے۔ امر واقعہ یہ ہے کہ اس پس منظر کو جانتے ہوئے، میں نے اسلام بہادر جیسے آدمی کو کمشنر کوئٹہ ڈویژن کے عہدے پر تقرری کی اجازت دے دی، جس سے بطور ایک منظم میری غیر جانبداری کا ثبوت ملتا ہے۔ اس کے باوجود کہ اس شخص نے اتنے جھوٹ بولے اور حقائق کو مسح کرنا چاہا کیا۔ وہ صفحہ ۳۷ پر یہ کہنے پر مجبور ہو گیا۔۔۔

”مندرجہ بالا حقائق سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ تمام امیدواروں نے ووٹروں کے ساتھ ساتھ سرکاری افسروں کو خوفزدہ کرنے کی کوشش کی۔ نیپ پختون خواہ اور دوسرے آزاد امیدواروں نے الیکشن میں دھاندلی و حشیانہ طاقت کے ساتھ کی۔ جبکہ یحییٰ بختیار نے اپنے طاقتور اور موثر سرکاری عہدے کو، کیونکہ وہ بہت طاقتور انارنی جنرل آف پاکستان تھے استعمال کیا۔“

”میں پھر یہ بات دہراؤں گا کہ اگر مجھ سے یہ پوچھا جائے کہ پاکستان پیپلز پارٹی کی سب سے اہم اور بڑی کلبانی کیا ہے تو میں جواب دوں گا کہ میرے خیال میں یہ وسیع اور اجتماعی سطح پر عوام کی سوچ میں تبدیلی ہے۔ ایک عمدہ محمد احمد خان کے نظریات میں ہوا یہ مجھے دہرانے دیجئے کہ پاکستان پیپلز پارٹی کی ہر جہد کا سب سے شاندار پہلو ہے۔“

آج اس ہیبر میں بہت سے ایسے افراد بیٹھے ہیں جو اپنے اپنے علاقوں کی نمائندگی کرتے ہیں۔ ان میں میرے ضلع کا ایک شریف آدمی موجود ہے جو نہ صرف پاکستان بلکہ برصغیر ہندوستان کا سب سے بڑا جاگیردار تھا۔ وہ ایک بڑا جاگیردار سردار تھا۔ اس کے پڑوسی ہونے کے ناطے سے میں ان کی سابقہ جاگیر دیکھ چکا ہوں۔ جب میں جوان تھا تو میں دیکھا کرتا تھا کہ وہ کس طرح اپنے مزارعوں سے ملتا ہے۔ اور میں جانتا ہوں کہ اس کے ممتاز دروہ و قار آباد اور بزرگ کس طرح اپنے مزارعوں سے ملتے تھے۔ پچھلے سال میں سیلاب کے دنوں میں وہاں کیا تو میں نے ایک ایسی تبدیلی ان لوگوں میں دیکھی کہ ایک لمحہ کے لئے تو میں سیلاب کو بھی بخیر گمیا۔ یہ فیضی ڈیرو کا واقعہ ہے۔ ایک جوان لڑکے کی عمر میں میں نے دیکھا کہ لوگ کس طرح ادب سے جھکے ہوئے آتے اور اس وقت تک اپنے گھنٹوں کے بل جھکے رہتے جب تک ان کے جاگیردار آقا ہی چھوٹی اچھلی سے انہیں اٹھنے کا اشارہ نہیں کرتے تھے۔ اور آج وہ اپنے ملک کے وزیر اعظم اور سابق جاگیردار آقا کے پاس بیٹھ سکتے تھے۔ جنہیں وہ آج بھی اپنا روحانی سربراہ سمجھتے ہیں اور ان سے برابر کی سطح پر بات چیت کرتے ہیں۔

اس تبدیلی کو دیکھ کر بے حد مسرور ہوا۔ یہ وہ مظہر ہے جسے سمجھنے میں بعض لوگ ناکام رہے ہیں۔ آپ کو چاہئے کہ اسے صحیح انداز میں سراہنے کے لئے خود دیکھیں کہ کس قسم کی تبدیلی رونما ہو چکی ہے۔

میرا خیال نہیں کہ معزز رکن یہاں اور باہر مجھ سے اختلاف کرے گا کہ میں نے انہیں بطور مثال پیش کیا ہے۔ کیونکہ ایک وقت تھا جب وہ برصغیر پاک و ہند کے سب سے بڑے جاگیردار اور انتہائی طاقتور قبائلی سردار تھے۔ مشکل دس سال نہیں گزرے کہ میں نے ان کے علاقے میں بدلتا ہوا رویہ، لوگوں کا طرز عمل اور بدلتے ہوئے نظریات کا مشاہدہ کیا ہے۔ اور پچھلے سال جب میں وہاں گیا تو میں نے وہاں مکمل تبدیلی دیکھی۔ جیسے کہ وہ مختلف لوگ ہوں۔ ان کا ذہن بدل چکا تھا۔ نظر آتا تھا کہ وہ اپنی زنجیریں توڑ چکے ہیں۔ صدیوں سے انہوں نے غلامی کا جو طوق پہن رکھا تھا اسے اتار پھینکا ہے۔ بلاشبہ یہ پاکستان پیپلز پارٹی کی جدوجہد کا ثمر ہے۔ اور یہ واضح کرتا ہے کہ پارٹی کس طرح زبردست اکثریت کے ساتھ حالیہ انتخابات میں مینڈیٹ حاصل کرنے میں کامیاب ہوئی۔“

میں اب بھی اس حیثیت کا مالک ہوں۔ پاکستان پیپلز پارٹی کے چیئرمین کی حیثیت سے میں اس عظیم تبدیلی پر فخر کرتا ہوں جو میری حکومت نے ہمارے جاگیردارانہ نظام میں پیدا کی ہے۔ یہ واحد اور عظیم خراج تحسین ہے جو میری پارٹی کو ملتا ہے اور اس کے حوالے سے آنے والے نسلوں میں بھی اس کی شناخت کی جائے گی۔

تاہم قرطاس امتیض اس حوالے سے بلا مقابلہ منتخب ہونے والے امیدوار سلطان احمد چانڈیو کے بارے میں مجھ سے قیاس پر مبنی اختلاف کرتا ہے۔ صفحہ ۱۰ پر بیان کیا گیا ہے: ”اتفاقاً طور پر، مسٹر احمد سلطان چانڈیو مارشل لاپیڈ کو از سرزراچی کی طرف سے جاری کردہ ایک پریس ریلیز مورخہ ۱۳ اکتوبر ۱۹۷۷ء کے ذریعے ایک مختلف انداز کی روشنی میں سامنے آئے۔ یہ پریس ریلیز دوسرے دن کے اخباروں میں شائع ہوا۔ پریس ریلیز میں بتایا گیا ہے: ”سردار احمد سلطان اور اقبال فیروز پر حال ہی میں ایک خصوصی ملٹری کورٹ کراچی میں مقدمہ چلا۔ دونوں کو دھوکہ دہی اور فریب کاری کا مجرم پایا گیا۔ عدالت نے سردار احمد سلطان چانڈیو کو دو سال قید با مشقت کی سزا دی۔ اس کے علاوہ ۵ لاکھ روپے جرمانہ پایا گیا اور جرمانہ ادا نہ کرنے کی صورت میں مزید چھ ماہ قید با مشقت کی سزا سنائی۔ اقبال فیروز کو چار سال قید با مشقت اور پانچ لاکھ روپے جرمانہ کی سزا ہوئی۔ جرمانے کی عدم ادائیگی کی صورت میں ایک سال مزید قید با مشقت بمحکمتی ہوگی۔ وہ ایک مریول اینجنسری چلا رہے تھے۔ جو جعلی پاسپورٹ اور جھوٹے ویزے جاری کرتی تھی۔ ان کا کاروبار جب تک وہ گرفت میں نہ آئے، زبردست کامیابی سے چل رہا تھا۔“

چانڈیو سردار

آئیے ریکارڈ کو خود پوچھ لیں۔ اس کی تصدیق حکومت سندھ کے ریکارڈز، حکومت پاکستان اور غیر متعلقہ ہندوستان کے اس ریکارڈ سے کی جاسکتی ہے جو بھارت کے پاس مئی دہلی میں محفوظ ہے کہ چانڈیو کی جاگیر برصغیر کی سب سے بڑی جاگیر تھی۔ یہ معلومات ”دی ہسٹری آف لینڈ اینڈ اینڈینس“ جلد اول اور جلد دوم میں بھی موجود ہیں۔ میرا خیال ہے کہ اس کا ذکر رچرڈ برٹن کی مشہور کتاب ”دی ریسر اینڈ ٹرائیٹس آف سندھ“ میں بھی موجود ہے۔ ریویو ریکارڈ بھی دستیاب ہیں۔

چانڈیو جاگیر ایک بہت بڑے علاقے کا دار اور دادو کے اضلاع پر مشتمل تھی اور لاکھوں ایکڑوں اور میلوں تک پھیلی ہوئی تھی۔ چانڈیو قبیلہ سندھ کے بڑے قبیلوں میں سے ہے۔

بلوچستان اور پنجاب میں بھی چانڈیو کثیر تعداد میں آباد ہیں۔ صہیوں سے چانڈیو کے سردار کو غیبی خان کے لقب سے پکارا جاتا ہے۔ چانڈیو سردار ایک عظیم قبیلی نواب ہوتا ہے۔ جیسے کہ نواب محمد خان بگٹی اور نواب خان بخش خان مری۔ وہ ایک چانڈیو ہوتا ہے۔ جس کے صاحبزادے کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ نواب یا نوابزادہ کہلوائے۔ نواب غیبی خان علی نواز خان چانڈیو، جو نواب غیبی خان سلطان احمد خان چانڈیو کے دادا تھے، سندھ میں برطانوی حکمرانی کے سوسالہ عرصے میں چوتھے اور آخری سر کے خطاب یافتہ تھے۔ انہیں ٹائٹ کا یہ اعزاز ۱۹۴۶ء میں دیا گیا تھا۔

مری میں میری نظر بندی کے ایک ہفتے میں ایمر مارشل نور خان مجھے ملنے کے لئے آئے۔ گفتگو کے درمیان انہوں نے آنے والے واقعات کی طرف اشارہ کیا۔ انہوں نے بتایا کہ انہوں نے سلطان احمد چانڈیو کی ٹریول اسچینسی کی نگرانی کی ہے لیکن اس میں پریشانی کی کوئی بات نہیں۔ انہوں نے کہا کہ وہ سلطان احمد چانڈیو کو بلوائین گے اور انہیں کہیں گے کہ وہ اپنے ماتحتوں کو قابو میں رکھیں۔ میں یہ اشارہ پا گیا۔ نور خان جیسا آدمی یقیناً جانتا تھا کہ سلطان احمد چانڈیو میرا انتہائی قریبی دوست ہے۔ میں نے انہیں بتایا کہ چانڈیو ایک بہادر اور حوصلہ مند انسان ہے وہ اس انتہائی کاروائی کا بہادری سے سامنا کریں گے۔ چانڈیو نے اپنی ہی وجوہات نئی بنا پر اپنے آپ کو انتقام کا نشانہ بنایا۔ اگست ۱۹۷۷ء میں انہیں دوبارہ مارشل احکام نے طلب کیا اور انہیں صاف الفاظ میں بتایا کہ اگر انہوں نے میرے ساتھ اپنے تعلقات ختم نہ کئے تو وہ اپنی گردن پھنسا بیٹھے گا۔ اس نے یہ پھندہ لگنے میں ڈال لیا۔ قرطاس ایٹش نے صفحہ ۱۰ پر بڑی ڈھٹائی سے اس انتہائی کاروائی کی تشہیر کی ہے۔ تاہم یہ میری بنیادی زرعی اصلاحات کے لئے ایک خراج تحسین کی حیثیت رکھتا ہے کہ برصغیر کا سب سے بڑا جاگیردار، چانڈیو سرداروں میں پہلا شخص تھا جس نے ایک عام آدمی کی طرح کام کرتے ہوئے اپنی اقتصادی زندگی کا آغاز کیا۔ برطانیہ کی آمد سے پہلے تک لاڑکانہ کو چانڈیو بجا کہا جاتا تھا۔ غیر ملکی آقاؤں نے اسی طرح اس ضلع کا نام بدل دیا جس طرح ہمارے داخلی آقاؤں نے کراچی، سئیل ملز اور اسلام آباد کے کلچرل کمپلیکس کا نام تبدیل کر دیا ہے۔

اور آخر میں مسٹر ذوالفقار علی بھٹو۔ اس سے میں اپنے بلا مقابلہ انتخابات کی طرف آتا ہوں۔ اپنی منشا اور مسرت کے ساتھ میں اپنے الیکشن کے متعلق تاریخی پس منظر کے ساتھ تفصیلات تک جاتا ہوں۔ ضلع لاڑکانہ اور صوبہ سندھ میں انتخابات کی تاریخ میں اس زمانے تک جا سکتا ہوں جب پہلے انگریز کو سندھ کا نائبہ نامزد کیا گیا تھا۔ اس کے بعد ۱۹۰۹ء کی منٹو مارلے اصلاحات اور پھر مونٹگو۔ پیٹرسفورڈ اصلاحات ۱۹۱۹ء۔ جبکہ میرے والد کو اسپرینٹل کونسل میں

منتخب کیا گیا۔ جب ان کی عمر ۳۲ برس تھی اور سندھ کے مسلمانوں کے واحد ترجمان اور نمائندہ تھے۔ میں سندھ میں انتخابات کی تاریخ اس زمانے سے دریافت کر سکتا ہوں۔ حکومت سندھ کے مشیر اعلیٰ اپریل ۱۹۲۷ء میں زندگی میں پہلی بار انتخابات ”کھو“ بیٹھے۔ جس کے چالیس برس بعد مارچ ۱۹۷۷ء میں ان کے بیٹے کو بطور وزیراعظم پاکستان بنادیا۔ میں اس تاریخ و واقعات سے اپنی ذاتی تسکین کے لئے بہت کچھ اخذ کر سکتا ہوں۔

بہر حال مجھے لاڑکانہ کے عوام کے جذبات پر بات کرنی ہے۔ میں جانتا ہوں کہ اگر میں ان کی اپنے ساتھ وابستگی اور تعلق کا ذکر کروں تو وہ اس پر کچھ غصا بھی ہو سکتے ہیں۔ اگر میں اپنا وقت یہ ثابت کرنے کی کوشش پر ضائع کروں کہ انہوں نے مجھے ووٹ دئے تھے تو وہ اس میں اپنی اہمیت محسوس کریں گے۔ میں جان محمد عباسی سے ۱۹۶۲ء میں اس وقت ملا جب میں لاڑکانہ ضلع کے واحد ترجمان کی حیثیت سے قومی اسمبلی کے لئے بلا مقابلہ منتخب ہوا تھا۔ ان دنوں وہ میرے کزن پیر بخش بھٹو کا ”سپیڈ ویتل“ تھا اور اس کے اسپرن کی ڈوریوں کے ساتھ منسلک تھا۔ صرف ایک ایسے الیکشن میں جن میں کسی قسم کی دھاندلی کی ضرورت نہیں اور وہ میرا الیکشن ہے۔ اور مخالف صرف ایک امیدوار ہے اور جس کے خلاف دھاندلی کی کوئی ضرورت نہیں اور وہ جان محمد عباسی ہے۔

قرطاس ایٹش کے خیالات کے تسلسل کا محاسبہ کرتے ہوئے جو انفرادی کیسوں کے متعلق ہیں، یہ قطعی واضح ہو جاتا ہے کہ مصنف کو بلوچستان کے حالات کا قطعاً کوئی علم نہیں۔ اگر وہ کسی طرح بھی بلوچستان کے حالات سے واقف ہوتا تو وہ کبھی پشین اور چمن کی بین الاقوامی اہمیت کو کم تر نہ جانتا۔ اگر اسے سندھ کی شخصیات کے بارے میں معمولی سا شعور ہوتا تو وہ چانڈیو سرداروں کا محض نہ اڑاتا۔

قرطاس ایٹش بتاتا ہے کہ میں نے انتخابات کی منصوبہ بندی کا آغاز اگر جلدی نہیں تو ۱۹۷۴ء میں کیا۔ اور میں نے ماڈل پلان بنائے اور مرعوب کرنے والی مشینری منظم کی۔ اور کوئی دقیقہ فرو گزاشت نہ کیا۔ لیکن میں نے یہ سب احتیاطی تدابیر کیوں اختیار کیں؟ اگر میرے مزاج اور طریق کار کو دیکھا جائے تو پھر کوئی حیرت نہیں۔ میں تسلیم کرتا ہوں کہ میں اقلیت اور قطعیت کو تلاش کرتا اور اس کے لئے پوری تیاری کرتا ہوں۔ اور محض یہی عادت اور میری شخصیت کا پہلو ہے۔ عنوانی کے الزام کی شفی کر دیتا ہے۔ بد عنوانی دھاندلی تو منصوبہ سازی اور تیاری کا اپنی تحمیس ہے۔ بد عنوانی کے جو خطرات ہوتے ہیں جو میں اپنے تحریری احکام میں بھی بیان کرتا رہا اور کاشفرنسوں میں بھی اس کا اظہار ہوتا رہا، ان سے قطع نظر، دھاندلی کی ضرورت نہیں پڑی تھی۔

اپوزیشن چوں چوں کامرہ تھی۔ بھانت بھانت کے افراد کا ایک عجیب امتزاج، یہ نہرو جمع نہرو جمع نہرو مساوی نہرو کی ایک بڑی مثال تھی۔ اپوزیشن کی واحد قوت غیر ملکی کرنسی کے لاکھوں صفوں میں تھی۔ جہاں تک مختلف عناصر سیاسی خانہ بدوشوں کے اس سطحی اتحاد کا تعلق ہے، تو قرطاس ایضاً بھی یہ تسلیم کرتا ہے کہ میں نے اس کی ہوشیاری انتخابات سے بہت پہلے کر دی تھی۔ یہ ہماری سیاست کے ڈھانچے کے عین مطابق تھا۔ اس کی پہلے سے مثالیں موجود تھیں۔ اس لئے میں کسی غیر معمولی بصیرت کا اعزاز نہیں لینا چاہتا۔ ہاؤز شیڈ کے نام اپنے ایک نوٹ مورخہ ۱۵ مئی ۱۹۴۶ کو میں نے رائے دی تھی:

”اپوزیشن UDF کے اندر اور باہر متحد ہو رہی ہے۔ یہ مصالحت کی کوشش کر رہے ہیں اور اپنے اختلافات کو کم کر رہے ہیں۔ وقت گزرنے کے ساتھ اس کوشش میں شدت آ جائے گی۔ اور جب انتخابات قریب ہوں گے تو پھر مخالف اور مختلف سیاسی عناصر زیادہ شدت سے مجبور ہو جائیں گے کہ وہ اتحاد کے مفاد کے لئے سمجھوتے کریں۔“

ہم اس حقیقی اتحاد کو روکنے اور ہم آہنگی کے مواقع کو کم کرنے کے لئے ان کے باہمی تضادات اور اختلافات کو پھیلانے اور نمایاں کرنے میں کیا کر رہے ہیں؟ ہمیں متحرک ہو جانا چاہئے۔ ہمیں اپنے پلان تیار کر لینے چاہئیں۔ وہ جو قدم اٹھاتے ہیں ہمیں اسے بغور دیکھنا ہو گا۔ جو نہی وہ متحرک ہوتے ہیں ہماری جوابی تحریک تیار ہونی چاہئے۔ ہمیں انہیں انفرادی اور اجتماعی دونوں سطح پر توڑنا چاہئے۔ ہم مختلف طریقے اور ذرائع استعمال کر کے ان کی صفوں میں انتشار پیدا کریں گے۔ تاکہ وہ ایک دوسرے کو مشکوک اور مشتبہ سمجھنے لگیں۔ تاکہ وہ ایک دوسرے کی مخالفت کریں۔ ہمارے پاس اس کے لئے کوئی مشینری نہیں ہے۔ ہم محض استاکر دیتے ہیں کہ مجھے تسلی بخش رہور میں بھیجیے رہیں کہ اپوزیشن مرحلہ بہ مرحلہ آگے بڑھ کر جو عظیم اتحاد حاصل کرنے والی ہے، اسے کم از کم ترقی پتا کر مجھے تسلی دی جا رہی ہے۔ اپوزیشن اس مادہ کے آخر میں لاہور میں پھر سے ایک ماہ میں دوسری بار، اکٹھا ہو رہی ہے۔ کیا اس میٹنگ کے لئے ہمارے پاس کوئی تیار شدہ منصوبہ موجود ہے؟ کیا ان میں سے کسی کے ساتھ ہمارا رابطہ ہے جو انہیں راستے سے اتار سکے۔۔۔؟ میں اس ضمن میں بہت مشکوک ہوں۔“

میں نے یہ نوٹ پورا نقل کر دیا ہے کیونکہ قرطاس ایضاً نے اسے صفحات ۱۷۸ اور ۱۷۹ پر پورا ہی نقل کیا ہے۔ میں نے پہلے سے حالات کا اندازہ لگایا تھا اس نوٹ میں یہ تجویز کیا گیا ہے کہ غیر ہم آہنگ عناصر کو جہاں تک ممکن ہو ہم آہنگ نہ ہونے دیا جائے۔ اور یہ روٹی خلا سے

کوئی ایسا جادوگر پاکستان نہیں اترے گا جو ان فوجی پلیوں کی دہلیز میں ایک ساتھ باندھ سکے۔ میں نے کھیل کے اصولوں کے استعمال کے بارے میں تجویز پیش کی۔ یہ کھیل سیاست میں یونان کی شہری ریاستوں کے زمانے سے کھیلا جا رہا ہے۔ اور یہی کھیل اب بھی کھیلا جا رہا ہے۔ میں نے ایسی کوئی تجویز پیش نہیں کی ان کے متحد ہونے کی صورت میں میری حکومت کے پاس کوئی دوسرا راستہ نہیں اس لئے بد عنوانیوں اور غلط کارروائیوں کا سلسلہ شروع کیا جائے۔ اس کے برعکس میں نے مناسب تیاریوں کے لئے بروقت انتباہ کیا نہ کہ بد عنوانیوں کے لئے کہا۔ یہ تو بد عنوانی اور دھاندلی کے خلاف ایک انتباہ تھا۔ یہ ایک حکم تھا کہ ایک متحدہ اپوزیشن کے خلاف انتخابات کے لئے تیار ہو جاؤ۔ جس چیز نے مجھے حیران کیا اور جو میں دیکھ نہ سکا وہ صرف آرا قوتیں تھیں جو اپوزیشن کے پیچھے کھڑی تھیں۔ یہ قوتیں دسمبر ۱۹۴۶ کے وسط میں جمع ہونا شروع ہو گئی تھیں۔

جنوری ۱۹۴۷ میں خفیہ ہاتھوں کے بارے میں مجھے رہور میں ملنے لگیں۔ اسی مہینے میں رفیع رضائے میرے ساتھ ساڑھے چار گھنٹے کی ملاقات کی۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ پی این اے ایک وجود حاصل کر رہی ہے۔ انہوں نے بتایا کہ پی این اے کا صدر کون ہو گا اور اس کے دوسرے عہدیدار کون ہوں گے۔ انہوں نے مجھے اس کے ڈھانچے، ڈیزائن، حکمت عملی اور مقاصد کے بارے میں وجوہات بتائیں۔ اپنے انکشافات کے آخر میں انہوں نے مجھے بتایا کہ میرے پاس تین متبادلات ہیں۔

(۱) میں نیو کلیئر پروسیسنگ پلانٹ کو بھول جاؤں اور اپوزیشن کبھی متحد نہ ہو سکے گی۔

(ب) انتخابات ملتوی کر دوں یا

(ج) انتہائی سنگین نتائج کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار رہوں۔

وہ اصرار کرتے رہے کہ میں ان پر ان کے ذرائع کے انکشاف پر دباؤ نہ ڈالوں، تاہم جو کچھ ہو رہا تھا اسی کے بارے میں وہ پورے علم و یقین کے ساتھ بتا رہے تھے۔ انہوں نے مشورہ دیا کہ میں ایٹمی ری پروسیسنگ پلانٹ کو فراموش کر دوں۔ انہوں نے مجھے مطلع کیا کہ انتخابات کے زمانے میں اپوزیشن ایٹمی ری پروسیسنگ پلانٹ کو مسئلہ یا موضوع نہیں بنائے گی۔ کبھی کبھار وہ نیو کلیئر پاور پلانٹس کا ذکر عوام کو جُل دینے کے لئے اس امید کے ساتھ کریں گے کہ لوگوں کو نیو کلیئر پاور پلانٹس اور ایک نیو کلیئر ری پروسیسنگ پلانٹ کا فرق معلوم نہیں ہے۔ رفیع رضائے مجھے متنبہ کیا کہ میرے ارد گرد کے وہ لوگ جو بڑا جذباتی شور مچا رہے ہیں اور مجھے مشورہ دے رہے ہیں کہ میں ایک ایٹمی پلانٹ نہ بنائوں، جب پردہ گرے گا تو ان میں سے ایک بھی پاس نہ ہو گا۔

ہم نے یہ بات چیت ڈنر پر بھی جاری رکھی۔ آخر میں میں نے اُن کی قیمتی معلومات اور مشورے پر ان کا شکریہ ادا کیا۔ تاہم میں نے انہیں بتایا کہ اب انتخابات کے ملتوی کرنے میں بہت تاخیر ہو چکی ہے۔ اور نہ ہی نیوکلیر ری پروسیسنگ پلانٹ ہی ترک کیا جاسکتا ہے۔ میں نے انہیں مزید بتایا کہ ہم منصفانہ طریقے سے انتخابات چیت لیں گے لیکن اگر ہم ایسا نہ کر سکتے تو پھر یہ اپوزیشن کی مرضی ہے کہ وہ ری پروسیسنگ پلانٹ ترک کر دے یا اس کے معاہدے میں کوئی ترمیم کر لے۔ رفیع رضائے مجھے بتایا کہ انہیں اس میں کوئی شک نہیں کہ ہم منصفانہ مقابلے میں انتخابات ضرور جیت لیں گے، لیکن انہیں یہ معقول حد سے کہہ دینا چاہیے کہ ٹرٹ کے اثرات سے فائدہ اٹھانے نہیں دیا جائے گا۔ چونکہ وہ مکمل کرنا نہیں چاہتے تھے اس لئے میں نے رائے دی۔ ”چھٹا تو ہم انتخابات میں ہار جائیں گے یا ہمیں اپنی فتح کے اثرات کھانے کی اجازت نہیں دی جائے گی۔ اپنی سینٹ کی بنی ہوئی عینک کے شیشوں سے میری طرف دیکھتے ہوئے اور اپنے سر کے ایک طرف اور پیچھے بالوں کو ہاتھ سے کھینچی کرتے ہوئے رفیع رضائے ڈرے ہوئے ہلچے میں کہا ”لیکن سر، میں آپ کو یہ بتانے کی کوشش کر رہا ہوں کہ ایک الیکشن یا ایک عہدے سے زیادہ بڑی چیز داؤں پر لگی ہے۔“ میں نے پراسرار لہجے میں جواب دیا ”میں مہاراجہ سمجھتا ہوں اور تم میرا جواب سن چکے ہو۔“

جانے سے پہلے انہوں نے مجھ سے ایک سوال پوچھنے کی اجازت چاہی۔ میں نے کہا ”ضرور یقیناً“ اس پر انہوں نے پوچھا ”آپ یہ سب کچھ کیوں کر رہے ہیں؟ کس وجہ سے آپ اپنے اور اپنے خاندان کو اتنے بڑے خطروں میں کیوں ڈال رہے ہیں؟ میں نے انہیں بتایا کہ میں یہ اس لئے کر رہا ہوں کہ ایک فلاحی نظام قائم کر سکوں اپنے ملک کو توانا اور جدید بنا سکوں۔ ان لوگوں کے لئے خوشیاں لاسکوں جو اس لفظ کے معنی سے بھی آشنا نہیں۔ میں نے اسے بتایا کہ آنسو ہمیشہ بہتے رہیں گے لیکن میں چاہتا ہوں کہ کم آنسو بہہ اور کم تلخی کے ساتھ بہیں۔“

میرے معالج نصیر شیخ میرے وزیر پیداوار کے رخصت ہونے کے بعد آئے۔ ڈاکٹر نے مجھے بتایا کہ اے ڈی سی کے کمرے میں ان کی ملاقات رفیع رضائے ہوئی ہے۔ ڈاکٹر جو مشاہدہ کرنے والی نظر رکھتے ہیں نے مجھے بتایا کہ رفیع رضائے پریشان اور گھبرائے ہوئے دکھائی دے رہے تھے۔ انہوں نے کہا ”سروہ اتنے سپید نظر آ رہے تھے جیسے کوئی بھوت۔“ نصیر شیخ نے مجھ سے پوچھا کہ کیا میں سختی سے پیش آیا تھا۔ میں اس وقت کھوئے ہوئے موڈ میں تھا۔ میں نے جواب دیا نہیں، میں ان کے ساتھ سختی سے پیش نہیں آیا۔ وہ موضوع جس پر ہم بات کر رہے تھے وہ سخت تھا۔“

پی این اے کی تشکیل حیران کن نہیں تھی۔ میں سابقہ مثالوں کی بنا پر پہلے سے اس کی توقع رکھتا تھا۔ رفیع رضائے مجھے اس کا بیوروٹ کے ساتھ اس کا بارود بھی دکھا دیا تھا۔ جس سے اس نے دھماکا کرنا تھا۔ فرق یہ تھا کہ جگتو فرنٹ، سی سی ایف اور ڈی اے سی (ڈیک) ایک ”دبسی“ کام تھا۔ پی این اے کا اتحاد ایک ”دبسی“ سازش نہیں تھی۔ رفیع رضائے پہلے فرد تھے جنہوں نے مجھے اس کے غیر ملکی رنگ بیان کر کے بتائے۔ قرطاس ایضاً صفحہ ۳۸۴ پر کہتا ہے کہ جب میں قومی اسمبلی اور سینٹ کے مشترکہ اجلاس منعقدہ ۲۳ اپریل ۱۹۷۷ء سے خطاب کر رہا تھا تو میں نے کہا تھا ”یہ ایک دبسی سازش نہیں ہے یہ ایک بین الاقوامی سازش ہے۔ یہ بہت بڑی، عظیم الجثہ سازش۔۔۔ اسلامی جمہوریہ پاکستان کے خلاف۔“ میں اس وقت بالکل صحیح کہہ رہا تھا۔ اس کے بعد کے نتائج اس سے بھی زیادہ سچے تھے۔ انہوں نے نیل کے سر پر کاری ضرب لگادی تھی۔

پُر امن مقاصد کے حصول کے لئے پاکستان کے نیوکلیر پروگرام کی بنیادی اور اسے منتشر کرنے کی خصوصی ذمہ داری، پی این اے اور موجودہ فوجی ٹولے پر عائد ہوتی ہے۔ اسی وجہ سے اس کھیل کے دونوں طرف کے اداکار کھلے عام ایک دوسرے سے ہاتھ ملارہے ہیں۔ غیر ملکی حکومتیں اپنی پالیسیوں پر عمل پیرا ہوں گی۔ صرف ہم، پاکستان میں ایسی حکومتیں ہیں جو غیر ملکی حکومتوں کی پالیسیوں کی پیروی کرتی ہیں۔ وہ جتنا زیادہ خود انحصاری کی بات کریں گے اتنا ہی زیادہ مداخلت کی اجازت دیں گے۔ وہ جتنا زیادہ عدم مداخلت پر بولیں گے اتنا ہی زیادہ مداخلت کی اجازت دیں گے۔ وہ جتنا زیادہ آزادی کی بات کریں گے اتنا ہی زیادہ دوسروں کے محتاج ہو جائیں گے۔

۲۵ جولائی ۱۹۷۸ء کو جاری کی جانے والی دستاویز کو قرطاس ایضاً کا نام دیا گیا ہے۔ جو مارچ ۱۹۷۷ء کے عام انتخابات کے انعقاد اور عمل کے بارے میں ہے۔ انتخابات میں پی پی پی اور پی این اے نے بڑے انہماک سے حصہ لیا۔ دونوں طرف سے ایک دوسرے پر تشدد اور بد عنوانیوں کے الزام لگائے گئے۔ سخت مقابلے کی جنگ ہوئی قرطاس ایضاً میں پی این اے پر کسی قسم کی تنقید موجود نہیں ہے۔ اس کے برعکس اس میں پی این اے کے لئے معذرتیں کی گئی ہیں۔ اس میں اپوزیشن کے اتحاد کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس میں مجھے لاکڑا گیا ہے کہ میں یہ ثابت کروں کہ پی این اے نے باہر سے فخرزائے۔ اس میں مجھ پر تنقید کی گئی ہے کہ پی این اے کے ساتھ میرا رویہ منصفانہ نہیں تھا۔ قرطاس ایضاً ایک یک طرفہ اور جانبدارانہ پیداواری ضیاع ہے۔ جس میں پی این اے کی عدم موجودگی کو لو لے لنگڑے بہانوں سے ثابت کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ جیسے کہ ۱۲ اگست ۱۹۷۸ء کے پاکستان ٹائمز میں اپنے کسی

صحافی سے یہ لکھا کر اپنے ضمیر کی چبھس کو کم کرنے اور لوگوں کو مغالطے سے بھرپور صفائی پیش کرنے کی کوشش کی ہے کہ قرطاس ایٹش تو انتہائی محدود قسم کی تفتیش پر مبنی ہے جو انتخابات کے انعقاد اور رویے تک محدود ہے اور انتہائی کم سمجھ انسان بھی یہ جانتا ہے کہ انتخابات پی این اے نے نہیں کروائے تھے۔

اس وجہ سے، اس مضمون میں کہا گیا ہے کہ پی این اے کو قرطاس ایٹش میں شامل نہیں کیا گیا۔ اس کے تعصب اور عناد کے لئے اس سے بڑی فوجی جرم پیش نہیں کی جاسکتی۔ نہ ہی اس سے بڑی جانبداری اور حمایت ہی کہیں دیکھی جاسکتی ہے جو پی این اے کے لئے قرطاس ایٹش پاکستان پیپلز پارٹی پر بدعنوانی اور دھاندلی کے الزامات لگا کر بے حد خوشی کا اظہار کرتا ہے۔ لیکن پی این اے کی سرگرمیوں کے بارے میں بڑی فیاضانہ خاموشی اختیار کر لیتا ہے۔ جس طرح پی پی پی نے انتخابی مہم تیار کی اور چلائی اسی طرح پی این اے نے بھی انتخابی مہم بنائی اور اس بنیاد پر قرطاس ایٹش میں اس کی بد اعمالیاں شامل ہونی چاہئیں تھیں۔

صدقات تو یہ ہے کہ جو وضاحت اوپر ایک صحافی کی طرف سے موجودہ فوجی حکومت نے پیش کی ہے وہ کسی طرح کسی بھی ذہانت والے شخص پر عیاں نہیں ہو پاتی۔ بے کار کے معنی دلائل سے ظاہر بھی ہو نہیں سکتے۔ وہ غلطی جو ہو چکی ہے اسے کھولنے انداز میں چھپانے کی کوشش نے قرطاس ایٹش کو اور زیادہ تنکا کر دیا ہے۔ ایک معمولی اور سرسری سی دلیل کے ساتھ بڑی غلطیاں نہیں چھپائی جاسکتی ہیں۔ معمولی لیبیا پوتی سے درائیں کس طرح چھپ سکتی ہیں۔ ایسے جیلے بہانے بھلا کون قبول کر سکتا ہے۔ شاید ایک احمق ہی اتنا اندھا ہو سکتا ہے۔ یہ کہیں زیادہ صحیح ہوتا اگر یہ حکومتی ٹولہ سیدھے اگڑ طریقے سے اس دستاویز کو ”مارچ ۱۹۷۷ کے عام انتخابات میں پاکستان پیپلز پارٹی کے کردار اور رویے پر قرطاس ایٹش کا نام دے دیتا۔ بالکل واضح ہے کہ اس کا انتخاب میری حکومت اور میری پارٹی پر حملے کے لئے کیا گیا ہے۔ ۳۳۲ دستاویزات میں سے ایک بھی ایسی نہیں جو پی این اے کی سرگرمیوں سے تعلق رکھتی ہو۔ پی این اے کی وحشیانہ دھاندلیوں کا ایک واقعہ بھی اس میں نہیں دیا گیا جو پی این اے کے کراچی، حیدر آباد، میرپور خاص، سکھر، رحیم یار خان، ملتان، ساہیوال، لاہور، سرگودھا، فیصل آباد، سیالکوٹ، گجرات، گوجرانولہ، کوئٹہ، پشین، مردان، ڈیرہ اسماعیل خان اور کئی دوسرے مقامات پر کہیں۔ اس میں پی این اے کی ایک دستاویز بھی شامل نہیں کی گئی۔ حتیٰ کہ وہ دستاویز بھی نہیں جس میں مسلح افواج کو بغاوت پر اکسایا گیا تھا۔

حقیقت میں قرطاس ایٹش نے اپنے لئے خود ہی کنواں کھودا ہے۔ چاہ کہ راجہ درویش کی کہاوٹ کے مصداق یہی جتھیلہ کے خلاف ایک مقدمہ قائم کرنے کی کوشش میں اس نے

محمود ایگزیٹیو کے خلاف ایک مقدمہ بنا دیا۔ یہی بات دوسرے تمام کیسوں پر بھی پوری اترتی ہے۔ حکمران جماعت کے مفاد کو تشدد اور ابتری پیدا کر کے پورا نہیں کیا جاسکتا۔ حکمران جماعت کے مفادات اور مقاصد کو پولنگ شیڈوں پر جبری قبضہ اور گیراؤ کر کے نقصان پہنچایا جاتا ہے۔ پی این اے نے پولنگ شیڈوں پر قبضہ کرنے کے لئے ہنگامے کئے اور تشدد کو بھڑکایا۔ پی این اے کے تشدد اور ہنگاموں کا ایک نمونہ پشین کے انتخابات ہیں۔

پی این اے کے اعمال کے بارے میں قرطاس ایٹش کے حوالے سے بات کرتے ہوئے میں اپنی اس مخلصانہ درخواست کو پھر دہراتا ہوں جو میں نے جنوری ۱۹۷۷ء میں قومی اسمبلی سے خطاب کرتے ہوئے کی تھی۔ میں اس سے پہلے بھی اس کا حوالہ دے چکا ہوں۔ ”مجھے تو یقین ہے کہ آنے والے انتخابات صاف ستھرے اور منصفانہ انتخابات ہوں گے۔ لیکن صرف میرا وعدہ اس کے لئے کافی نہیں ہے۔ دوسری جماعتوں کو بھی اس خواہش اور پالیسی میں شرکت کرنی چاہیئے۔ دوسری طرف سے بھی اس کا مظاہرہ ہونا چاہیئے کہ وہ یہ جانتے ہیں کہ صاف ستھرے اور منصفانہ انتخابات کا کیا مطلب ہے۔ (صفحہ ۳ - تعارف) میں نے اس میں باہمی تعاون کی اپیل وسیع تر قومی مفاد کے لئے کی تھی۔ میں یہاں پی این اے کے رویے میں تعاون کی چند مثالیں پیش کرتا ہوں۔

(۱) مسٹر اصغر خان نے کئی مواقع پر متعدد بار انتخابات کے انعقاد سے پہلے یہ دعویٰ کیا کہ اپوزیشن انتخابات جیت چکی ہے۔ اور بس ایک رسمی کارروائی ہی، مارچ ۱۹۷۷ء کو ہو گی۔ انہوں نے کہا کہ پی این اے انتخابات کے فیصلوں کو جو ریڈیو پر نشر کئے جائیں گے، اگر وہ پی این اے کی فتح کے برعکس ہوئے تو قبول نہیں کریں گے۔ اس سے واضح تر اشارہ اور کیا مل سکتا ہے کہ پی این اے منصفانہ طور پر انتخابات میں حصہ لینا ہی نہیں چاہتی تھی۔

(ب) ملک کو مفلوج کرنے کے لئے پی این اے کے رہنماؤں نے عام انتخابات سے ایک ہفتہ پہلے عام ہڑتال کرائی۔ وسیع پیمانے پر بد امنی پھیل گئی۔ کراچی میں دو بسوں کا جلایا جانا پوری شہر تک کوردک دینے کے لئے کافی تھا۔ پی این اے کے حامیوں نے لوگوں کو خوفزدہ اور ہراساں کیا۔ پی پی پی کے امیدواروں کی املاک پر بھی حملے کئے گئے۔ تاکہ ان کی انتخابی مہم میں رکاوٹیں ڈالی جائیں۔ پی این اے کے کارکنوں نے پی پی پی کے جلسوں کو اکھاڑنے اور گڑبڑ کرنے کے لئے ہر کوشش کی۔ پی پی پی کے پرچم جلائے گئے۔ پی پی پی کی خواہشیں کارکنوں کے جلوس کو انتہائی غلیظ زبان میں کالیاں دی

(۸)

اندر کا سرطان

ایک قانون کا اطلاق اپنے پسندیدہ لوگوں کے لئے اور دوسرے کا اطلاق ان کے خلاف جن کے لئے نفرت پیدا کرنا ہے۔ اس حکومت نے عوام کے اعتماد اور مورال کو متزلزل کر دیا ہے۔ عام آدمی اس نظام پر اعتماد کھو چکا ہے۔ اس کے بہت سے اسباب ہیں۔ توڑ پھوڑ کا عمل ۵ جولائی ۱۹۷۷ء کو شروع نہیں ہوا تھا، بلکہ اس کا آغاز اس وقت ہوا جب پاکستان کی پہلی دستور ساز اسمبلی اکتوبر ۱۹۵۴ء میں توڑ دی گئی تھی۔ اور وفاقی عدالت پاکستان نے دانشورانہ دھندلے نظریہ ضرورت کے تحت اسمبلی کے توڑے جانے کو جائز قرار دیدیا تھا۔

دوسرا دھچکا اس وقت لگا جب غیر قانونی اور اوٹ پٹانگ انداز سے ایک یونٹ کا نفاذ ہوا۔ پیسرا بھادینے اور پیچھے لے جانے والا واقعہ اکتوبر ۱۹۵۸ء میں ہوا جب ۱۹۵۶ء کے آئین کو مارشل لا لگانے کے لئے ایک طرف رکھ دیا گیا۔ اس کے بعد پانس کیلسن کے نظرئے، ”قانون کا خالص منظر“ کی غلط تشریح کر کے مارشل لا کو جائز قرار دیا گیا۔ ایوب خان نے ملک کو سمری ملٹری کورٹری سے دافدار کر دیا۔ سمری ملٹری کورٹس کا مقصد ”اعلیٰ اور طاقتور“ افراد کو سزا دینا اور عام آدمی کو تیزی سے انصاف دینا تھا۔ سمری ملٹری عدالتوں کو اپنا کام کرتے ایک ماہ بھی نہ ہوا تھا کہ ایوب خان نے اپنی کابینہ کا اجلاس کراچی میں منعقد کیا اور انہیں فوراً ختم کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ سمری ملٹری پاکستان کے گورنر اختر حسین اور مشرقی پاکستان کے گورنر ذاکر حسین نے اس فیصلے سے اتفاق کیا۔ جنرل برکی نے اس فیصلے کی اس بنا پر مخالفت کی کہ اس طرح مارشل لا میں تحقیف ہو جائے گی۔ منظور قادر نے بڑی تفصیل سے وضاحت کی کہ کیا ہو رہا ہے اور یہ کیوں ضروری ہو گیا ہے کہ سمری ملٹری کورٹس کو سمیٹ لیا جائے۔ جب وہ اپنی عالمانہ تقریر ختم کر چکے تو انہوں نے جنرل برکی کی طرف منہ کیا اور اپنے مہذب لہجہ میں کہا ”جنرل، انتخاب مارشل لا کی تحقیف اور پاکستانی افواج کی تدریس کے مابین ہے“۔ سمری ملٹری کورٹس کا خاتمہ کر دیا گیا۔ اس کے بعد دوسرا دھچکا دوسرے مارشل لا کے نفاذ سے لگا جو جنرل یحییٰ خان نے لکھا

گئیں۔ پنجاب میں گورنر انوائٹ، ڈسکہ اور سیالکوٹ میں متشددانہ حملے کئے گئے۔

(ج) پی این اے پاگل ہو گئی تھی۔ مجھے اس شکیات کی ایک نقل بھجوائی گئی تھی جو وفاقی وزیر تعلیم مسٹر عبدالحفیظ پیرزادہ نے کراچی کی صورت حال پر چیف الیکشن کمشنر کو بھجوائی تھی۔ اس میں انہوں نے بیان کیا تھا کہ اس طرح پی این اے نے کھلے عام غنڈہ گردی، بد معاشی اور تشدد کا بازار گرم کیا ہے اور کس طرح کی غلیظ اور اشتعال انگیز زبان پاکستان ہینڈل پارٹی کے خلاف استعمال کر رہے ہیں۔ انہوں نے ایک شرمناک مہم شروع کر رکھی ہے۔ جس میں لٹی انتخابی قوانین و ضوابط کی خلاف ورزی کی گئی ہے۔

(د) اور پھر انتخابات کے دن، ۷ مارچ ۱۹۷۷ء کو پی این اے نے وٹج سربراہی کے پر جو دھاندلیاں کیں اس سے قطع نظر انہوں نے غنڈہ گردی بھی کی۔ کراچی کے اندر کئی پولنگ سٹیشنوں پر انہوں نے مسلح حملہ کیا تاکہ خاتون ووٹروں کو خوفزدہ کیا جاسکے کہ وہ بھاگ جائیں۔ پی پی پی کے دو کارکن کن شات سے زخمی ہو کر جاں بحق ہو گئے۔ اور آٹھ کو ہسپتال میں داخل کیا گیا۔ ملیر توسیتی کالونی، کورنگی، پیراہی ریشٹھ کالونی اور لیافٹ آباد میں پی پی پی کے انتخابی دفاتر جلا دئے گئے۔

(ر) انتخابات کے بعد پی این اے نے احتجاج بھی اسی انداز سے کیا۔ انتخابات سے پہلے انہوں نے گزٹ اور برادمنی پھیلائے کی کوشش کی۔ یوں وہ پاگل ہو گئے تھے۔ قطعی طور پر دیوانے، جیسے کہ امریکن کہتے ہیں۔ اور پھر یہ عجوبہ کہ۔ چیف الیکشن کمشنر کے دونوں بیٹوں آصف سجاد اور وسیم سجاد کی بیویوں نے انتخابی نتائج کے خلاف احتجاجی جلوسوں کی قیادت کی۔

ان کے غلط رویوں کی یہ چند مثالیں ہیں۔ اس کے بدلے میں انتہائی اشتعال انگیزی کے باوجود میری حکومت نے اس کا تبادلہ نہیں کیا کیونکہ ہم دیوانے نہیں ہوئے تھے۔ لہو زیشن جماعتوں کی پالیسی ہی یہ تھی کہ صاف ستھرے اور منصفانہ معیار کے مطابق انتخاب نہ لڑا جائے۔ یہ وہ روشن حقیقت ہے جو انتہائی کم تر دین سوچہ بوجھ رکھنے والوں پر بھی ظاہر ہے۔ پی این اے کے کارناموں کو قرطاس امیض سے حذف کرنا، اس کا ایک امتیازی پہلو ہے۔ یہ استیلا طر ف ہے کہ جیسے لارڈ کیلسن کی دوسری آنکھ بند ہو جائے۔ اس حکومت نے دہرے معیار کا اطلاق دکنی خوراکوں سے کیا ہے۔

تھا۔ ایک بار پھر سمری ملٹری کورس، جینجنٹلے لگیں۔ چھ ماہ سے بھی کم عرصے میں یحییٰ خان جیسا بے حس شخص بھی ان عدالتوں کی کارروائی کی بلور یوں سے گزریا تھا۔ جنرل پیر زادہ، وہ آدمی جو جنرل یحییٰ خان کی انتظامیہ چلا رہا تھا اسے سوچا کہ ان کا جزوی جواب اور علاج یہ ہے کہ ٹریبونلز کو جلدی سے حرکت میں لایا جائے۔ جنرل پیر زادہ کے کارمولانے صرف جنرل کی رفتار کو تیز تر کر دیا۔

اب ملک پر تیسرے مارشل لاء وار کیا ہے۔ اس مارشل لاء کو سابقہ مارشل لاءوں کا سرطان زدہ ورثہ ملا ہے۔ اس کے علاوہ اس نے خود اپنا ایک ناسور پیدا کیا ہے۔ ایوب خان کے لئے جو تین برس کا عرصہ تھا وہ یحییٰ خان کے لئے صرف تین ماہ کا عرصہ بنا۔ اور یحییٰ خان کے جو تین مہینے تھے وہ ضیاء الحق کے لئے تین ہفتے بنے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وقت کے ساتھ ساتھ واقعات کی حرکت میں تیزی پیدا ہوئی ہے۔ عوام میں بیداری پیدا ہو چکی ہے۔ لوگوں نے ۱۹۵۸ء میں جو کچھ طوعاً و کرہاً پسند نہیں کیا تھا اسے اب ۱۹۷۸ء میں قبول کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔

۱۹۷۸ء کی بنیادی حقیقتوں میں سے ایک حقیقت یہ ہے کہ لوگوں کو اس کا شعور حاصل ہو چکا ہے کہ مارشل لاء کوئی قانون نہیں ہے۔ یہ ایک ایسی حکومت ہے جو قانون کے ذریعے قائم نہیں ہوتی۔ اس کی کوئی نسبت قانون کے ساتھ قائم نہیں کی جاسکتی۔ ایک ایسی حکومت جس نے ملک کے اعلیٰ و برتر قانون کو گڑھے میں پھینک دیا ہو، اسے یہ اخلاقی اختیار حاصل نہیں کہ یہ کہے کہ کوئی بھی قانون سے برتر نہیں۔ میں نہیں چاہتا کہ کسی کو بھی قانون سے ماورا قرار دیا جائے۔ لیکن میں قطعی طور پر چاہتا ہوں کہ مارشل لاء کی لاقانونیت سے محفوظ رہا جائے۔ میں چاہتا ہوں کہ پوری قوم اور ہر شہری اس لاقانونیت سے محفوظ رہے۔ قانون کی حکمرانی کے لئے میری جدوجہد یہ ثابت کرتی ہے کہ میں ہرگز یہ نہیں چاہتا کہ کوئی بھی قانون کی عظمت سے بچ سکے۔ ایوب خان اور یحییٰ خان اس حد تک ضرور دیانت و راستے کے وہ یہ تسلیم کرتے تھے کہ

مارشل لاء ایک عارضی چارہ کار ہے۔ قانون نہیں۔ یہ نایک آدمی کا قانون چلتا ہے۔ جو ذاتی احکام دیتا ہے اور اس کے پیچھے فوج ہوتی ہے۔ اس کے برعکس عوام کی مرضی کے پیچھے قانون کا سلسلہ ہوتا ہے۔ ایک صورت حال میں عوام کو بوس کی قوت کی غلامی میں پکڑ دیا جاتا ہے اور دوسری صورت میں آبادی رضا کارانہ طور پر پارلیمنٹ کے ساتھ ایک رشتہ قائم کرتی ہے۔ ایک صورت حال میں یہ ہوتا ہے کہ طاقت کے مرکز سے سنگین کس طرح آبادی کے مرکز میں پہنچتی ہیں اور دوسرے میں یہ کہ ایک آواز کس حد تک، حکمرانوں اور حکومت کئے جانے والوں کے مابین سفر کرتی ہے۔ اس لئے ایک کو فوجی حکومت اور دوسرے کو حکومت کہا جاتا ہے۔

مارشل لاء فوج پر انحصار کرتا ہے قانون پر نہیں۔۔۔

ایک ایسی فوجی حکومت جو آئین کو معطل یا ترک کر دے، اور ملک کو اپنی منشا اور مرضی کے مطابق چلائے، اسے اپنے ہوشوں پر قانون کا لفظ لاتے ہوئے شرم آنی چاہئے۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے کہ ملک کے ساتھ زنا کر کے زنا کی سزا کی تجویز پیش کی جائے۔ یہ ایسے ہی ہے کہ جیسے یہ کہا جائے کہ مقدس قرآن کو معطل کیا جاتا ہے لیکن کوئی شخص حدیث سے انکار نہیں کر سکتا۔ ایک اور ہراساں کر دینے والی صورت حال اس وقت سامنے آئے گی جب فوجی ٹولہ صدر پاکستان کو ہٹائے گا۔ ۵ جولائی ۱۹۷۷ء کی اگستامی تحریک کے مطابق صدر فضل الہی کو آئین کے تسلسل کی علامت کے طور پر رکھا گیا ہے۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے گرامر گرہن کو قانونی ناول لکھنا پڑے۔ بد قسمتی سے، اگاتھا کر سٹی کا حال ہی میں انتقال ہوا ہے، مجھے شبہ ہے کہ وہ اس قتل کا مہم کیسے حل کرتیں۔

اس فوجی ٹولے نے یہ اعلانات کئے ہیں کہ کوئی بھی قانون سے نہیں بچ سکے گا۔ اس میں جو گھناؤنا امتیاز ہے اس سے بڑھ کر گھناؤنا بن نہیں ہو سکتا۔ قانون کے شکنجے صرف پاکستان پیپلز پارٹی اور اس کی قیادت کے لئے ہیں۔ اس انتخاب اور پٹاؤ میں بھی، پاکستان پیپلز پارٹی کے بدنام عناصر، وہ افراد جو پارٹی کے لئے باعث تذلیل تھے، انہیں ”قانون“ سے خارج کر دیا گیا ہے۔ کارکردگی کے مضحکہ خیز ڈرامے کے نام پر باقی ماندہ اہل رے غیروں کو بھی محض اس لئے قانون سے برتر قرار دیدیا گیا کہ انہوں نے اپنے سرمارشل لاء کے خلیفہ کے سامنے بھکادیئے تھے۔

واحد سیاسی پارٹی جو ”قانون“ کے سامنے کی زد میں آتی ہے پاکستان پیپلز پارٹی ہے۔ واحد سیاسی قیادت جو ”قانون“ سے بچ نہیں سکتی، پاکستان پیپلز پارٹی کی قیادت ہے۔ اس کے علاوہ ہر ایک کو قانون کی زد سے بچال اور آزاد کر دیا جائے۔ اس حد تک کہ برطانوی قانون کو ختم ہونے میں تیس برس ہو چکے ہیں۔ اس کے باوجود برطانوی قانون دوبارہ رائج کر کے قیادت میں سے ایک کولنڈن میں پکڑنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ نااہل قرار دینے والے ٹریبونلز صرف پاکستان پیپلز پارٹی اور اس کی قیادت کے لئے وجود رکھتے ہیں۔ جیسے کہ اس لفظ ”کارکردگی“ کی گھونٹیں صرف پیپلز پارٹی کے سروں پر لٹک رہی ہے۔ یہ ایسے ہی ہے کہ جیسے بینک لوٹنے والے ان لوگوں کے بینک اکاؤنٹ کی تصدیق کس جنہیں لوٹا گیا ہے اور ان کو رہائی فراہم کر دی جائے جو ڈالاکے کے خلاف سزا کے طریقے بتائیں۔

جیسا کہ قحطاس ایض میں دکھایا گیا ہے۔ پی این اے نے کسی قسم کی دھاندلی کی نہ بد عنوانی۔ پی این اے ایک برف جیسی سپید، سفید بٹخ ہے جو سوان لیک میں ہے۔ یہ وہ نرم و نازک، چھوٹی معصوم بچہ ہے جو کوئی غلط کام کر ہی نہیں سکتی، کیا کوئی قانون اس طرح کی

غلطی اور جانبداری کا مظاہرہ کر سکتا ہے کہ تحقیقی جرم کے حصہ داروں کو چھوڑ دیا جائے۔ مطلق العنان مارشل لاء کو صرف پی پی پی اور اس کی قیادت تک محدود کر دیا گیا ہے۔ قانون کی سزائیں پی پی پی اور اس کی قیادت کے لئے محدود اور مخصوص کر دی گئی ہیں۔ صرف پی پی پی اور اس کی قیادت ہی پھانسی کے پھندوں، کوڑوں، جیلوں، جرمانوں، غلطیوں اور نااہلیتوں سے ماورا نہیں ہے صرف پی پی پی اور اس کے رہنماؤں کو ہی قانون کے شمولیت سے خارج نہیں کیا جا سکتا۔ یہاں مارشل لاء کی لاقانونیت کی صحیح تعریف ملتی ہے۔ میں قانون سے خارج نہیں کیا جا سکتا کیونکہ اس ملک کا قانون کسی برتر اور طاقتور اور عام آدمی میں کوئی امتیاز نہیں کرتا۔ میں عوام کا ایک دروازہ گرہوں۔ برتر و اعلیٰ اور طاقتور تو پی پی پی میں اس لئے اسے قانون سے آزاد کر دیا گیا ہے۔ اس فوجی حکومت نے عام آدمی جیسے پی پی پی کے ایک کارکن اور اس کے پیئر میں اور برتر و قوی پی پی میں اس کے ”سیدھے“ اور اس کے لیڈروں کے درمیان امتیاز برقرار ہے۔

میں خود اپریل ۱۹۷۷ء میں حیدر آباد ٹرمینل توڑنے والا تھا۔ لیکن ایک بنیادی سیاسی مسئلہ پیدا ہو گیا جو افغانستان سے متعلق تھا اور اس کا حیدر آباد ٹرمینل کی قانونی مستحیج سے تعلق بنتا تھا۔ جس کاٹے ہونا ضروری تھا۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کن وجوہات پر فوجی ٹولے نے حیدر آباد ٹرمینل ختم کر دیا ہے۔ یہ سوال اس وقت زیادہ اہمیت اختیار کر جاتا ہے کہ حال ہی میں عطا اللہ خان میٹکل کا ایک بیان آیا ہے جس میں انہوں نے کہا ہے کہ بلوچ لیڈروں نے معاہدے میں اپنے حصے کی پاسداری کی ہے جبکہ فوجی حکومت نے ایسا نہیں کیا۔ یہ کوئی جہان کن بات نہیں ہے کہ موجودہ فوجی حکومت اپنے معاہدوں اور وعدوں کو توڑتی ہے لیکن قوم کا یہ استحقاق ہے کہ وہ جانے کہ اس معاہدے کی شرائط و مشمولات کیا ہیں۔

اس معاہدے کا انکشاف نہ صرف یہ کہ اس اسرار کو ختم کرنے کے لئے ضروری ہے بلکہ اس سے پاکستان کے کمزور اور نرم و نازک اتحاد کے بارے میں بھی صحیح اندازہ لگ سکے گا۔ یہ ایک اچھی بات ہی سہی کہ ان برتر اور قوی افراد کو آزاد کر دیا گیا کیونکہ وہ دو بار سردار خانوں کے خان پیدا ہوئے تھے اور وہ قانون سے بالاتر تھے اور ایک عام آدمی ذوالفقار علی بھٹو نہیں تھے۔ پاکستان کا یہ سابق صدر اور وزیراعظم ایک ایسا عام آدمی ہے کہ جہاں الزام میں خود اعتراف کرنے والے اور ملزموں کو ڈسٹرکٹ جیل راولپنڈی میں یہ دعوت عام ہے وہ اپنے ہتھے داروں سے ایک ہفتے میں سات سے آٹھ بار گھنٹوں ملاقات کر سکیں۔ وہاں میری بیوی اور بیٹی کو مسلسل شکایت اور احتجاج کرنا پڑتا ہے کہ وہ مجھ سے ہفتے میں صرف ایک بار ملاقات کر سکتی ہیں۔

جب ہم برتر و قوی لوگوں کی بات کر رہے ہیں تو یہ بے جا نہ ہو گا کہ یہ پوچھا جائے کہ اس

برتر و اعلیٰ افراد کے ساتھ کیا جیتی جب پاکستان کے مرتے ہوئے خالق کو ماری پور میں شدید گرمی میں تین گھنٹوں تک ایک بے کار اور ٹوٹی پھوٹی لیمپوں میں چھوڑ دیا گیا تھا۔ کیا وجہ تھی کہ ان کے معالج کرنل الہی بخش نے جو کتاب لکھی اسے ضبط کر لیا گیا؟ اس برتر و قوی کے ساتھ کیا ہوا جس نے لیاقت علی خان کو قتل کرنے کی سازش تیار کی تھی؟ جو پاکستان کے پہلے وزیراعظم تھے اور راولپنڈی میں دن دہاڑے ایک جلسہ عام میں قتل کر دئے گئے۔ وہ پولیس افسر جس نے قاتل کو ہلاک کر دیا، اسے کیوں ترقی دی گئی؟ اسے اس لئے ترقی دی گئی تھی کہ مردہ آدمی کہانیاں نہیں بتایا کرتے۔

میں یہ بھی پوچھنا چاہوں گا کہ وہ جنرل جنہوں نے اب فوجی حکومت بنائی ہے اس وقت اتنے کیوں بولہا رہے تھے جب جیج الرحمن نے محاسبہ کے لئے ڈھاکہ میں مقدمات کرنے کی دھمکی دی تھی؟ وہ اتنے فکر مند کیوں تھے کہ وہ مقدمات قائم نہ ہوں؟ اگر یہ دلیل دی جائے کہ فوجی ٹولہ ماضی کے نقصانات و حادثات کا ذمہ دار نہیں اور یہ فوجی ٹولہ اس لئے محاسبہ کر رہا ہے کہ ماضی میں بڑی بڑی غلطیوں کا ارتکاب ہوا ہے تو پھر کئی محسوس سوال پیدا ہوتے ہیں۔

- (۱) فوجی ٹولے کو اس محاسبہ کا اختیار اور میٹڈ کس نے دیا ہے؟
- (ب) یہ محاسبہ قطعی طور پر یکطرفہ اور مستند طور پر امتیازی کیوں ہے؟
- (ج) کیا یہ محاسبہ قانونی ہے کہ فوجی ٹرمینل قائم کئے جائیں جہاں وہ ان کے سامنے دھکیلا اور کھینچا جائے گا ان کا دفاع و کلا نہیں کر سکتے؟

یہ فوجی حکومت محاسبہ نہیں کر رہی۔ اس فوجی حکومت کو یہ استحقاق ہی حاصل نہیں کہ محاسبہ کر سکے۔ یہ غیر قانونی، امتیازی سزائیں محاسبہ نہیں ہیں۔ یہ انتقام اور بدلے کی انتہائی وحشیانہ قسم ہے۔

اگر یہ عام آدمی جو گڑھی خدا بخش بھٹو سے تعلق رکھتا ہے، پاکستان کی تاریخ میں پہلا مجرم ہے تو اسے محاسبہ کا کوئی خوف نہیں۔ لیکن وہ اس محاسبہ کا مطالبہ عوام سے کرتا ہے۔ ان ہاتھوں سے نہیں جنہوں نے ملک کے اعلیٰ ترین قانون کو بڑے تکبر سے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا ہے۔ ۲۰ دسمبر ۱۹۷۱ء کو قوم کے نام اپنے خطاب میں، پاکستان کے منتخب صدر کی حیثیت سے، کیونکہ میں پہلا سربراہ ریاست اور سربراہ حکومت تھا، میں نے یہ کہا تھا کہ محاسبہ ہو گا۔ لیکن یہ محاسبہ عوام اور پارلیمنٹ کے ذریعے ہو گا۔ ان بغاوت اور گریز کرنے والوں کے ٹولے کے سامنے نہیں جو بارکوں سے نکل کر بے انصافی اور جرم کو محاسبہ کے پردے میں جاری رکھتے ہیں۔

فوج سیاست میں

اب میں اہم ترین موضوع سول، ملٹری تعلقات پر آتا ہوں۔ میں آزادی سے اب تک ان تعلقات کا کھوج لگانے کا ارادہ نہیں رکھتا۔ نہ ہی میں ان باتوں کو دہرانا چاہتا ہوں۔ جو میں نے سپریم کورٹ میں مارشل لا کو چیلنج کرنے والی آئینی درخواست کے بیان حلفی میں کہی تھیں۔ نہ ہی میں ان باتوں کو دہرانا چاہتا ہوں جو مارشل لا آرڈر نمبر ۱۲ کے تحت اپنی حراست پر میں نے اس سنسرڈ بیان حلفی میں کہی تھیں جو لاہور ہائی کورٹ میں ہے۔ نہ ہی ان واقعات کو دہرانا چاہتا ہوں جو میری حراست کے بعد رونما ہوئے۔

تین مکمل مارشل لا عوام کے سامنے آئینے کی طرح کھڑے ہیں۔ ہر چوٹکے چہرے پر بہت زیادہ میک اپ کیا گیا ہے اس لئے پہلے مارشل لا کے چہرے کو عوام صاف طور پر نہیں دیکھ سکتے۔ دوسرے مارشل لا کے چہرے پر الزبتھ آرڈن کا کیا ہوا ”میک اپ“ برہم پترا ہمارے لئے کیا تھا موجودہ مارشل لا کی وگ اور مصنوعی دانت اتر چکے ہیں اور دیکھو کہ عوام اس کے تنگے پن کا عکس آئینے میں دیکھتے ہیں۔ اس وقت جبکہ ہم چٹان کے کنارے پر کھڑے ہیں دیلوں کے لئے وقت نہیں رہا۔ واقعات کی رفتار تیز تر ہو چکی ہے۔ اگر ہم وقت گنوا نہیں دیکھتے تو اب کوئی کے لئے بہت کم وقت رہا ہے۔ بروہ شخص جو اس وقت اخلاقی اور روحانی تقسیم کی گہرائی کو نہیں دیکھ سکتا، احمقوں کی جنت میں رہتا ہے۔ میں اس وقت کثرت اور وحدت، سیکولرازم اور تھیو کریسی، جمہوریت اور ڈکٹیٹر شپ پر اپنے دلائل چھوڑتا ہوں۔

میں نقطہ آغاز کے لئے چیف مارشل لائیڈ منسٹر کے ان ریمارکس کو لیتا ہوں جو انہوں نے ۲۷ جولائی ۱۹۷۸ کو کوئٹہ کے ہوائی اڈے پر دیے۔ جنرل ضیاء الحق نے کہا کہ مسٹر بھٹو نے کہا تھا کہ ملک میں تین طاقتیں ہیں۔ عوامی لیگ، پی پی پی اور فوج۔ اور مسٹر بھٹو نے اپنی بہترین کوشش کی کہ دو کو ملیا میٹ کر دیں اور ایک کو پالیں۔ میں تسلیم کرتا ہوں کہ اس ریمارک کا پہلا حصہ ۱۹۷۰ کے انتخابات کے حوالے سے ایک معروضی حقیقت کی حیثیت سے سامنے آیا تھا۔ مشرقی پاکستان میں عوامی لیگ اور مغربی پاکستان میں پی پی پی دو بڑی سیاسی قوتوں کی حیثیت سے ظہور میں آئی تھیں۔ تیسری قوت فوج تھی۔ فوج نے کچھ عام ۱۹۵۲ میں ایک سیاسی قوت بننے کا آغاز کر دیا تھا۔ اس وقت سے اس کا یہ کردار وسیع ہوا ہے کم نہیں۔ ۱۹۶۹ میں فوج مارشل لا کی صورت میں پاکستان کی حکمران تھی۔ دسمبر ۱۹۷۰ کے انتخابات اس لیگل فریم ورک کے تحت منعقد ہوئے جو فوج نے فراہم کیا تھا۔ فوج اپنی گردن

تک سیاست میں ملوث ہو چکی تھی۔ یہ ایک ناخوشگوار اور پراساں کر دینے والی باطل حقیقت تھی۔

لیکن خوشگوار یا ناخوشگوار یہ ایک حقیقت تھی۔

تین سیاسی قوتیں تھیں۔ عوامی لیگ، پی پی پی اور فوج۔ عوامی لیگ اور پی پی پی کو سیاست کرنے کا ہر حق حاصل تھا۔ فوج سیاسی میدان میں راستہ پھلانگ کر اندر آنے والی مداخلت کرنے والی قوت تھی۔ جنرل کے ریمارک کا دوسرا حصہ مبہم اور اپنا تضاد اپنے اندر رکھتا ہے۔ لیکن ہم اب تک دانتی کے موتیوں کے عادی ہو چکے ہیں۔ میں نے کس طرح ان دونوں کا صفایا کرنے کی کوشش کی اور ایک کو پالیا؟ کیا وہ فوج کو عوامی لیگ کے ساتھ بریکٹ کر رہے ہیں؟ کیا اس سے یہ استنباط کیا جائے کہ فوج کو عوامی لیگ کے چھ نکات تسلیم کرنے میں کوئی پابندی نہیں تھی؟ پاکستان کی مسلح افواج کی، میں نے جو ساڑھے پانچ برس تک قابل فخر خدمات انجام دیں، اس کا صلہ اگر چیف آف آرمی سٹاف مجھے یہ شکرا نہ پیش کر کے ادا کرتا ہے کہ میں نے فوج کو ملیا میٹ کرنے کی ہر ممکن کوشش کی تو میں صرف ایک بات ہی دہرا سکتا ہوں کہ مہربانی کو معاف کرنا بہت مشکل ہوتا ہے۔

کیا میں نے فوج کو اس طرح ملیا میٹ کرنے کی پوری کوشش کی کہ میں نوے ہزار جنگی قیدیوں کو باوقار انداز میں واپس لے آیا؟ دس برسوں سے امریکہ نے اسلحہ کی سپلائی پر جو پابندی لگا رکھی تھی، کیا جنرل ضیاء الحق نے اسے اٹھوایا؟ کیا اس نے چین سے ہتھیار حاصل کئے؟ کیا اس نے ڈیڑھ ملین ڈالر سے زیادہ ہتھیاروں پر صرف کئے؟ کیا اس نے بحریہ کو جدید تر بنایا، لڑاکا جہازیں، فضائی فوج کو اور تینوں سروسز کو مدد مل دینے؟ کیا اس نے ڈیفنس سروسز کی تنظیم نو کی اور دفاعی پیداوار کی وزارت قائم کی؟ کیا اس نے دفاعی اشتراک کے معاہدے مسلم ممالک سے کئے؟ کیا اس نے نیو کلیئر ری پروسیسنگ پلانٹ کا معاہدہ تکمیل تک پہنچایا، اگرچہ اُس نے واشنگٹن پوسٹ کے ایک نمائندے کو انٹرویو دیتے ہوئے اُسے ”میرا پلانٹ“ کہا ہے؟ اگر میں نے فوج کو ملیا میٹ کرنے کی ہر ممکن کوشش کی تو ساڑھے پانچ سال تک میرے ماتحت ملازمت کیوں کی اور اس نے چیف آف سٹاف کا عہدہ کیوں قبول کر لیا؟

جنرل ضیاء کہتا ہے کہ اس پر میری مبینہ دھاندلیوں کا انکشاف حکومت کا تختہ الٹنے اور قبضہ کرنے کے بعد ہوا۔ اگر دھاندلیاں اس وسیع اور اجتماعی سطح اور پیمانے پر ہوتی تھیں، جیسا کہ قرطاس ایض میں بتایا گیا ہے تو یقیناً اسے اس نتیجے پر حکومت پر ناجائز قبضہ کرنے سے پہلے پہنچ جانا چاہیئے تھا۔

رہی ہے کہ ایک کے بعد دوسری سپین اور پر نکال کی نو آبادیاتی آمریت قائم ہوتی رہی یا اپنے ہی ملک کی فوج حکومت کا تختہ الٹتی رہی۔ میکسیکو اور کیوبا میں انقلاب آئے۔ چلی کی مضبوط جمہوری روایت ہے۔ وگرنہ، وسیع سطح پر، عام طور پر بھی یہی ہوا کہ خارجی نو آبادیاتی حکومتوں سے انتہا داخل نو آبادیاتی نظام کو منتقل ہوتا رہا۔

برصغیر افریقہ نہیں ہے۔ یہاں بھی، مضبوط بادشاہتوں کے علاوہ، اقتدار کا نو آبادیاتی آمریتوں، جیسے برطانیہ، فرانس اور پر نکال سے داخلی فوجی آمریتوں کو ہی انتقال ہوتا رہا۔ گنی، متزانیہ، کیوبا اور یسیرا کے علاوہ، افریقی رہنما جیسے نکرو، جنہوں نے اپنی قوموں کو آزادی دلوائی، ان کی حکومتوں کا تختہ بھی برازیل (لاٹینی امریکہ) کے صدر گولڈ کی طرح، فوج ہی الٹتی رہی ہے۔ شجاعانہ ایجاد کا ایک انقلاب الجزائر میں آیا۔ مشرق وسطیٰ میں بادشاہتیں مسیحی کمپنیاں یا انقلابی حکومتیں قائم ہو چکی ہیں۔ شام اور عراق میں حکومتوں کا تختہ الٹنے کے بعد اس کا اختتام بعث پارٹی کے دونوں متضادم گروپوں کے اتحاد کے نتیجے میں پارٹی کے کنٹرول میں آگیا۔ ایک بار پھر جائزہ لیتے ہیں، بعض استثناء سے قطع نظر تیسری دنیا میں استحکام کی یہ

صور تہیں ہیں۔

(۱) قائم شدہ بادشاہتیں۔

(ب) انقلابی قومی تحریکیں۔

(د) پارلیمانی جمہوریتیں۔

جہاں ہمیں حکومتوں کا فوجی طاقت سے تختہ الٹا گیا اس کے نتیجے میں اشتراکی انقلاب آیا یا خلیج کی پانچ روونوں۔ مشرقی پاکستان کی خلیج کی اسی کشتہ کا ایک کیس ہے۔ افغانستان کا موجودہ انقلاب بھی اسی ضمن میں آتا ہے۔ داؤد خان کی حکومت کا تختہ الٹنا ظاہر شاہ کی بادشاہت کے خاتمہ کے مقابلے میں ایک ترقی پسند اور اشتراکی انقلاب کے لئے زیادہ آسان تھا۔ بہت سی وجوہات کی بنا پر برصغیر اپنی ہی طرز کی ایک قسم میں آتا ہے۔ اس کے خون میں جمہوری ادارے رچے بچے ہیں۔ جیسے پنجاب اور بھر دوسری وجہ یہ ہے کہ برصغیر ایک وسیع و عریض سرزمین ہے۔ جہاں کے جد بہت زیادہ آبادی ہے۔ تیسرے یہ کہ برصغیر میں عوامی تحریکیں اشوک کے زمانے سے متحرک رہی ہیں۔ اور چوتھی وجہ یہ ہے کہ ان اور دوسرے متعلقہ عناصر و اسباب کو تسلیم کرتے ہوئے یہ بھی ہوا کہ 1857 کی جنگ آزادی کے بعد، برطانیہ نے ہندوستان کے لوگوں کو قسطنطین جمہوریت دی۔ جمہوریت کا یہ عمل نوے برسوں تک مسلسل جاری رہا۔ نتیجہ کہ 1947 میں مکمل آزادی حاصل کر لی گئی۔

تین عشروں سے زیادہ مدت تک قائد اعظم اور کانڈھی جیسے عوامی رہنماؤں نے برصغیر

لیکن آئیے اس موضوع پر زیادہ بات نہ کریں کیونکہ انتخابات ایک سیاسی عمل ہوتا ہے اور جنرل کو اس کی لاعلمی پر معاف کیا جاسکتا ہے۔ لیکن اگر ہمیں یہی خان کے زمانے سے فوج کو تباہ کرنے کی ہر ممکن کوشش کر رہا ہوں تو یہ ایک سپاہی کے لئے خاص المیہ وقت ہے کہ وہ اس کھیل کو دیکھ سکے۔ آخر جنرل ضیاء الحق نے مجھے اتنے شاندار خطبات خراج تحسین ”پاکستان کا نجات دہندہ“ مسلح افواج کا مہمار کیوں پیش کیا۔ اپریل 1976 میں کوئٹہ میں کمانڈر اور سٹاف کالج کوئٹہ نے میرے اعزاز میں ڈنر دیا۔ جس میں جنرل ضیاء نے کہا۔ اور یہ اس کے اپنے ہی الفاظ ہیں۔

”ہم میں سے وہ جو حقائق اور اعداد و شمار سے باخبر ہیں، مضبوطی طور پر جانتے ہیں کہ پاکستانی فوج پر جو زبردست توجہ 1971 سے اب تک دی گئی ہے اس کی مثال 1971 سے پہلے کی تاریخ میں نہیں ملتی۔

”اس کے ساتھ، سر، میں ذاتی طور پر اور فوج کی طرف سے اس سے واضح اور روشن حقیقت آپ کو پیش نہیں کر سکتا۔ میں جو کچھ کہہ سکتا ہوں وہ یہ ہے شاید ایک دن، اللہ کے فضل سے، جب آپ بھی ہم میں موجود ہوں گے پاکستان کی یہ افواج ثابت کریں گی کہ آپ نے اس پر جو توجہ اور شفقت فرمائی ہے، بے کار نہیں گئی۔“

اپنے اس قصیدے کا چکدار اختتام اس نے یوں کیا۔ ”میں آپ کو مذہب بہت اور سادہ الفاظ میں اپنے دل کی گہرائیوں سے کہہ رہا ہوں کہ ہم آپ کا شکریہ ادا کرتے ہیں، سر، جو کچھ آپ کر رہے ہیں اور جو کچھ آپ نے ہمارے لئے بطور خاص کیا ہے۔“

اس جیسے شاندار خراج تحسین اس نے مجھے چیف آف آرمی سٹاف بننے سے پہلے اور بعد میں پیش کئے۔ اور جیسا کہ میں پہلے بھی ذکر کر چکا ہوں کہ مارشل لاء کے خفا کے فوراً بعد ہی اس نے میری تعریف آسمان تک چڑھانے کی تھی۔

وہ اس تجویز کا ذمہ دار تھا کہ اس نے مجھے آرمڈ فورسز کا کرمل ان انچیف بننے کے لئے کہا، اس نے گھاریاں میں رسم تشریف آوری پر جو تقریر کی وہ پوری کی پوری مدح و ثنا سے بھری ہوئی تھی۔ اگر واقعی میں فوج کا دشمن تھا اور اسے تباہ کرنے کی ہر ممکن کوشش کر رہا تھا تو پھر اسلام کا ایک سپاہی میرے شیطانی منصوبوں سے لاعلم نہیں رہ سکتا تھا نہ ہی ایک مومن میری ایک ممتاز سپریم کمانڈر کی حیثیت سے بار بار مدح و ثنا کرتا۔ جبکہ وہ یہ بھی جانتا ہو کہ میں فوج کو تباہ کر رہا ہوں۔

یہ بات واضح طور پر ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ برصغیر، لاٹینی امریکہ نہیں ہے۔ لاٹینی امریکہ کی تاریخی روایت، ماسوائے میکسیکو اور برازیل، میں بادشاہی کے مختصر تجربے کے علاوہ یہ

کے عوام کی خود مختاری اور آزادی کے جدوجہد کے لئے قیادت کی سیاسی شعور اور سیاسی میدان کے بغیر، ملک کے ٹیکس، تحریک خلافت، ہندوستان چھوڑو اور راست اقدام کے احتجاجات ممکن نہ تھے۔ اور ان جھٹکوں اور احتجاجات کے بغیر برطانوی راج کے ستون بھی نہیں گر سکتے تھے۔ لاطینی امریکہ یا افریقہ یا شرق وسط میں عوام کی میدان کی جدوجہد کی روایت اتنی شدید اور مسلسل نہیں رہی، جتنی کہ برصغیر میں۔ برصغیر کے لوگوں، مسلمانوں اور ہندوؤں دونوں نے، اپنے عوامی رہنماؤں کی عظیم اور متحرک قیادت سے، نہ صرف جدوجہد کی بلکہ قربانیوں دے کر نہ صرف اپنے سنے پر چوں کو لہرایا بلکہ آزادی اور جمہوریت کے ثمرات کے بھی فیض یاب ہوئے۔

آجکل ہمیں اکثر یہ بتایا جاتا ہے کہ پاکستان اسلام کے نام پر تخلیق ہوا تھا۔ یہ درست ہے۔ لیکن پاکستان کس نے تخلیق کیا؟ مسلمان عوام، جو قائد اعظم کی پختہ اور عظیم عوامی قیادت میں جدوجہد کرنے والوں نے، نہ کہ برہمنوں کے ایک ٹولے نے پاکستان تخلیق کیا۔ یہ ملک مسلمانوں کی عظیم تحریک کے نتیجے میں وجود میں آیا کہ نصف شب حکومت کا چرخی تھپتھپانے سے۔ یہ مسلم آبادی تھی نہ کہ فوجی جرنیل جنہوں نے پاکستان تخلیق کیا تھا۔ یہ ملک عوام نے بنایا اور اس کی آزادی کو صرف عوام کے منتخب رہنماؤں کے ذریعے برقرار رکھا جاسکتا ہے۔ صرف وہی جنہوں نے اسلام کے نام پر پاکستان بنایا وہی اپنے منتخب نمائندوں کو یہ حکم دے سکتے ہیں کہ کس طرح اس نام کو استعمال کر سکتے ہیں۔ ایک غاصب اور ایک فوجی ٹولے کو ایسا کوئی اعتماد و اختیار حاصل نہیں کہ وہ اس کام کی تکمیل کر سکتے۔ نہ ہی غاصب اور اس کا فوجی ٹولہ عوام کے ذریعے اقتدار میں آئے ہیں کہ وہ یہ فیصلہ کریں کہ اس ملک کا نظم و نسق اسلام کے نام پر چلایا جائے گا۔ اس کی تشریح اجتماعی طور پر پارلیمنٹ میں ہونی چاہیئے۔ اس کا فیصلہ کوئی فرد یا گروہ نہیں کر سکتا جن کے ہاتھ میں بند و قہیں ہوں۔ اسلام کا نام کسی بدوق یا اس کی نالی سے باہر نہیں آیا، میں اس پر مکمل اتفاق کرتا ہوں کہ پاکستان کے عوام کسی غیر ملکی تسلط و مداخلت کو برداشت نہیں کریں گے اور انہی بنیادوں، اسی منطق کے تحت، پاکستان کے عوام اندرونی سازش کو بھی قبول نہیں کریں گے۔ یہ دونوں سازشیں ایک دوسرے کو مکمل کرتی ہیں۔ اگر ہمارے عوام نے بے بسی سے اندرونی سازش کے آگے سر جھکا دیا تو وہ بیرونی سازش کے سامنے بھی جھک جائیں گے۔ یہ اس لئے ہے کہ غیر ملکی سازش کی طاقت اور اختیار اندرونی سازش کے مقابلے میں بہت بڑی ہے۔ اگر لوگ کمزور قوت سے خوفزدہ ہو جاتے ہیں تو پھر ان کے لئے ممکن نہیں رہتا کہ وہ قوی طاقت کے سامنے مزاحمت کر سکیں۔ اندرونی سازش کو قبول کرنے کا مطلب یہ ہے کہ ہم نے بیرونی سازش کو بھی تسلیم کر لیا ہے۔ پاکستان کے عوام ان دونوں میں سے کسی کو بھی برداشت نہیں کریں گے۔ وہ ان دونوں سازشوں کے خلاف اٹھ کھڑے ہوں گے۔

پاکستان کو عوام نے اسلام کے نام پر تخلیق کیا ہے۔ یہ قابل قبول ہے۔ لیکن اسلام صرف پاکستان میں ہی وجود نہیں رکھتا۔ اسلام صرف پاکستان کے عوام کے لئے نہیں بلکہ پوری دنیا کے لئے خدا نے برتر کا آخری پیغام ہے۔ قرآن پاک فرماتا ہے کہ ”خدا رب العالمین“ ہے۔ کائنات اور دونوں دنیاؤں کا خالق، اسلام دنیا بھر میں پھیلا، مسلم اقوام براعظم ایشیا، افریقہ اور یورپ میں آباد ہیں۔ حال ہی میں سعودی عرب کے دورے کے درمیان، چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر نے یہ اعلان کیا کہ چونکہ یہ اسلام کا روحانی مرکز ہے اس لئے سعودی عرب کو عالم اسلام کی قیادت و سربراہی کا حق دیا گیا ہے۔ بلاشبہ، سعودی عرب اسلام کا روحانی مرکز ہے لیکن کیا ایسے متنازع امور کو پاکستان میں اٹھانا چاہئے، کیا پاکستان میں اس سے لوگوں کو بہکایا جاسکتا ہے؟ سعودی عرب کے شاہی خاندان کی شاندار قیادت میں، جس کے سربراہ شاہ خالد ہیں، شاہی حکومت کسی طرح کے ڈراموں کے بغیر آگے بڑھ رہی ہے۔ اس سے قطع نظر کہ اس فوجی ٹولے کے مسخرے کیا کہتے ہیں، پاکستان کے عوام اور ان کے منتخب رہنما مسلمان ہیں۔ سچا مسلمان وہ نہیں ہے جو حکومت کا فوج کے ذریعے تختہ الٹنے پر تیار ہو جائے۔ بلکہ سچا مسلمان وہ ہے جو ایک مجاہد کی طرح سازش سے کچلے ہوئے عوام کے سیاسی اور معاشی حقوق کی جنگ لڑے۔

ماضی میں یہ جدوجہد میدان جنگ میں کی جاتی رہی۔ اب یہ لڑائی پارلیمنٹ میں لڑی جاتی ہے۔ 1960 یا 1961 کے موسم سرما میں وفاقی جمہوریہ برمنی کے وزیر خارجہ وان برینٹانو راولپنڈی آئے۔ اسی وقت کے وزیر خارجہ منظور قادر اور مجھے کہا گیا کہ ہم ان کی صدر ایوب خان کے ساتھ ملاقات میں شریک ہوں۔ مذاکرات میں بہت سے ماضی نظریات سامنے آئے۔ صدر ایوب خان کے الوداعی الفاظ یہ تھے کہ بلاشبہ پاکستان کی بھی پریشیا جیسی روایات ہیں۔ وان برینٹانو جو ایک جرمن ارسٹو کریٹ اور اطالوی نژاد ہیں۔ غالباً دونوں ملکوں کی مشترکہ مائشوں اور روایات سے آگاہ نہیں تھے یہ خیال ظاہر کیا یہ معلومات بہت دلچسپ ہیں، میں نے یوں میں صدر ایوب کو سنا کہ وہ یہی بات چانسٹر کو نارڈ ایڈیٹار اور وزیر خارجہ شریوڈر کو دہرا رہے ہیں۔ یہی بات انہوں نے مسٹر والٹر ہشل وزیر برائے اقتصادی تعاون سمندر پار ممالک سے لاہور میں کی جو اس وقت وفاقی جمہوریہ برمنی کے صدر ہیں۔ ایوب خان معمولی آدمی نہیں تھے۔ وہ پاکستانی افواج کے نوایاد برسر کمانڈر اچھے رہے تھے۔ اس کے بعد وہ دس برس تک پاکستان کے صدر رہے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایوب خان کو یہ خیال کیسے آیا کہ یہ مائشلت اتنی قریبی ہے کہ وہ متحدہ جرمن رہنماؤں کے سامنے دہراتے چلے گئے۔

”گھناؤنے اور خوفناک“ نیپولین بوناپارٹ سے نجات حاصل کرنے کے بعد، یورپ کے شہنشاہ اور بادشاہ آسٹرو ہنگری، ناپولین کے دارالحکومت کوئی آنا میں جمع ہوئے تاکہ یورپ میں امن

خلاف 1864 میں لڑی گئی۔ دوسری آسٹریا کے خلاف 1866 میں اور تیسری فرانس کے خلاف 1870-1871 میں ان جنگوں کا منصوبہ پرنس اوٹو وان بسمارک نے تیار کیا اور جنرل وان مونیکی کی شاندار اور زبردست جنگی مہارت نے اسے علی جادہ پہنایا۔ فرانس کے انقلاب کے بعد جرمنی کو متحد کرنے کا عمل مکمل ہو گیا۔ اپنی فوج کے ذریعے، پروشیا نے اپنے فوجی بجٹ سے بھی کہیں زیادہ کئی دوسرے مسائل حل کئے۔ 18 جنوری 1871 کو ایک مغرور بسمارک نے جنرل وان مونیکنگے اور دوسرے سیاست دانوں کی معیت میں ایک پرنسٹن تقریب میں اعلان کیا کہ کام مکمل ہو گیا ہے۔

پروشیا کی طرح پاکستان کی بھی ایک بڑی حاضر فوج ہے۔ پاکستان تین جنگیں لڑ چکا ہے۔ پاکستان نے یہ تین جنگیں 1948، 1961 اور 1971ء پروشیا کی جنگوں کے اسی سال بعد لڑیں۔ 17 دسمبر 1971ء کو ڈھاکہ ریس کورس میں جنرل ناگمر نیازی نے جس تقریب میں شرکت کی، وہ اس تقریب کے ایک سو برس منعقد ہوئی جس میں جنرل مونیکنگے نے شرکت کی تھی۔

تہذیب کا مفہوم ہے شہریوں کی برتری۔ فوجی بغاوتیں اور حکومتوں پر ناگہانی قبضے ایک تباہی ہوتے ہیں۔ حتیٰ کہ یورپ کے پاکستان، میں، ہٹلر نے بھی حکومت ایک فوجی بغاوت کے ذریعے حاصل نہیں کی تھی۔ اس نے 'دھاندلیوں' والے ایک انتخاب جیتے تھے۔ جس طرح جنرل نیجی خاں منتخب رہنماؤں کو اقتدار منتقل کرتے ہوئے ہچکچاہتا تھا اسی طرح چانسلر ہنڈبرگ کو انتخابات قبول کرنے میں ہچکچاہٹ ہو رہی تھی۔ اس نے ہٹلر اور نیشنلسٹ سوشلسٹ پارٹی کو اس وقت اقتدار منتقل کیا جب بیرن وان ہیڈسن نے ہمارے چانسلر کو یقین دلایا کہ وہ ہٹلر کو منجھال لے گا۔ مصطفیٰ کمال پاشا ترکی میں انقلاب کے ذریعے برسرِ اقتدار آئے تھے۔ انہوں نے یونانیوں کے خلاف شاندار فتح حاصل کی تھی۔ جسے فرانس اور برطانیہ کا تعاون حاصل تھا۔ رضا شاہ نے ایرانی قوم کی وحدت کو درہیش خطرات سے بچانے کے لئے ایک تحریک کی قیادت کی تھی۔

اگر واقعہ یہ ہے اور انتہائی محتاط ہو کر کہوں گا کہ واحد فوجی بغاوت کے ذریعے حکومت پر قبضہ جو عوام کی شان و شوکت کے لئے تھا، وہ نپولین بوناپارٹ کی فوجی بغاوت تھی۔ لیکن نپولین ایک دیوقامت تھا۔ اس سے زیادہ کوئی مکمل انسان نہیں ملتا۔ اس کی کئی پہلوؤں والی نابینیت کا صرف ایک چہرہ اس کی فوجی ذہانت اور مہارت تھی اس کا نپولین کوڈ آج بھی کئی ملکوں کے بنیادی قانون کی حیثیت رکھتا ہے۔ نپولین ایک ممتاز ناظم تھا۔ وہ ایک سکالر اور رومانی تھا۔ میری رائے میں اس کی شہرے چارلس ڈیکنس کی شہرہ تر تھی۔ اس کے باوجود، اپنی حقیقی نابینیت کے باوجود یہ فوجی وکٹیش بھی فرانس کو وائٹ ٹائمر کے گرنے تک لے گیا۔

اور استحکام کا ایک معاہدہ طے کر سکیں۔ پھر شرفا کا عہد تھا۔ وہ 1789ء کے انقلاب فرانس سے بچ نکلنے میں کامیاب رہے تھے۔ نپولین کو وائٹ ٹائمر میں شکست دے چکے تھے۔ ان کا اعتماد بحال ہو چکا تو تاریخ نے یورپ کے نیلے خون کو وائٹ ٹائمر کی حکمرانی کے لئے بہن لیا ہے۔ انہوں نے سابقہ دستور حکومت کا خاکہ بنایا۔ آسٹریا کا پرنس میٹرنیچ اس کی روح رواں تھا۔ غالباً ان کی نابینیت اور برطانیہ کے وزیر خارجہ لارڈ کسلیرک کے اشتراک کے باوجود کہ وہ فرانس کے لئے بہترین سہولتیں حاصل کر سکے، میٹرنیچ نے ستمبر 1815ء میں ایک شاہی تقریب میں یورپ کے نئے نظام اور آرڈر کو نافذ کر دیا۔

وی آنا کی کانگریس نے "معاہدہ وی آنا" کا اہتمام کیا تھا جس میں پڑھنا دیکھنا وی لکھی تھی کہ بادشاہ ہی ریاست ہے۔ ایک ایسا ملک جہاں شرفا کو خصوصی مراعات اور برتری حاصل تھی، اس میں مطلق العنانی اور جاگیر داری شامل تھی۔ کچھ چھینٹے سرمایہ داری کے دیئے گئے جس میں عوام سب سے پیچھے آتے تھے۔ اور وہ شرفا اور مذہبی ادارے کے شکبے میں پھڑکے ہوئے۔ 26 دسمبر 1815ء کو روس پروشیا اور آسٹریا نے اس مقدس اتحاد پر دستخط کئے۔ لیکن پندرہ سالوں کے اندر اندر عوام پھر اُٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ 1848ء میں یورپ کی تقریباً تمام اقوام بغاوت کر رہی تھیں۔ انقلاب ہوا میں تھا۔ میزنی اور لوئی کوستے جیسے رہنما عوام کی رہنمائی اور تحریک کے لئے ظہور پذیر ہو چکے تھے۔ اقتدار کا ڈھانچہ جسے وی آنا میں جوں کا توں برقرار رکھا گیا تھا، زمین پر آ رہا تھا۔ اس کا معمار اور خالق پرنس میٹرنیچ بھاگ کر لندن چلا گیا بعد میں، انجمن ڈرا ٹیلی اپنی بیوی اور داشتہ کو بتا رہا تھا کہ میٹرنیچ "بور" تھا۔

یورپ کے انقلابوں میں گھرے ہوئے، پروشین امیرزادوں نے اپنی افواج میں توسیع کر دی۔ وقت گزرنے کے ساتھ، پروشین فوج کی اس حد تک توسیع ہو گئی کہ پروشیا کے ذرائع کی کفالت سے بڑھ گئی۔ یہ ثابت ہو چکا تھا کہ اس جسامت اور وسعت کے بوجھ کو پروشیا زیادہ دیر تک نہ اٹھا سکے گا۔ صورت حال اتنی مضحکہ خیز اور تکلیف دہ بن گئی کہ یہ کہا جانے لگا۔ "پروشیا ایک فوج ہے جو ایک ملک میں ہے اور ایک ملک نہیں ہے کہ جس کی فوج ہو" پروشیا کے امیرزادے تیناچ سے بخوبی واقف تھے۔ اب ان کے سامنے تین صورتیں تھیں یا تو

(ا) پروشیا اس حد تک پھیل جائے کہ جرمن فادر لینڈ کا مدار بن جائے۔

(ب) کثیر حاضر فوج میں تخفیف کر دی جائے۔

(ج) پانچ پروشیا اس وسیع اور بڑی فوج کے بوجھ کے نیچے دب کر تباہ ہو جائے گا۔ پروشیا نے اپنے اس مسئلے کو تین توسیع بندی کی جنگیں لڑ کر حل کیا۔ پہلی جنگ ڈنمارک کے

وہ زمانے بہت مختلف تھے۔ ان میں ایک خارجی تسلسل موجود ہے اس کے باوجود ہر دور کو اس کے اپنے زمان و مکان کے حوالے سے فیصلہ کیا جاتا تھا۔ آج کی دنیا میں ہمیں مغرب کو نظر انداز کئے بغیر عصری واقعات و حالات سے سبق حاصل کرنا ہوتا ہے۔ اپنے تجربے کے علم کی بنیاد پر بھی اندازہ لگانا ہوتا ہے کہ ہم کہاں کھڑے ہیں۔ اس نقطہ پر کے حوالے سے یہ کہا جاسکتا ہے کہ ہماری قوم ان کے ہاتھوں میں ڈوب رہی ہے جو تیر نہیں سکتے۔ ہمارے سامنے تین بار فوجی بغاوتوں کے نتائج موجود ہیں۔

پاکستان میں ہر سولین حکومت کا مارشل لاء کے ذریعے تختہ الٹنے کی وجہ کا بنیادی عنوان ”خانہ جنگی“ بنتا ہے۔ بہر حال آنکھوں میں لکھنے والی اس دوائی سے فوجی بغاوت کے امکانات کو کم نہیں کیا جاسکتا۔ 1951 میں لیاقت علی خان نے پاکستان کے چیف آف بحری شفاف سپر جنرل اکبر خان کی فوجی بغاوت کی کوشش کو کچل دیا۔ وزیر اعظم لیاقت علی خان نے حکومت پر قبضہ کرنے کی اس کوشش کی سخت ترین الفاظ میں مذمت کی۔ انہوں نے سازشیوں کو پاکستان کے دشمن اور جمہوریت کے دشمن کا نام دیا۔ انہوں نے جنرلوں کو وارنٹنگ دی کہ وہ پاکستان کی بہبود اور وحدت کے لئے سیاست سے دور رہیں۔ انہوں نے بغاوت کے رہنماؤں کو خود غرض افراد قرار دیا۔ فوجی بغاوت کچل دی گئی اور خانہ جنگی نہ ہوئی۔ دوسری طرف اگر یہ فوجی بغاوت کالیبا ہو جاتی تو وہ اسنے آپ کو، پاکستان کے نجات دہندہ کہلاتے۔ جنہوں نے بڑی ہچکچاہٹ کے بعد پاکستان کو خانہ جنگی سے بچانے کے لئے یہ اقدام کیا تھا۔

1972 کے اواخر اور 1973 کے اوائل میں، ایک سال کی تباہ کن خانہ جنگی کے بعد، جس کے نتیجے میں مشرقی پاکستان علیحدہ ہو گیا، ایک اور فوجی بغاوت منظم کی گئی۔ فوجی بغاوتوں کے تمام مہین کے برتن ابھی خاصیت کے حوالے سے ذاتی ہوتے ہیں۔ لیکن یہ سازش انتہائی ذاتی تھی۔ چیف آف آرمی شفاف جنرل ٹکا خان نے مجھے تعلقات کا ایک چارٹ دکھایا اور بتایا کہ بغاوت کی یہ کوشش ”فیملی کوریس“ کی تھی۔ کچھ سینئر اور کچھ جوئر افسر جو ایک سیاست دان کے دھتے دار اور دوست تھے اور خود پہلے مسلح افواج میں رہ چکا تھا۔ اس سازش کے تیار کرنے والے تھے۔ اس ہونے والی فوجی بغاوت کا طریقہ پہلو یہ ہے کہ ان سازشیوں نے بہت سا وقت اس بات پر ضائع کر دیا کہ اس فوجی بغاوت کے لئے کون سا مناسب اور موثر جواز فراہم کیا جائے اس سیاست دان کا بیان انٹیلیجنس جیسی ایجنسیوں کو خفیہ ٹھکانے تک لے گیا۔ ان سازشیوں پر مقدمہ ان کے اپنے بڑوں نے چلایا۔ جنرل ضیاالحق اس عدالت کا پریذائٹنگ افسر تھا۔

1951ء کی کوشش کو حیدر آباد (اصل میں راولپنڈی کیس) سازش کیس کا نام ملا اور

1973 کی کوشش کو ایک سازش کیس کہا گیا۔ جب مقدمے کی سماعت ختم ہو گئی تو میں نے جنرل ضیاالحق کو راولپنڈی طلب کیا۔ تاکہ وہ اپنے تاثرات دے سکے۔ انہوں نے مجھے اس سازش کے پس منظر میں کام کرنے والے اسباب و محرکات کے بارے میں تفصیل سے بتایا۔ میں اس ذاتی اور خود غرضانہ جواز پر حیران رہ گیا۔ جس نے ان سازشیوں کو بغاوت پر ابھارا تھا۔ اس کوشش کے لئے ایک بھی وجہ، جواز یا سبب سرے سے موجود نہ تھا۔ سازش کی بنیاد خود غرضی پر رکھی گئی تھی۔ اس میں المٹاک بات یہ تھی کہ پاکستان کے 1971ء میں دو ٹکڑے ہونے کے بعد اتنی جلدی یہ بغاوت تیار کی گئی تھی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ تاریخی المیے جنہوں نے فوجی حکمرانی کے ختم لیا تھا وہ اقتدار کے اندھے افراد کے لئے کوئی حقیقت نہیں رکھتے تھے۔ ان کے لئے خون استہابی بے حقیقت تھا جیسے ایک بلخ کے لئے پانی، فوجی حکومت کی عظیم غلطیاں خواہ وہ خارجی تھیں یا بیرونی، ان کی وہ آنکھیں کھولنے کے لئے کافی نہ تھیں۔ مسلح افواج کی سیاست کے ساتھ آلودگی نے ان تک کوئی پیغام نہیں پہنچایا تھا۔ مشرقی پاکستان کی تباہی اور نوے ہزار جنگی قیدیوں کا ہتھیار ڈالنا، انہیں ایک بھی بنیادی اور ابتدائی سبق نہ سکھاسکا تھا۔

پاکستان 14 اگست 1947ء کو ایک اسلامی وفاقی جمہوریت کی حیثیت سے قائم ہوا تھا۔ جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ پہلی فوجی بغاوت کی کوشش جنرل محمد اکبر خان نے 1951ء میں کی تھی پاکستان کی تخلیق کے صرف تین برس بعد۔ دوسری فوجی بغاوت اکتوبر 1954ء میں ہوئی۔ جب گورنر غلام محمد نے پاکستان کی خود مختار آئین ساز اسمبلی توڑ دی اگر پاکستانی فوج کے کمانڈر انچیف جنرل ایوب خان کی مکمل پشت پناہی نہ ہوتی تو یہ غیر آئینی اور غیر اخلاقی قانونی کارروائی باثر نہ ہو سکتی تھی۔ اس مضبوط و توانا تعاون اور مدد کے بغیر غلام محمد ایسی جرأت نہیں کر سکتا تھا۔ اور تیسری ظاہری فوجی بغاوت اکتوبر 1955ء میں ہوئی جب مارچ 1940ء کی قرارداد لاہور میں صوبوں کی خود مختاری ختم کر کے مکمل طور پر خلاف ورزی کرتے ہوئے مغربی پاکستان کو ون یونٹ بنا دیا گیا۔ یہ کام انہی فوجوں نے وہی طاقت استعمال کر کے کیا تھا، جنہوں نے ایک سال پہلے دستور ساز اسمبلی کو ختم کیا تھا۔

اکتوبر 1958ء میں سخت ترین چیز ظہور میں آئی۔ جب جنرل ایوب خان نے فوج کے ذریعہ حکومت پر قبضہ کر لیا۔ مارچ 1969ء میں جنرل یحییٰ خان نے فوج کے ذریعے حکومت سنبھالی۔ مارچ 1973ء میں بریگیڈیروں کی بغاوت کو کچل دیا گیا۔ 5 جولائی 1977ء کو موجودہ فوجی بغاوت معرض وجود میں آئی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ پاکستان کے قیام کے تیس برسوں میں یہاں

(ا) دوبار فوجی بغاوتوں کی کوشش کی گئی۔
(ب) دوبار ظاہر فوجی بغاوتیں ہوئیں۔

خارجی بحران

آئیے پاکستان میں جو فوجی بغاوت ہوئی اور حکومت کا اپنا تک تھتہ الٹ دیا گیا، اس کا موازنہ ایشیا اور افریقہ میں ہونے والی اسی قسم کی فوجی بغاوتوں سے کریں۔ یہ بہت حساس موضوع ہے اور ایشیا سے دو اور افریقی ملکوں سے ایک ہی مثال دی جا رہی ہے۔ ایشیا میں، تھائی لینڈ میں فوج نے حکومت کا تختہ الٹا تو اس ملک میں علحدگی پسندی کی تحریکوں میں جان پڑ گئی اور شدید تر ہو گئیں۔ اگر تھائی بادشاہت نے اتحاد کا ایک معاہدہ پہلے سے فراہم نہ کیا ہوتا تو ملک اس وقت تک ٹکڑے ٹکڑے ہو چکا ہوتا۔ فلپائن میں ایک سویلین صدر کے ذریعے مارشل لا لگایا گیا جس سے منڈواناؤ کے علاقے میں غلہ گی کی تحریک تیز تر ہو گئی۔ اس کے برعکس ملائیشیا کے مٹے اور لاغرا اتحاد کو دیکھئے جو ڈنگن سینڈیز کی رتبلی زمین پر تعمیر کیا گیا تھا۔ غیر متوقع طور پر مضبوط ہوتا دکھائی دے رہا ہے۔ یہ سب جمہوریت کے طفیل ہوا ہے۔ آئیے اپنے ”عظیم اور پیارے“ بھارت کی طرف دیکھیں۔ اگر بھارت کو بھی پاکستانی قسم کے مارشل لاؤں اور فوجی آمریتوں کو پروا داشت کرنا پڑتا تو بھارت اس وقت تک تین چار ٹکڑے ہو جاتا بھارت میں پاکستان سے کہیں زیادہ عدم ہم آہنگی پائی جاتی ہے۔ لیکن اگر ایک وحدت کی صورت میں ہے تو اپنی جمہوریت کے شور و غل کی وجہ سے ہے۔ موریطانیہ میں جو حالیہ فوجی بغاوت ہوئی اور فوج کے حکومت قائم کی ہے اگر وہ اسی درجے میں آتی ہے جو نہر نمود ہے تو لازمی طور پر یہ بغاوت اسلامی جمہوریہ موریطانیہ کو توڑ پھوڑ کر رکھ دے گی۔ اور یہ دوسری اسلامی جمہوریہ ہوگی جو اس صورت حال سے دوچار ہو رہی ہے۔

وہ موضوعات جو اس میں شامل ہیں بہت نازک اور سنگین ہیں۔ لیکن موجودہ حکومت کو دیکھئے کہ وہ تو قرطاس اللہ کے پیادہ وقت گزار رہی ہے جو حقیقت میں ”بے کار کاغذ“ ہے اور اسے اسی کام کے لئے استعمال کیا جانا چاہئے۔ خدا کے لئے آئے ہم خود سنگین قوی مسائل کے لئے اپنے آپ کو مخاطب کریں۔ اس سے پہلے جو پیچھے کو لے جانے والی تدابیر اس

(ج) تین بار مکمل اور پوری فوجی بغاوتیں ہوئیں۔

وہ معمولی کوششیں جو خانہ جنگی کو روکنے کے لئے جنرل اعظم خاں کے مارشل لا کی صورت میں احمدیوں کے خلاف 1953 میں لاہور میں احتجاج میں کی گئیں سے قطع نظر، پاکستان میں خانہ جنگی کو روکنے کے لئے گزشتہ تیس برسوں میں سات بڑی کوششیں کی گئیں۔ یہ بہت عجیب اور حیران کن محسوس ہوتا ہے کہ وہ مسلمان جنہوں نے متحد ہو کر پاکستان کے حصول کے لئے برطانوی استبداد و سامراج اور ہندو برتری کے خلاف جدوجہد کی اور اتحاد کے ایک معجزانہ مظاہرے کے ساتھ پاکستان حاصل کیا، وہی مسلمان بار بار جب موسم خزاں کی تعطیلات ختم ہونے والی ہوتی ہیں، خانہ جنگی پر ٹل جاتے ہیں۔ ترقی اور توسیع کی جھوک، شے اختیار کی نہ سمجھنے والی پیاس، ایک عادت بن جانے والے نشے کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ یہ خانہ جنگی کے اس لیے کو جتن دے سکتی ہے!!

فوجی حکومت نے اختیار کیں، انہیں چھوڑ کر، میں نے بلوچستان کے کسانوں کو اراضی کی منتقلی کے لئے مارشل لار یو لیشن ۱۱۵ نافذ العمل کیا تھا۔ اسے معطل کر دیا گیا ہے اور یہ معطلی ضرر رساں ہے۔

یہ اصلاحات جس میں کہ اراضی شلینڈ کا سروے مکمل ہو چکا ہے، اس کی معطلی کا مطلب یہ نکلتا ہے کہ اسے منسوخ کر دیا گیا ہے۔ بلوچستان کے سابقہ سردار، ان اصلاحات کی منسوخی میں آپ کے ساتھ نہیں ہیں۔ ایسی اصلاحات کا خاتمہ کر کے، آپ بلوچستان کے کسانوں کو بھی کھونا چاہتے ہیں۔ حتیٰ کہ بلوچستان کی بہت اچھی طرح پختی ہوئی ”بچی“ بھی ملے گی کے لئے بہتر کھانا نہیں ہے۔

مارشل لاکھومت نے صرف یہی ناپسندیدہ اقدام نہیں اٹھایا۔ جسے چاروں صوبوں کا منیڈیٹ حاصل نہیں ہے۔ یہ قدرتی امر ہے کہ جب وہ شراکت کی جس محسوس ہی نہیں کرتے اگر سیاسی طور پر انتشار اور جنگل کا سماں ہے تو پھر قومی وحدت مجروح ہوتی ہے اور ملحدی پسندی کے رجحانات کو فروغ ملتا ہے۔ یہی رجحانات خارجہ پالیسی میں بھی در آتے ہیں بین الاقوامی خارجہ امور میں، میرا فرض مجھے مجبور کر تا ہے کہ میں صرف سوالات اٹھاؤں جن سے قومی مفادات کو نقصان پہنچ رہا ہے۔

(۱) پاکستان افغانستان تعلقات

افغانستان کے مسئلے میں یہ متنبذ بانہ پالیسی کام نہیں آئے گی وہ پیچیدہ اور الجھا ہوا جالاجو تاریخ کے تین سو، یا اس سے زیادہ عرصے کا ورثہ، اسے صرف صدر داؤد کا شالامار باغ میں اٹھا کر یا افغان سفارت خانے کے استقبالیے میں شرکت کر کے، پٹیا نہیں جاسکتا۔ اس کے لئے بہت کچھ کرنا پڑے گا۔ فوجی حکومت اینک افغانستان کی نئی حکومت کے ساتھ زیادہ رسم و راہ پیدا نہیں کر سکی۔ میری حکومت نے اس سلسلے میں بھی کامیابیاں حاصل کی تھیں، جن سے اشتعال انگیزوں کا خاتمہ ہوا تھا، موجودہ حکومت نے اس سلسلے میں کوئی پیش رفت نہیں کی بلکہ پسپائی کی ہے۔

ایک خاصے عرصے کے جو بعد تناؤ اور پریشانیوں سے بھرا ہوا تھا، جون ۱۹۷۶ء کے پہلے ہفتے میں، افغانستان کے سابق صدر سردار محمد داؤد نے مجھے کابل آنے کی دعوت دی تاکہ اس پر مذاکرات کئے جائیں اور تصفیہ کیا جائے جسے کابل والے پاکستان اور افغانستان کے درمیان ”واحد

سیاسی اختلاف“ کہتے ہیں۔ کابل میں جو شدید نوعیت کے مذاکرات ہوئے اسی کے نتیجے میں یہ بات سامنے آگئی کہ افغان چاہتے تھے کہ نیپ کے ان رہنماؤں کو رہا کر دیا جائے جنہیں حیدر آباد کے خصوصی ٹریول نے سزا دی تھی۔ اس کے بعد وہ تباہی کے ڈیورنڈ لائن کو پاکستان اور افغانستان کے درمیان بین الاقوامی سرحد تسلیم کر لیں گے۔ میری طرف سے، یہ اصرار تھا کہ دونوں اقدام ایک وقت ایک معاہدے کی صورت میں کئے جائیں۔

چونکہ باتیں کسی حتمی نتیجے تک نہ پہنچ سکیں اس لئے یہ فیصلہ ہو کہ مذاکرات اور مضامین کو رکھنے کے لئے افغانستان کے سابق صدر پاکستان تشریف لائیں گے۔ اس دوران میں، ایک تاریخی مشن کے اعلامیہ، جو ہنڈ ونگ کے بقائے باہمی کے اصولوں پر مشتمل تھا، کابل کے دورے کے خاتمے پر جاری کیا گیا۔ جب صدر داؤد اور ان کا وفد اگست ۱۹۷۶ء میں پاکستان آئے تو کابل میں جو مذاکرات ہوئے تھے ان کے تسلسل کو راولپنڈی کے مذاکرات میں جاری رکھا گیا۔ پہلے راؤنڈ کے بعد، پاکستان اور افغانستان کے وفود کو ان کے رہنماؤں نے یہ ہدایات جاری کیں کہ وہ ایک ٹیک وقت بیٹکھ معاہدے کا فارمولا تیار کریں، راولپنڈی سے دونوں رہنما اور ان کے وفود لاہور گئے جہاں صدر داؤد کو شایم مار باغ میں پر جوش استقبالیہ دیا گیا۔ دونوں جانبین کے وفود آدھی رات تک کام کرتے تھے تاکہ ایک تحریری فارمولا تیار کر سکیں۔ بالآخر یہ فارمولا مکمل ہو گیا۔ اس میں اعلان کیا گیا تھا کہ افغانستان ڈیورنڈ لائن کو بین الاقوامی سرحد تسلیم کرتا ہے اور اسی وقت پاکستان نیپ کے رہنماؤں کو آزاد کر کے، عام معافی دے گا۔ مسٹر عزیز احمد جو اس وقت وزیر مملکت برائے امور خارجہ تھے، اس تحریری فارمولے کو میرے پاس لاہور کے کورمنٹ ہاؤس میں لائے تاکہ اس کی حتمی منظوری دی جاسکے۔ میں نے فارمولا کا مطالعہ کیا اور کہا ”میں مطمئن ہوں“ اس اطمینان کا اظہار صدر داؤد نے کیا تھا۔ اب ایک رسمی تقریب میں اس معاہدے پر کابل میں دستخط ہونے تھے۔ اس کے بعد کے واقعات نے کابل کے دورے کی راہ میں رکاوٹیں کھڑی کر دیں۔

صدر داؤد مارچ ۱۹۷۸ء کے اوائل میں پھر پاکستان آئے تاہم اس وقت وہ برتری کے اعتماد کا مظاہرہ کر رہے تھے اگست ۱۹۷۶ء میں انہوں نے جس پاکستان کا دورہ کیا، یہ پاکستان اس سے مختلف تھا۔ وقت ان کی حمایت میں جا چکا تھا۔ ولی خان کی حمایت حاصل کرنے کے مشتاق، جو میرے اور پی پی پی کے خلاف تصادم کا کوئی موقعہ فروگزاشت نہ کرتے تھے، ولی خان اور دوسروں کو دوسری طرف تباہی کے بل پر ہی رہا کر دیا۔ اور سیاسی اختلاف باقی رہا۔ اس نئی صورت حال نے اس حل نہ ہونے والے اختلاف سے، بلوچ اور پشتون رہنماؤں کو مسلح کر دیا کہ وہ اسے اپنے مفادات کے لئے استعمال کر سکیں۔ ستم ظریفی یہ ہے کہ فوجی حکومت نے معاہدے

کے ڈرافٹ کو ایک گروپ نے والے مقصد کے لئے ترک کر دیا کہ اس طرح بینظ فوجی ٹولے کے ساتھ تعاون نہیں کرے گی۔ اس طرح ان کے سر آوردہ ہونے والوں کی سیاسی خودکشی ہو جائے گی۔

جنرل ضیاء الحق کی صدر داؤد سے دو ملاقاتیں ہو چکی ہیں، ایک کابل اور ایک پاکستان میں۔ چاہئے تو یہ تھا کہ اس معاہدے کے ڈرافٹ کو ایک باقاعدہ معاہدے کی صورت دینے کے لئے صدر داؤد کی حکومت کے خاتمے سے پہلے، امکانات پیدا کئے جاتے۔ افغانستان میں انقلاب نے فوجی حکومت کو مشکل اور متذبذب میں پھنسا دیا ہے، افغانستان میں جو عملی پیدا ہوئی ہے اس کے بارے میں پھر پڑین پر مبنی رد عمل ظاہر کیا جا رہا ہے۔ موجودہ افغانستان حکومت کو تسلیم کرنے میں فوجی حکومت نے غیر ضروری تاخیر کر دی ہے۔ غیر دانشمند انداز یہ ہے کہ مطالبہ انہوں نے اپنے کنٹرولڈ پریس میں افغانستان کے انقلاب پر حملوں کی اجازت دیدی ہے اور اس کے ساتھ ہی لین اسے کے مسخروں کے معاندانہ بیانات شائع کئے جا رہے ہیں۔ بدیہیہ کے فقدان کی وجہ سے، یہ فوج کے ذریعے حکومت کا اچانک تختہ الٹنا اور افغانستان میں جو انقلاب آیا ہے اس کے فرق اور اثرات کو سمجھنے میں ناکام رہے ہیں۔

اگرچہ انقلاب کی سربراہی اور سرکردگی مسلح افواج نے ہی کی تھی لیکن نئی حکومت پر سولین پارٹی کے لیڈروں کا کنٹرول ہے جو سیاست کا فن جانتے ہیں۔ موجودہ افغان حکومت، سیاسی سطح پر اپنے آپ کو نمایاں کرنے کے لئے پاکستان کی موجودہ حکومت کی کمزوریوں اور غلطیوں کو منظر سے اوجھل نہ ہونے دے گی۔ وہ پرندہ جس کا نام اول بدل تھا، وہ بجز سے اڑ گیا ہے۔ فوجی حکومت ایک دن سخت باتیں کرتی ہے اور دوسرے دن نرم، ایسی توقع رکھی جاتی چاہئے کیونکہ یہ حکومت کسی منصوبے کے بغیر چل رہی ہے۔ اس وقت بہت ہی احتیاط سے قدم اٹھانے کی ضرورت ہے کیونکہ ڈیورنڈ لائن کے دونوں طرف مسلمان ہی بستے ہیں۔ یہ سلسلہ چلتا رہا تو اس کی گونج اور دھمک ایران اور بھارت میں سنی جائے گی۔ کیونکہ ایران اور بھارت میں بھی مسلمان رہتے ہیں۔ غلط اور ناقص اقدام، جو غیر مؤثر اور ناقص فیصلوں کے تحت اٹھائے جائیں گے ان سے بالکل موسیقی ایک سمفنی میں بھی تبدیل ہو سکتی ہے۔

افغانستان اور پاکستان کے تعلقات پھر سے پیچھے لوٹ کر شروع ہو رہے ہیں، یہ اس لئے اور بھی زیادہ المناک ہے کہ کشیدہ تعلقات کا باب ختم ہونے والا تھا۔ جب جنرل کابل گیا تو وہ آج کے مقابلے میں، خارجہ امور اور حکومت کے ہر میں زیادہ مبتدی تھا، پیشہ ور افراد ایک طرف کھڑے ہو کر اسے بد باطن افغان سفارت کار کے ساتھ سفارتی ڈیوٹیل کے اکھاڑے میں داخل

ہوتے دیکھتے رہے۔ اس کے نتیجے کی پہلے سے ہیشگونٹی ہو چکی تھی۔ قسمت اپنی سادیت کا کھیل اپنے ہی شوخ و شنگ انداز میں کھیلتی ہے۔ جون ۱۹۷۹ کو کابل روانہ سے پہلے پشاور میں ایک کانفرنس میں نے اس مقصد کے لئے بلوائی کی اپنی حکومت کے سر آوردہ افراد کے ان خیالات سے آگاہ ہو سکوں جو پاکستان افغانستان کے تعلقات کے مستقبل سے وابستہ تھے۔ چیف آف آرمی سٹاف نے اس موقع پر کہا کہ کانفرنس کا حتمی وقت اسلئے ضائع نہیں کر سکا کہ تھوڑا علم بہت خطرناک ہوتا ہے اسے اپنی مختصر اور مؤدب مقدمہ کو یہ کہتے ہوئے ختم کیا کہ وہ جانتا ہے کہ افغانستان کے ساتھ ہونے والے مذاکرات میں، میرے (بھٹو) کام سے بہتر باتوں میں نہیں ہو سکتے۔ ہاں بلاشبہ، ”تھوڑا علم ایک خطرناک چیز ہے لیکن شیکسپیر کو کون اعتماد کرتا ہے؟“

(ب) بھارت پاکستان تعلقات

اس ضمن میں بہت سے سوال جائز اور حقیقی ہیں، میں یہ پوچھنا چاہوں گا کہ برطانیہ کے وزیر اعظم کے اعزاز میں یوسفیات دی گئی۔ اس میں بھارت کو ایک پیارا اور عظیم ہمسایہ کہا گیا۔ یا پھر یہ کہ جنرل ضیاء نے ”کچھ دو اور لو“ کی ترکیب، کشمیر کا مسئلہ حل کرنے کے لئے، ایسے چھوٹے اور جھگمکے ہوئے انداز میں اپنائی ہے۔ بھارت کی سلامتی کو سلال ڈیم اور راجستھان نہر کے معاہدوں سے کیا خطرہ ہے؟ راجستھان نہر ایک کثیر المقاصد منصوبہ ہے، مزید برآں چونکہ یہ آبپاشی کا ایک منصوبہ ہے یہ فوجی قلعہ بندی نہیں ہے، جس سے پاکستان کی مضبوطی اور بی آر پی نہر بھی زور میں آتی ہے۔ راجستھان نہر ایک جدید مینڈوٹ لائن ہے۔ اگر میری حکومت چار سالوں تک ایران کی حکومت کو یہ ترغیب دے سکتی ہے کہ وہ بھارت کو اس منصوبے کے لئے قرضہ نہ دے، تو یہ فوجی حکومت بھی ایسا کر سکتی تھی اگر وہ اس مسئلے کو سنجیدگی سے لیتی۔

پاکستان اور بھارت کو جس اہم ترین مسئلے کا سامنا ہے وہ مسئلہ کشمیر ہے۔ شملہ میں مناسب اقدامات کئے گئے تھے۔ پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ کن میکانیسمین مقاصد کے لئے، کنٹرولڈ پریس بھی اور اس کے ان بے بودہ صحافیوں نے، جو موجودہ قومی حکومت کے لئے محکمہ اطلاعات اور نشریات میں کام کرتے ہیں، شملہ معاہدے میں ایک خفیہ شق کا شوشہ کیوں چھوڑا۔ موجودہ حکومت اچھی طرح جانتی ہے کہ ایسی کوئی خفیہ شق وجود نہیں رکھتی۔ اسکے باوجود اس جھوٹ اور فریب کی تظہیر جاری ہے۔ مقصد بالکل واضح ہے۔ دراصل یوں مشروط اطاعت کی راہ بنانے کے لئے میرے کندھوں پر بندوقی رکھ کر چلائی جا رہی ہے۔ اگر شملہ معاہدہ میں کوئی خفیہ شق

ہوتی تو وہ بہت عرصہ پہلے عوام کے سامنے آچکی ہوتی۔ اندرا کانہ جی اسے انتخابی مہم میں ظاہر کر دیتی۔ جنتا حکومت برسرِ اقتدار آنے کے بعد اسے مسیحا کے سامنے رکھ دیتی۔ اگر کوئی خفیہ شق واقعی وجود رکھتی ہے تو پھر ۵ جولائی ۱۹۷۷ء کو حکومت کا جبری تختہ الٹنے والی حکومت نے اس کو کیوں ظاہر نہ کیا۔

اس وقت اور اس کے فوری بعد بہت سی کہانیاں بنائی گئی تھیں تب وہ اتنے شرمیلے کیوں تھے کہ یہ بات نہ بتا سکے، حتیٰ کہ مسٹر واجپائی جب فروری ۱۹۷۸ء میں پاکستان آئے تو انہوں نے بھی ایسا کوئی بوگس انکشاف نہ کیا۔ کوئی بہیم بیان دینے کے بجائے وہ اس خفیہ معاہدے کا متن پیش کر کے اعلان کر سکتے تھے ”سوری حضرات، بھارت اور پاکستان، ہماری سابقہ حکومتوں کے حوالے سے ایک خفیہ معاہدے میں بندے ہوئے ہیں، جسے میں آپ اور دنیا کے سامنے پیش کرتا ہوں کہ اسے قبول کر لیا جائے۔“ مسٹر واجپائی نے اس قسم کی کوئی بات نہ بھی بلکہ انہوں نے اس خفیہ شق کے متعلق اشارہ تک نہ کیا۔ کیونکہ ایسی شق موجود ہی نہیں ہے۔ اس کے برعکس انہوں نے شملہ معاہدہ، جیسا کہ موجود ہے اور وجود رکھتا رہا ہے اور اس کے وجود کا سلسلہ اسی کھلی شکل میں جاری ہے جس طرح جون ۱۹۷۲ء میں طے پایا تھا اس کا وجود برقرار رکھنے پر زور دیا۔ اس میں کوئی کمی بیشی نہیں ہوئی۔

اس جھوٹ اور شر کا پروہیگنڈہ دو اہم وجوہات کی بنا پر کیا جاتا ہے۔ اولاً یہ کہ کسی خفیہ معاہدے کے عدم وجود کے تحت کشمیر کا تنازعہ اقوام متحدہ میں اٹھایا نہیں جاسکتا تاہم سیز فائر لائن کی اصطلاح شملہ معاہدے میں لائن آف کنٹرول، میں تبدیل کر دی گئی تھی۔ شملہ معاہدے میں کوئی ایسی چیز نہیں ہے جو پاکستان کو تنازعہ کشمیر کو اقوام متحدہ میں لے جانے کی راہ میں رکاوٹ بن سکے۔ کشمیر کا تنازعہ تیس برسوں سے اقوام متحدہ کے سامنے ہے۔ اس کے باوجود یہ مسئلہ حل نہیں ہوا۔ پی پی پی کی حکومت چاہتی تھی کہ اقوام متحدہ کی طرف رجوع کرنے سے پہلے تمام دو طرفہ تعلقات کو پوری طرح بروئے کار لائے۔ اس حوالے سے پی پی پی کے دو طرفہ تعلقات کے نظریے کی بھی تصدیق ہو جاتی ہے۔

کشمیر کا تنازعہ اب بھی اقوام متحدہ کے ایجنڈے پر موجود ہے۔ اگر اقوام متحدہ کے راستے کو شملہ معاہدے سے بند کیا جاتا ہے تو پھر اس مسئلے کو اقوام متحدہ سے واپس لیا جانا اطاعت گزاروں سے خوشنودی حاصل کرنے والوں کے غبارے سے تو اس حقیقت سے ہی ہوا مکمل جاتی ہے کہ پی پی پی کی حکومت تھی جس نے کشمیر کا تنازعہ اقوام متحدہ کے ایجنڈے پر برقرار اور بحال رکھا۔ اقوام متحدہ اب بھی تنازعہ لائن کی نگرانی کرتی ہے۔ اس کے تختہ زبہت تھوڑے ہیں۔ اگر تنازعہ کشمیر کو شملہ معاہدے کے ذریعے ختم کیا جاتا تو اقوام متحدہ کے فوجی دستے فوراً ہٹا

لئے جاتے۔ پاکستان سینیٹر پارٹی کی حکومت کے دور میں ہماری حکومت کو اتنی جرأت نہیں ہوتی تھی کہ وہ اقوام متحدہ سے یہ درخواست کر سکے کہ متنازعہ لائن سے اقوام متحدہ کے دستے ہٹائے جائیں۔ ۱۹۷۶ء کے موسم سرما میں ڈنمارک کے وزیر دفاع نے ڈینش فوجی دستوں کا معاہدہ کیا تھا جو اقوام متحدہ کی طرف سے کشمیر کی دونوں اطراف میں تعینات ہیں۔

بہر حال، حال ہی میں یہ رپورٹ دی گئی ہے کہ بھارتی وزارت خارجہ کے ایک ترجمان نے کہ صحیح طور پر وزارت خارجہ کے ایک ترجمان، نے کہا ہے کہ جب جنرل بھارت آئے گا تو بھارت انہیں اقوام متحدہ کے مبصروں کو ہٹانے کے لئے کہے گا۔ بھارت کی وزارت خارجہ کے ترجمان نے کہا کہ اقوام متحدہ کے فوجی دستوں کا اغلا پروان پڑھتے تعلقات کی روشنی میں ہو گا۔ جہاں تک ”سیز فائر“ اور کنٹرول لائن کا تعلق ہے تو دونوں کا ایک ہی مفہوم ہے۔ سیز فائر لائن۔ کنٹرول کرنے کی ایک لائن ہوتی ہے اور کنٹرول لائن۔ سیز فائر لائن ہوتی ہے۔ یہ باہم گر تبدیل ہونے والی اصطلاحات ہیں۔ سیز فائر لائن کی اصطلاح کو کنٹرول لائن کی اصطلاح میں تبدیل کر کوئی اعتراض نہیں کیا گیا تھا۔ گذشتہ پچیس برسوں سے سیز فائر لائن کی اصطلاح ایسی شدت اور فراوانی سے استعمال ہوتی ہے کہ یہ اپنی اہمیت کھو بیٹھی ہے۔ اسے لائن آف کنٹرول میں تبدیل کر کے اس کی اہمیت برقرار کی گئی اور متحرک بنایا گیا ہے۔ اس سے بڑی زیادتی بنیادی فرائض کے ساتھ نہیں کی جاسکتی کہ قوم کو کنٹرولڈ پریس کے ذریعے ایسی گمراہ کن تشہیحات کر کے دی جائیں جو ضرر رساں ہوں اور جو چیزیں پاکستان کے بہتر مفاد میں ہوں ان کی اہمیت کم کی جائے۔

پاکستان اور بھارت کے مابین ”فروغ پندیر تعلقات“ ۵ جولائی ۱۹۷۷ء کے بعد سے اس طرح ”فروغ“ پار ہے ہیں،

- (۱) مسٹر واجپائی کا دورہ پاکستان۔
- (۲) مسٹر آغا شاہی کا دورہ بھارت۔
- (۳) سلال ڈیم معاہدہ
- (۴) فریڈ مشن، ممبرانٹ مفاہمت۔
- (۵) کلچرل اور سپورٹس مشن وغیرہ۔

۱۷ اگست ۱۹۷۸ء کو لیپیا کے وائس پریزیڈنٹ سے ملنے کے بعد، راولپنڈی ایئرپورٹ پر صحافیوں سے غیر رسمی گفتگو کرتے ہوئے، چیف مارشل لائیڈ منسٹر نے لیپیا کے وائس پریزیڈنٹ کے ان ریمارکس پر خوشیاں منائیں کہ دونوں ملکوں کے اچھے تعلقات شخصیات کی وجہ نہیں تھے۔ لیکن دوسرے ہی حقائق میں، جب ان کی توجہ اس اعتراض کی طرف مبذول کی گئی، جو

بھارت کے وزیر اعظم نے بھی ایسی ہی وجوہات کی بنا پر اس وقت اعتراض کیا جب حال ہی میں وہ سری نگر گئے تھے۔ اس نے کہا کہ پورا جموں اور کشمیر بھارت کا جزو ہے، بہر حال بلاخر جب چیف مارشل لائیڈ منسٹر شری کو یہ موقع نصیب ہوا کہ وہ تمام غلط فہمیان دور کر سکیں، اور لوگوں کو بتا سکیں کہ پاکستان بھی بھارتی مداخلت کو برداشت نہیں کرے گا۔ اور اس معاملے کا بھارت سے کوئی تعلق نہیں تو ایسا کرنے کے بجائے انہوں نے عذر لنگ کے ذریعے سچائی سے غداری کا۔ بھارت اور پاکستان کا تنازعہ کسی رقص سے حل نہ ہو سکے گا۔

(ج) غیر جانبدار کانفرنس

کیا غیر جانبدار ملکوں کی تعارفی کانفرنس منعقدہ بلخام میں شرکت کرنے سے پہلے تمام عوامل اور امور کا جائزہ لے کر صحیح فیصلہ کیا گیا؟ پاکستان کو غیر جانبدار ملکوں کی اس مجلس اور اقوام میں دوسرے درجے کے شہری کی حیثیت دے کر پاکستان کی توہین کرائی گئی۔ ان پیچیدگیوں اور الجھاؤں کا پہلے سے اندازہ لگاتے ہوئے، میری حکومت نے کئی دوست غیر جانبدار ملکوں کی اس پیش کش کو قبول نہ کیا تھا کہ وہ پاکستان کو کولمبو میں منعقدہ اگست ۱۹۶۶ کانفرنس میں شرکت کی ذمہ داری لیتے ہیں جب میں جنوری ۱۹۶۶ میں سری لنکا گیا تو وزیر اعظم بندرانائیک نے استفسار کیا کہ میں کانفرنس میں شرکت سے کیوں ہچکچاتا ہوں جبکہ پاکستان کے کئی غیر جانبدار دوست ملک یہ چاہتے ہیں کہ پاکستان بطور ”بصر“ اس میں شرکت کرے۔ میں نے مادام بندرانائیک کو بتایا کہ اگر اگست ۱۹۶۶ کی کانفرنس میں شرکت کی دعوت دی گئی تو بھی پاکستان بڑے ادب سے یہ دعوت قبول نہیں کرے گا۔ کیونکہ پاکستان ایک جانبدار ریاست ہے۔

پاکستان سینٹو کا طرفدار ہے نیٹو کی تاریخ میں پہلی بار ایسا ہوا ہے کہ پاکستان نے سینٹو کی فوجی مشقوں میں حصہ لیا جو سینٹو کے زیر اثر اور ذمہ سے باہر کے علاقے ہیں یہ مشقیں سکاٹ لینڈ میں ہوئیں تھیں۔ پاکستان کے لئے یہ کس قدر پیچیدہ امر ہے ایک طرف تو پاکستان نیٹو اور سینٹو کے ساتھ فوجی مشقیں کرے جو اس سے پہلے کبھی نہ ہوئی تھیں، اپنے جانبدار کردار کو مضبوط کرے اور اسی وقت، جولائی ۱۹۶۸ کی غیر جانبدار تحریک کانفرنس میں ایک مبصر کی حیثیت سے بھی حصہ لے۔ یہ ایک بنیادی تضاد ہے جسے کسی طرح دور نہیں کیا جاسکتا۔

یوگو سلاویہ اور رومانیہ کی یہ مثالیں کہ وہ ان کانفرنسوں میں بطور مبصر حصہ لیتا ہے۔ پاکستان کی شرکت کے لئے کوئی جواز مہیا نہیں کرتی ہیں اور نہ پاکستان کے لئے یہ مناسب ہی ہیں۔ یوگو سلاویہ اور رومانیہ کے کسی ایک بھی غیر جانبدار ملک کے ساتھ علاقائی تنازعہ نہیں ہے۔

بھارتی وزیر خارجہ نے شاہراہ قراقرم کے متعلق کیا تھا تو جنرل نے بین الحکومتی تعلقات میں شخصیات کے عناصر کو شامل کرتے ہوئے کہا کہ وہ ذاتی طور پر مسٹر واجپائی کا بے حد احترام کرتے ہیں، اس لئے وہ اب اس پر کوئی رائے نہیں دیں گے۔

وہ بے حد احترام جو چیف مارشل لائیڈ منسٹر شری کے دل میں ایک جنوبی جن ستمی لیڈر کے لئے کے پیدا ہوا، اسے اس پہلی ملاقات کا نتیجہ قرار نہیں دیا جاسکتا۔ جوان دونوں کے مابین اسلام آباد میں گذشتہ فروری میں صرف دونوں میں ہوئی تھی۔ عام طور پر بے حد احترام تو خاصا وقت گزرنے کے بعد پیدا ہوتا ہے یہ کوئی راز نہیں ہے کہ ایک زمانے میں اٹل بھاری واجپائی ہندوستان کے مسلمانوں کا کٹر دشمن تھا، وہ مسلمانوں کا ہر ایک دشمن تھا۔ اس کی پارٹی کے فرقہ وارانہ اغراض و مقاصد، جنہیں مسٹر واجپائی متعدد بار دہرائے اور ہوا دیتے رہے یہ سمجھ کر ہندو مذہب اور برتری کو برصغیر پر مسلط کیا جائے۔ عوامی زندگی میں اس نے جو مقام بنایا وہ کفر مسلم دشمنی کی وجہ سے بنا۔

چیف مارشل لائیڈ منسٹر شری اپنی دانشمندی کا خود مالک ہے۔ لیکن اگر لیبیا کے نائب صدر کے رہارکس کا حوالہ تصدیق و توثیق کے ساتھ دیا گیا تھا تو پھر کوئی ایسا جواز نہ تھا کہ شاہراہ قراقرم جیسے اہم مسئلے پر جواب دیتے ہوئے ذاتی عنصر کو شامل کیا جاتا۔ جبکہ کسی بھی ہچکچاہٹ کے بغیر، چیف مارشل لائیڈ منسٹر شری کو اس کا واضح اعلان کرنا چاہئے تھا کہ بھارت کا سرے سے اس معاملے کے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔ شاہراہ قراقرم جیسے امور، جو اعلیٰ قومی مفاد سے تعلق رکھتے ہیں تو وہ بھارت کے اہانت آمیز سخت مداخلت کو یہ کہتے ہوئے ٹھک لیتے ہیں کہ وہ اس پر اس لئے کوئی رائے نہیں دیں گے کہ وہ مسٹر واجپائی کا بے حد احترام کرتے ہیں۔ اس کے برعکس جب میرے قتل کو روکنے کے لئے انہیں کہا جاتا ہے تو وہ جھنجھٹے چلائے لگتے ہیں کہ یہ داخلی امور میں خارجی مداخلت ہے۔

دو ماہ پہلے، جب سے شاہراہ قراقرم کا اقتناح ہوا ہے، اس وقت سے بھارت اس شاہراہ کی ”غیر قانونی“ تعمیر پر جھنجھٹے ہوئے احتجاج کر رہا ہے۔ لوک سبھا میں یہ تجویز پیش کی گئی کہ اس شاہراہ کی تعمیر کو سانسے رکھتے ہوئے، بھارتی وزیر خارجہ کو اپنا دورہ چین منسوخ کر دینا چاہئے جو اس سال اکتوبر میں طے پاچکا تھا۔ بھارتی وزیر خارجہ نے لوک سبھا کے ارکان کو یقین دلایا کہ چین کے دورے کے دوران وہ یقیناً یہ مسئلہ چینی حکومت کے سامنے اٹھائیں گے کہ اس شاہراہ کی ”غیر قانونی“ تعمیر جو پاکستان اور چین کو ملاتی ہے، بھارت کے کشمیر کے غیر قانونی مقبوضہ علاقے میں کی گئی ہے۔

پاکستان کے دو اہم اور بارسوخ غیر جانبدار ملکوں کے ساتھ انتہائی سنگین متازعات موجود ہیں۔

پاکستان کے یہ دونوں ہمسائے، غیر جانبدار کانفرنسوں میں دوسرے ملکوں کے رحم و کرم پر، محض مبصر کی حیثیت سے حصہ نہیں لیتے بلکہ بانی ارکان کی حیثیت سے شرکت کرتے ہیں، ایک مبصر کی حیثیت سے ان کانفرنسوں میں حصہ لے کر پاکستان اپنے آپ کو گویا سروے میں رکھ دے گا کہ اس کا مغز توڑ دیا جائے۔ عدم مساوات کی حیثیت سے اسے نقصان پہنچے گا۔ ہمارے ہمسائے اس خاندان کے جائز ارکان ہیں۔ ایسے مسائل کا اطلاقی یوگوسلاویہ اور رومانیہ پر نہیں ہوتا۔ وہ بڑی آسانی سے بطور مبصر اس میں شرکت کر سکتے ہیں۔ یہ یورپی ممالک ہیں جو بہت سے غیر جانبدار ملکوں کو مدد دیا تعاون فراہم کرتے ہیں۔ ان کا تعلق یکسر مختلف درجہ بندی سے ہے۔ ان کے متوازی پاکستان کے لئے اچھے جذبات نہیں رکھتے۔

اس سے بھی اہم بات یہ ہے کہ یوگوسلاویہ اور رومانیہ نے اسلامی سربراہی کانفرنس میں بھارت کی زبردستی شرکت پر کوئی اعتراض نہیں کیا۔ یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ بھارت بھی اسلامی سربراہی کانفرنس رباط میں زبردستی شریک ہوا تھا۔ اسلامی سربراہی کانفرنس میں شرکت کے لئے اس نے جواز کے لئے اپنی سات کروڑ مسلم آبادی کی دلیل دی۔ یہ خیال کیا جا رہا تھا کہ بھارت جیسا بڑا ملک اسلامی سربراہی کانفرنس میں شرکت کر کے، عرب / مسلم نصب العین کے زیادہ قریب اور اسرائیل سے دور ہو جائے گا۔ خواہ کوئی بھی مجبوری ہو، بھارت بہر حال پہلی اسلامی سربراہی کانفرنس میں تقریباً شریک ہو گیا۔ اگرچہ، سیکولر بھارت، ایک ہندو ریاست ہے، اگر جانبدار پاکستان غیر جانبدار کانفرنس میں شرکت کر سکتا ہے تو کیا پاکستان اس قابل ہو گا کہ ہندو بھارت کو اعلیٰ اسلامی سربراہی کانفرنس میں حصہ لینے سے روک سکے؟ ایک بار جب اس بنیادی معیار سے سمجھوتہ کر لیا گیا تو پھر اس کی کوئی حد نہ رہے گی۔

ہر حکومت اپنی تاریخ کی اسیر ہے۔ اسی طرح یوگوسلاویہ اور رومانیہ پر ان باتوں کا اطلاق نہیں ہوتا۔ نہ ہی پریمال اور ترکی پر۔ پریمال اب کسی غیر جانبدار کے ساتھ کسی متازعے میں ملوث نہیں ہے۔ اگر وہ گواہ متازعہ برقرار رکھتا تو پھر کسی غیر جانبدار کانفرنس میں حصہ نہ لیتا۔ اگر اس نے انکولا اور موزمبیق کو خالی نہ کیا ہوتا تو بھی وہ شرکت نہ کرتا۔ ترکی کی تاریخ کسی بھی شعبے کے بغیر انتہائی شاندار ہے۔ بھارت نے پاکستان کو دوسرے درجے کے شہری کی حیثیت سے کانفرنس میں حصہ لینے کی اجازت دیدی۔ ایک تو اس طرح اس نے پاکستان کو نکو بنا دیا دوسرے اس نے اعلیٰ اسلامی سربراہی کانفرنس میں بھارت کی شرکت کے لئے مثال قائم کر دی۔ یوں بھارت نے ایک تیسرے دو شکار کر لئے۔

قائد اعظم کی بنیادی دلیل یہ تھی کہ انڈین نیشنل کانگریس مسلم کاذبی ترجائی کرنے کی اہلیت نہیں رکھتی۔ گاندھی نے قائد اعظم کے اس تھیسس کو مسترد کر دیا۔ اس کی شدید مخالفت کی گئی۔ اس بنیادی اختلاف اور فرق کی وجہ سے کئی بار رخنے پڑے اور بات چیت میں تعطل پیدا ہوا۔ بالآخر ایک تلخ جدوجہد کے بعد، قائد اعظم کے نظریے کی کامرانی ہوئی اور اس نے پاکستان کی تخلیق کی۔ یوں دو قومی نظریے کے مطابق بھارت مسلمانوں کی جائز خواہشات کی ترجائی کی اہلیت نہیں رکھتا۔

جنرل یحییٰ خان جو اس وقت چیف مارشل لائیڈ منسٹر تھا، جب اسے بعد از وقت اپنی انتہائی شدید ترین غلطی کا احساس ہوا کہ وہ رباط میں پہلی اسلامی سربراہی کانفرنس میں بھارت کی شرکت و موجودگی پر تقریباً رضامندی کا اظہار کر چکا ہے تو اس نے اپنے آپ کو کیسٹ ہاؤس میں بند کر لیا۔ آنسوؤں سے پھلکتی ہوئی آنکھوں سے اس نے شہنشاہ ایران سعودی عرب کے شاہ فیصل اور مراکو کے شاہ حسن سے درخواست کی کہ وہ اسے بچالیں۔ پاکستان کے وفد کے دوسرے ممتاز ارکان نے اپنے غم غرق کرنے کے لئے ٹائٹ کلب کا انتخاب کیا، مراکو میں پاکستان کے سفیر اکبر طیب جی میزبان تھے۔ ان کے مہمانوں میں آغا شاہی اور مہر جنرل عمر، یحییٰ خان کے دست راست شامل تھے۔ ٹائٹ کلب میں جنرل عمر نے ازراہ مذاق آغا شاہی کا تعارف بطور وزیر خارجہ، پاکستان کرایا، شاہی نے عمر سے کہا کہ ایسا مذاق نہ کیا جائے، وقت گزرنے کے بعد، یہ واحد مذاق نہیں ہے جو حقیقت بن گیا ہو۔

جعلی پاسپورٹ پر سفر کرنا باعث ویروقار نہیں ہوتا اور نہ ہی کسی بین الاقوامی کانفرنس میں جعلی پاسپورٹ سے ہی شرکت کرنی چاہئے۔ یہ ویسے ہی ضروری نہیں ہوتا کہ ہر جگہ عقبی دروازے سے ہی اندر جایا جائے۔ اگر غیر جانبدار تحریک اس حد تک اہم ہے اور ہم آزاد خارجہ پالیسی کے حوالے سے اپنی شناخت کرانے کے لئے بہت فکر مند ہیں تو اس کا پروکار طریقہ یہ ہے کہ سینٹر کو چھوڑ دیا جائے۔ ایک حقیقی سے غیر جانبدار ریاست کی حیثیت غیر جانبدار تحریک کی کانفرنس میں پورے حصے دار کی حیثیت سے سامنے کے دروازے سے سرواچا کر کے داخل ہوا جائے۔ یہ ”پہنچی اور نہ بھی ہو“ نہ پھلکی نہ گوشٹ، ”پہنچی آبادی“ کی اس شرکت نے ہمیں طوفان میں لا بھنسا پایا ہے۔ جس کے نتیجے میں غیر جانبدار بھی ہمیں پسند نہیں کرتے اور جانبدار اور سوشلسٹ ممالک بھی ہم پر اعتماد رکھ رہے ہیں،

(د) نیو کلیری پروسیسینگ پلانٹ

تین برسوں کے اور شدید سخت مذاکرات کے بعد مارچ ۱۹۷۶ء میں فرانس اور پاکستان کے مابین نیو کلیری پروسیسینگ پلانٹ کے معاہدے پر دستخط ہوئے۔ فرانس تمام تحفظات کے بارے میں قطعی مطمئن تھا۔ اس معاہدے کی تکمیل پاکستان کی طرف سے سب سے پہلی حکومت نے اور صدر گیلدیاں نے حکومت فرانس کی طرف سے کی تھی۔ بین الاقوامی ایٹم انرجی کمیشن وی آنا نے اس معاہدے کی توثیق کی، کمیشن میں امریکہ کے ترجمان نے اس کی توثیق کے حق میں ووٹ دیا۔ بین الاقوامی ایٹم انرجی کمیشن اس وقت تک کبھی اس کی توثیق نہ کر سکا جب تک کہ اس کے تمام تحفظات کے متعلق پوری طرح مطمئن نہ ہوتا۔ اگست ۱۹۷۶ء میں امریکہ کی جوابی تجویز کو میں نے مسترد کر دیا۔ اس موقع پر فرانسیسی حکومت نے امریکی مداخلت پر برہمی کا اظہار کیا۔ ۵ جولائی ۱۹۷۷ء تک فرانس نے اصلی معاہدے کی حیثیت کو مسلسل برقرار رکھا۔

مسلح افواج کو نگرانی کنڈوں پر رکھے پاکستانی عوام کو چودہ ماہ تک ترسانے اور مڑپانے کے بعد، بالآخر جنرل ضیاء نے ۲۳ اگست ۱۹۷۸ء کو راولپنڈی میں اپنی پریس کانفرنس میں اس کا ذکر کیا کہ اُسے فرانس کے صدر کی طرف سے ایک نہایت شائستہ خط ملا ہے لیکن وہ مقصد پورا نہیں کرتا۔ اس نے ڈراتے ہوئے یہ اضافہ کیا کہ فرانس اس معاہدے میں باہمی مفاہمت کے ذریعے

ترمیم کا خواہاں ہے۔ اور یہ ہے اصل بات۔ فرانس کے صدر نے یہ پیش کش منہ دکھانے کے لئے کی لیکن پلوٹونیم عہدہ کرنے کی اہلیت رکھنے والے پلانٹ کے حصے کو ختم کر دیا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ طویل ترین داستانوں کا سلسلہ ختم ہو گیا۔ اس حقیقت کو تبدیل کر کے فرانس کی حکومت نے --- Rebus sic stantibus کے اصول کی پامالی کی ہے۔ فرانسیسی حکومت نے یہ معاہدہ ایک سول حکومت سے کیا تھا نہ کہ ایک فوجی اور آمرانہ حکومت سے۔ یہ معاہدہ ایک منتخب وزیر اعظم سے ہوا تھا جو بین الاقوامی مرتبے کا مالک تھا۔ جسے فرانس کے تین صدور کا احترام اور اعتماد حاصل تھا۔ ڈی کال، پومپدو اور دستان۔ یہ معاہدہ ایک ناقابل اعتماد چیف مارشل لائیو منسٹر نے نہیں کیا تھا۔ جو اپنے ہی عوام کے ساتھ کئے ہوئے وعدوں کو توڑ رہا ہے۔ ان حالات و واقعات کے در آنے کا اس وقت قطعاً اندازہ نہیں کیا گیا تھا۔ جب میری حکومت کا تختہ الٹنے کی سازش بڑی جلدت سے تیار کی جارہی تھی۔ اس وقت تو ”بعد میں دیکھا جائے گا“ کا رویہ اپنایا گیا تھا۔ لیکن قوم کی زندگی

اور موت سے تعلق رکھنے والا یہ موضوع ایسی لاپرواہی اور سنگدلی کا مستحق نہیں تھا۔ یہ کبھی فراموش نہ کرنا چاہئے کہ سیاست کی اپنی متحرک قوت ہوتی ہے اب سفاری میں سقوں کا سامنا ایک بڑی طاقت، شکاریوں سے ہو گیا اور انہوں نے ان کے لئے چاہ کن راجہ درہیش، مقولہ کہ ثابت کر دیا ہے۔

اس خاص نوعیت کی تبدیلیوں سے بچنے کے لئے یہ حکومت کیا تجویز کرتی ہے؟ زیادہ غیر ملکی امداد؟ اب سرکاری سطح پر یہ تسلیم کر لیا گیا ہے کہ نیو کلیری پروسیسینگ پلانٹ تو غیر ملکی مدد یا اس کے بغیر، ہم کھوپکے ہیں۔ بلا کسی تردید کے اب یہ صورت حال ہے کہ پاکستان کو غیر ملکوں کی مدد پر انحصار کرنا پڑے گا۔ ان کی طرف رخ کرنا ہو گا اب یہ ان کے رحم و کرم پر ہے جو نیو کلیر بلیک میلنگ کا پیشہ ورانہ فن جانتے ہیں بھارتی وزیر اعظم مرارچی ڈیسائی کے ساتھ نئی دہلی میں بات چیت کے بعد امریکی صدر کارٹر نے دھکی دی ہے کہ بھارتی وزیر اعظم کو ایک سخت خط بھیجا جائے گا۔ اس کے باوجود بھارت امریکہ سے یورانیئم حاصل کر رہا ہے اس درشت خط کی بھارتی وزیر اعظم کے نزدیک اس وقت تک کوئی اہمیت نہیں جب تک کہ بھارت امریکہ سے یورانیئم حاصل کر کے مزید ایٹمی دھماکہ کر سکتا ہے۔

اس کے برعکس جنرل ضیاء کو صدر دستان کے نہایت ”شائستہ خط“ سے بڑی سنفنی ہوتی ہے جس میں یہ بتایا گیا ہے کہ معاہدے پر تین برسوں سے مذاکرات ہوں گے۔ اس میں ترمیم کی جائے گی تاکہ پاکستان کو موجودہ نیو کلیر اہلیت اور استعداد کا اہل نہ بننے دیا جائے۔ فرانسیسی بڑی مہذب قوم ہے۔ دو برسوں سے انہوں نے اپنے سیاسی رہنماؤں کو پھانسیاں دینے کا سلسلہ ختم کیا ہوا ہے۔ یہ ایک فطری امر تھا کہ اس بنیادی معاہدے کو ختم کرنے کے لئے فرانسیسی صدر فرانسیسی کی مالا مال زبان سے نرم ترین الفاظ کا انتخاب کر کے جنرل ضیاء کو مطلع کرتے کہ اس خواہش اور پلانٹ کی فوری بندگی ہو گئی ہے۔ خطوط کی یہ بلاغت درر او سزا کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ لیکن احتجاجوں میں آجے ہوئے جنرل ضیاء نے زخموں پر اس طرح ٹک چھڑکا اور ان کی اہانت یہ کہتے ہوئے کی کہ وہ ”بہت شائستہ خط“ تھا۔ میرے ہم وطنو، دیکھو تو کیا تباہ ہوا ہے۔۔۔ عرب بحر کے خواب کے کس طرح پر فخر اڑا دئے گئے ہیں۔

میں پاکستان کے نیو کلیر پروگرام کے ساتھ اکتوبر ۱۹۵۸ء سے جولائی ۱۹۷۷ء تک عملی طور پر وابستہ رہا ہوں، یہ زمانہ انیس برسوں پر محیط ہے۔ یہ موضوع بطور وزیر خارجہ، بطور وزیر ایندھن، پاور اور قدرتی ذرائع اور وزیر پتھر اور پتھر کے حوالے سے میرے ساتھ براہ راست تعلق رکھتا رہا ہے۔ جبکہ میں نے پاکستان کے ایٹم انرجی کمیشن کا چارج

سنجھالا تو اس کی حیثیت ایک دفتر کے نام کے بورڈ سے زیادہ نہیں تھی۔ یہ محض ایک نام تھا۔ اپنے پورے اظہار اور مستحکم و آہنی ارادے کے ساتھ میں نے اپنی پوری طاقت و صلاحیت اس پر صرف کر دی کہ میرا ملک نیو کلیئر توانائی کا مالک بن سکے۔

میں نے سینکڑوں نوجوانوں کو نیو کلیئر سائنس میں تربیت حاصل کرنے کے لئے یورپ اور شمالی امریکہ بھیجا۔ میں نے ایڈورڈ سٹون کو یہ کمیشن دیا کہ وہ Pinstechn کی تعمیر کرے اور اس کا سنگ بنیاد اسلام آباد کے جنگل میں رکھا۔ میں نے مذاکرات کے ذریعے 5.1mw دس سرچ ریکٹر کا معاہدہ کیا جو Pinstechn میں نصب ہوا۔ وزیر خزانہ شعیب اور پلانٹ کمیشن کے ڈپٹی چیئرمین سید حسن کی شدید مخالفت کے باوجود میں کینیڈا سے ۱۳ اہم ڈبلیو حاصل کرنے میں کامیاب ہوا جو کراچی نیو کلیئر پاور پلانٹ بنا اور اس کی افتتاحی تقریب میں حصہ لیا۔ ۱۹۶۹ء کے وسط میں میں نے چشمہ نیو کلیئر پلانٹ کی منظوری دی اور بلاشبہ میں نے نیو کلیئر ری پروسیسنگ پلانٹ کے لئے فرانس سے ۱۹۶۹ء میں مذاکرات کئے اور معاہدہ مکمل کیا۔

میری اکلوتی جدوجہد اور کوشش کے نتیجے میں پاکستان میں نیو کلیئر اہمیت و استعداد کے لئے ڈھانچہ بنا اور اس پر کام شروع ہوا۔ ہمارے جیسے ترقی پذیر اور نادار ملک کے لئے یہ کوئی آسان کام نہیں تھا۔ جب میں نے اٹلک انرجی کمیشن پاکستان کا چارج سنبھالا تو پاکستان بھارت سے بیس برس پیچھے تھا۔ جب میں وزیر اعظم نہ رہا تو مجھے یقین ہے کہ پاکستان بھارت سے پانچ یا چھ سال پیچھے تھا۔ اگر نیو کلیئر پروگرام کے سلسلے میں داخلی مخالفت جو طاقتور وزیروں نے اور بیوروکریٹس نے کی، نہ ہوتی تو میں اس خلا کو اور بھی تنگ کر دیتا محض نیو کلیئر استعداد اور اہلیت حاصل کر کے کوئی ملک دولت مند نہیں بن جاتا۔ اگر یہی ایک ضرورت ہوتی تو ہر اوپیک ملک نیو کلیئر استعداد کا مالک بن جاتا۔ اصل ضرورت۔ انفراسٹرکچر ہوتا ہے۔

اسی وجہ سے، میں نے سب سے زیادہ ترجیح اس بات کو دی کہ ہزاروں نیو کلیئر سائنسدانوں کو غیر ملکوں میں تربیت دلوائی جائے۔ اب ہمارے پاس برہنہ پاور ہے کراچی میں ہمارے پاس نیو کلیئر پلانٹ ہے۔ اب ہمیں ضرورت تھی تو ایک نیو کلیئر ری پروسیسنگ پلانٹ کی، بھاری پانی اور یورانیئم اور نیوٹرون فیوژن پلانٹ کے لئے انتظامات ہو چکے تھے۔ جب میں حکومت چھوڑ کر اس موت کی کوٹھڑی میں آیا ہوں تو ہم مکمل نیو کلیئر استعداد حاصل کرنے کی دہلیز تک پہنچ چکے تھے عیسائی اور ہندو تہذیبیں اس اہلیت اور استعداد کی مالک بن چکی ہیں کیونست طاقتوں کے قبضے میں بھی یہ قدرت ہے۔ صرف اسلامی تہذیب ہی اس سے محروم تھی، لیکن یہ حیثیت بھی تبدیل ہونے والی تھی۔

امریکہ کے وزیر خارجہ ڈاکٹر ہنری کیسنجر، ایک شاندار ذہن کے مالک ہیں۔ انہوں نے مجھے کہا کہ میں یہ کہتے ہوئے کہ پاکستان کو ری پروسیسنگ پلانٹ کی ضرورت توانائی کی ضرورتوں کے لئے ہے، امریکی انٹیلی جنس کی ذہانت کی توہین نہ کروں۔ جواب میں میں نے انہیں بتایا کہ میں پاکستان کی توانائی کی ضرورتوں پر بحث کر کے، امریکی انٹیلیجنس کی توہین نہیں کروں گا۔ لیکن اسی حوالے سے، وہ بھی میرے ساتھ پلانٹ پر کوئی بات نہ کرے۔ جنرل کو فرانس کے صدر کی طرف سے لیموں مل گیا ہے، پاکستان کو لٹو اور لیٹن اے کو ”حلوہ“ مل گیا ہے۔ مجھے موت کی سزا ملی ہے۔ اب میری زندگی کی کیا اہمیت رہ گئی ہے کہ جب میں یہ تصور کر سکتا ہوں کہ میرے آٹھ کروڑ ہم وطن غیر محفوظ آسمان کے نیچے، جس پر ایٹمی بادل چھائے ہوئے ہیں، کھڑے ہیں۔

اس وقت کی بین الاقوامی ضرورت تو یہ تھی یہ حکومتی ٹولہ، قوم کی زندگی اور موت کے اس مسئلے پر تین جلدوں پر مشتمل قرطاس ایض شائع کرتا۔ اس پر تر سوال کے علاوہ لوگوں کے دلوں میں اور کوئی سوال پلچل پیدا نہیں کر رہا ہے۔ یہ وقت ہے کہ موجودہ حکومت اپنی ترجیحات کا فیصلہ کر سکے۔ میں نے انتخابات میں دھاندلی نہیں کی لیکن کیا انتخابات میں دھاندلی کرنا، ایٹمی صلاحیت و استعداد کھونے سے بدتر ہے؟ ریاست کی سلامتی اور خود مختاری تختہ دار تک آ پہنچی ہے۔ پھانسی کا پھندہ جو ذاتی انتقام کے لئے تیار کیا گیا اب قوم کے گلے میں پڑنے کے لئے محبت سے تیار کیا گیا ہے۔ انتہا درجے کی اہمیت رکھنے والے اس موضوع پر قرطاس ایض کو تین حصوں میں تقسیم کر دینا چاہئے۔ اور اس میں اس موضوع سے متعلق تمام سرکاری دستاویزات کو بطور ضمیمہ شامل کرنا چاہئے۔

جلد اول: ایٹمی صلاحیت حاصل کرنے کے لئے پاکستان کی کاوشیں۔
جلد دوم: ایٹمی صلاحیت حاصل کرنے کی کوششوں کے خلاف سازش۔
جلد سوم: اس سازش کی کامیابی اور اس کے نتائج۔

ان تینوں جلدوں کو تمام سرکاری دستاویزات نوٹس اور میمورنڈم بطور ضمیمہ جات کے ساتھ دستاویز کی حیثیت دینی چاہئے۔ جس کی مثال قرطاس ایض کی جلد اول جو ۲۵ جولائی ۱۹۶۸ء اور دوسری جلد جو ۲۸ اگست ۱۹۶۸ء کو جاری کی گئیں، کے ذریعے قائم کی گئی ہے۔ کیسی حیران کن کامیابی اس حکومت نے نفرت کی چو کو پھیلا کر حاصل کی ہے۔ لیکن یقیناً۔ ذاتی نفرت اور حسد میں اس تک نہیں جانا چاہئے کہ جس سے قوم کے مفادات کو بنیادی اور ناقابل تلافی نقصان پہنچے اور محض اُس وقار اور اعزاز سے انکار کر کے، جو مجھے قوم کے ایک سچے اور مخلص خادم کی حیثیت سے حاصل ہے۔۔۔۔۔

قومی مفادات کبھی ذاتی استقامت کی پیش رفت سے حاصل نہیں کئے جاسکتے۔ میں نے جوشہ بر تر و اعلیٰ قومی مفادات کے لئے کام کیا ہے۔ مسلح افواج کی شہرت اور اس کے وقار کو بلند کرنے کے لئے میں نے بہت دکھ اٹھائے ہیں۔ اس وقت بھی محمود الرحمن رپورٹ پر میری کھلی کومینٹری مسلح افواج کے نام کو ناقابل تلافی نقصان پہنچا سکتی ہے لیکن انتہائی اشتعال انگیزی، ترغیب اور اس غیر انسانی رویے کے باوجود بر جو میرے ساتھ رہا دکھا گیا میں اس سے اجتناب کروں گا۔ قرطاس ایض میں محمود الرحمن رپورٹ کے دو اہم حوالے دے گئے ہیں۔ جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ کس طرح خوبی کو بدی میں تبدیل کرنے کی ایک اور کوشش کی گئی ہے۔ وہ تمام سینئر فوجی افسر، جنہوں نے محمود الرحمن رپورٹ کو پڑھا، ان کی متفقہ رائے تھی کہ رپورٹ کو شائع نہ کیا جائے۔ جب بھی میں اس رپورٹ کی اشاعت پر غور کرنے کے لئے کوئی میٹنگ رکھتا، مسلح افواج کا پرنسپل افسر بڑی شدت سے اس خیال کی مخالفت کرتا ان کی خواہشوں اور فوج کے احترام کو پیش نظر رکھتے ہوئے عوام اور حزب اختلاف کے شدید تہمتیں (ہاؤ کے باوجود میں نے اس رپورٹ کو شائع نہ کیا۔ مسلح افواج کی عزت اور ان کے نام کے تحفظ کے لئے میری ذات پر شدید تہمتیں چلے ہوئے اور مجھے اس طرح اس کا صلہ دیا گیا، فوجی حکومت کو برسر اقتدار آئے ایک سال اور ایک ماہ ہو چکا ہے۔ اس نے ہر طرح کی غلاظت اور جھوٹوں کو اس لئے شائع کیا کہ مجھے ان میں ملوث کر کے عوام کی نفرت کا رخ میری طرف پھیر دیا جائے۔ فوجی حکومت محمود الرحمن رپورٹ کی بندوبست بھی چلا دیتی اگر یہ ان کے شرمناک مقاصد کو پورا کرتی اور میرے خلاف استعمال کی جاسکتی۔

فوجی حکومت اس رپورٹ کو اسلئے جاری نہیں کر رہی کہ یہ مسلح افواج اور اس کے نظام کے خلاف فرد جرم عائد کرتی ہے چار ماہ گزرے جب چیف مارشل لائیو منسٹر نے لاہور میں ایک پریس کانفرنس میں اس رپورٹ کے جوہر کو جھٹلانے اور نیچے دکھانے کی کوشش کی اور کہا اس نے اسے پڑھا ہے۔ اس میں کوئی اہم بات نہیں ہے۔ ان کے اپنے معیار کے مطابق صرف وہ چیزیں اہمیت رکھتی ہیں جو مجھے نقصان پہنچا سکیں۔ یہ زنا، آگ اور خون اور لوٹ مار کی کہانی ہے۔ اگر ان دنوں زنا کے لئے کوڑوں کی سزا اور پوری کے لئے ہاتھ کاٹنے کی سزا ہوتی تو میں یہ سوچ کر کانپ جاتا کہ کتنے افراد ہاتھوں کے بغیر ہوتے۔ چونکہ ”بھگلیوں کے خون کی قطہیر“ زنا نہیں ہے، اسلئے پاکستان کا صدر اپنے معافی دینے کے اختیارات کو عمل میں لا سکتا ہے۔

یہ رپورٹ سچی خان اور اس کے ٹولے کی موت کے رقص کی سازش کا انکشاف کرتی ہے، بنگال کا نقشہ خون سے رنگ دیا گیا۔ ایک ایسا جنرل جس کی کھال میں نے وقار سے پچالی، اس

نے کیا رنگین ہدایت نامہ جام صادق علی کو زیر اثر لانے کے لئے بھیجا کہ وہ میرے خلاف ایک جھوٹے مقدمہ قتل میں وعدہ معاف بن جائیں۔ قرطاس ایض کے صفحہ ۱۰۶ سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ شور و غوغا اور ہنگامہ آرائی کی وجہ سے، مجھ سے درخواست کی گئی کہ میں اس سلسلے میں اس فیصلے پر مزید غور کروں کہ اس آئٹم کو شائع کر دیا جائے۔ یہ حصہ قرطاس ایض میں ترچھے نمایاں الفاظ میں دیا گیا اور یوں ہے۔

”اس بحث کے خاتمے پر یہ بات سطر پائی کہ ۱۹۷۱ کی جنگ کے بارے میں انکشافات اور واقعات، جو محمود الرحمن کمیشن سے باہر ہیں نئے امور کو ختم دس گے۔ اور اس مطالبے میں شدت پیدا کر کے اسے شائع کیا جائے۔ اور نقصان دہ ہوں گے۔ یہ فیصلہ کیا گیا کہ وزیر اعظم سے درخواست کی جائے کہ وہ اس آئٹم پر غور کریں۔“

صفحہ ۱۰۷ پر قرطاس ایض بتاتا ہے ”مسٹر بھٹو نے اس طریق کار سے پراسرار طریقے سے اتفاق کیا کہ ”اسے حذف کیا جاسکتا ہے“ اس سے واضح طور پر عیاں ہے کہ مفادات کے تصادم میں، میں نے مسلح افواج کی عزت اور شہرت کے تحفظ کے لئے اپنے سیاسی مفادات کو قربان کر دیا۔ اس پر میں حیران کن اظہار تشکر وصول کر رہا ہوں۔ بجائے اس کے کہ مجھے سربا جانا ایک ازیت پسندانہ کوشش کی گئی کہ معاملہ الٹ کر میرے خلاف چلا جائے۔ یہی مفہوم ہے ”ادھر ہم ادھر تم“ کی ترکیب کا، جسے میں نے اس مسخ شدہ شکل میں استعمال نہیں کیا تھا۔ لیکن یہ سچ ٹھکی، ادھر بنگالیوں نے انتہا کر دی تھی اور ادھر ہم نے۔۔۔ ادھر بنگالی سیاست دان طحرائی کے لئے موزوں نہیں تھے اور ادھر ہم حکومت کرنے کے لئے مناسب نہیں تھے۔ جمہوریت بنگال میں ناقابل عمل ہو چکی تھی۔ وہاں ادھر عوام کا استحصال بڑے بڑے مین کر رہے تھے اور ادھر یہاں چار کے عوام کا استحصال یہی بڑے بڑے مین کر رہے تھے۔ ادھر وہاں بنگالیوں نے ڈنڈا اٹھا لیا تھا اور ادھر ہم نے بھی ڈنڈا پکڑ لیا تھا، ”ادھر ہم ادھر تم“

چیف مارشل لائیو منسٹر نے کوئٹہ کے ہوائی اڈے پر، ۱۹۷۰ کے انتخابات کے نتائج کے بعد، چوتھین قوتیں سیاسی منظر پر نمودار ہوتی تھیں، ان کے بارے میں میرے تجزیے کا حوالہ دیا ہے۔ اس سلسلے پر میں پہلے ہی اپنی رائے دے چکا ہوں۔ میں موجودہ بحران پر اس سے زیادہ بات کر سکتا ہوں۔ اگر چیف مارشل لائیو منسٹر غر زمت کرتے تو وہ ان غیر مبہم اور شدید انتہا بات کا بھی ذکر کرتے جو میں نے پاکستان میں فوج کے مسلسل جاری رہنے والے کردار کے متعلق دی تھیں۔ جنرل ضیاء الحق کو چاہئے تھا کہ وہ یہ اضافہ بھی کرتے کہ مسٹر بھٹو نے یہ بھی کہا تھا۔

جانے کا خطرہ تھا۔ ۱۹۷۸ء میں باقی ماندہ پاکستان کے گنوا بیٹھنے کا خطرہ ہے۔ ۱۹۷۰ء میں منظر پر تین سیاسی قوتیں تھیں۔ ۱۹۷۸ء میں صرف دو سیاسی قوتیں ہی منظر پر ہیں۔ عوام اور فوج۔ ۱۹۷۰ء کی گدیاں غائب ہو چکی ہیں، عوام اور فوج کے درمیان خلا بڑھ رہا ہے۔ سوال بہت واضح اور سادہ ہے۔ پاکستان کا مستقبل کسے ہونا چاہئے عوام یا فوج؟ کیا لوگ اپنے مستقبل کا فیصلہ خود کدس کے یا نہیں؟

حالات بڑی سفاکی سے حتمی تصادم کی طرف بڑھ رہے ہیں، اسکا نتیجہ اپنی انتہا میں خوفناک اور پوش اڑا دینے والا ہو گا۔ سپین ایسے تصادم سے دوچار ہوا تھا۔ چالیس برس سے زیادہ عرصہ ہو چکا ہے لیکن اس زمانے کی یادیں، ہسپانوی عوام کو اب بھی ایک زندہ خوفناک خواب کی طرح ڈراتی ہیں۔ سپین اب بھی اپنے شدید ترسوں کی وجہ سے لپاچ ہے۔ اس سے پہلے سپین سے اسلام کی جڑیں اکھاڑ دی گئی تھیں۔ جس کے ذمے دار فریڈینڈ اور ارنسٹ لانا نہیں تھے۔ جیسا کہ مغربی مؤرخ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں اسلام اپنے غرناطہ تک اس وجہ سے پہنچا کہ مسلم دمشق نے اس کے خلاف غداری کی اور حسد سے کام لیا تھا۔ سپین پاکستان کو دو طرح انتہا کرتا ہے۔ ایک فوج اور عوام کے ساتھ خوفناک اور جان لیوا تصادم، اور دوسرے یہ کہ یہ اسلامی ریاست مٹ جانے کے خطرے سے دوچار ہے۔ ہسپانوی کہتے ہیں TO DO PORLA PATRIA پاکستانی کہتے ہیں ”پاکستان زندہ باد“ پاسق۔ سپین کا بلوچستان ہے اور اُنڈلس سپین کا سندھ ہے۔

سپین کے تمام مسائل کا حل کیتھولک ازم تھا۔ پاکستان کے پاس بھی اس کے تمام مسائل کا حل موجود ہے۔ گماندہی نے ایک بار کہا تھا کہ اگر برصغیر سے اسلام ختم ہو جائے تو وہ کسی اور جگہ نشوونما کرے گا، لیکن اگر ہندومت ہندوستان سے ختم ہو جائے تو یہ ہندومت کا خاتمہ ہو گا۔ اس ریمارک کا اصلی مفہوم یہ ہے کہ اگر ہندومت کا تحفظ اسلام کے خاتمے سے بھی کیا جاسکتا ہے تو ہم حق بجانب ہوں گے۔ کیا اس سے یہ ثابت کرنا مقصود ہے کہ۔۔۔ گماندہی، بے شک ایک مہاتما تھا؟

حال ہی میں شیخ عبد اللہ کے کشمیر میں چار یا پانچ دفعہ مسلمانوں کو قتل کیا گیا ہے۔ جنرل اپنی حمایتوں اور چھوٹے نمبر کی وجہ سے نہیں بچ سکتا۔ اسے جانتا چاہئے کہ غرناطہ اور ایک نئی کر بلا میں انتخاب کی جھڑپیں ہیں۔ میں پاکستان میں واحد شخص ہوں جو اس تصادم کو روک سکتا ہے۔ اسی سٹی اور جدوجہد میں مرجانا، مذہبی موت کے مترادف ہے۔ مکمل اور حتمی تباہی کو روکنے کی جنگ میں اپنی زندگی قربان کر دینے کو میں ایک باوقار اشارہ سمجھوں گا۔ میں اس برکولیس جیسے عظیم کام کے عہدہ پر آجوں گے لے اپنی تمام توانائی مجتمع کر کے صرف کر

وہ نتیجہ جس سے راہ فرار اختیار نہیں کی جاسکتی ہے کہ عوام لازمی طور پر حکومت میں شرکت کریں۔ فوجی کارروائیاں جو مشرقی بازو میں جاری ہیں، بھارت کے ساتھ آغاز جنگ کے نقطے پر پہنچ چکی ہیں۔ مغربی حصے میں شوریہ فوسٹریشن بڑھ رہی ہے، ان حالات میں موجودہ فوجی حکومت، اس امید میں اپنی فوجی اور نیورو کریٹک حکومت کو جاری نہیں رکھ سکتی کہ ان بحران پر قابو پا لے گی۔ صرف ایک صحیح نمائندہ حکومت، جسے عوام کا اعتماد اور تعاون حاصل ہو کامیاب ہو سکتی ہے۔ اس بنا پر پاکستان پیپلز پارٹی، عوام کی نمائندگی کرتے ہوئے یہ عقیدہ رکھتی ہے کہ یہ نہ صرف اس کا حق ہے بلکہ اس کا فرض بھی ہے کہ یہ مطالبہ کرے کہ منتخب نمائندوں کو جلد از جلد اختیار منتقل کر دیا جائے، اگر فوجی حکومت نے استقال اقتدار میں تاخیر کی، تو ملک چند مہینوں میں ایسے نقطے پر پہنچ جائے گا، جہاں سے واپسی ممکن نہ ہو۔ (عظیم المیہ)

جنرل کو چاہئے تھا کہ وہ ۲۹ دسمبر ۱۹۷۱ء کو یہ بھی کہتا کہ مسٹر بھٹو نے بیان دیا تھا کہ: ”یہ ہماری سوچی سمجھی رائے ہے کہ اگر سال کے خاتمے سے پہلے جمہوریت کو بحال نہ کیا گیا تو پھر پاکستان کی آزادی اور سلامتی کو پچاسے میں بہت دیر ہو جائے گی۔ ہر شخص کی توجہ میں اس حقیقت پر مبذول کرانا چاہتا ہوں کہ جو انتشار پیدا ہو چکا ہے، موجودہ حکومت اسے دور نہیں کر سکتی۔ اسے میرے لوگو، ظلم و تشدد کی اس طویل رات کا خاتمہ ہونا چاہئے۔ جنرلوں کی حکمرانی لازمی طور ختم ہونی چاہئے اور پاکستان کے لوگوں کو اپنی تقدیر اپنے ہاتھوں میں لینی ہوگی۔“

چیف مارشل لائیڈ منسٹر فر کو مزید یہ کہنا چاہئے تھا کہ مسٹر بھٹو نے کہا تھا۔

”ہمیں ناقابل معافی اور خوفناک غلطیاں ورٹے میں ملی ہیں، ہمیں اولڈ کارڈ کے گناہوں کے لئے جوابدہ ہونا پڑے گا۔ ناکارہ اور سرسری ذہن جو سیاست کی اچد سے بھی واقف نہیں، جنہیں تاریخ کا کوئی شعور نہیں، انہوں نے ایسے بنیادی سیاسی فیصلے کئے، جنہوں نے پاکستان کو تباہی کے دہانے پر پہنچا دیا ہے۔ (عظیم المیہ)

یہ ۷۱ء کی وہ ناخوشگوار حقیقتیں ہیں جنہیں میں نے اپنی بصیرت سے بھانپ لیا تھا۔ ایک منتخب رہنمائی حیثیت سے یہ میرا فرض تھا کہ آنے والی تباہی کے بارے میں پاکستانی عوام کو خبردار کرتا۔ یعنی خان کے فوجی ٹولے نے میری بار بار کی وارننگوں پر کوئی توجہ نہ دی۔ اور تباہی آگئی۔ آٹھ برس گزر چکے ہیں اور اس وقت ایک مختلف صورت حال پیدا چکی ہے۔ یہ بحران ۷۱ء کے بحران سے کہیں زیادہ سنگین اور گہرا ہے۔ ۱۹۷۰ء میں مشرقی پاکستان کو

میں اس لئے پیدا ہوا تھا کہ ایک قوم ہنسکوں، عوام کی خدمت کر سکوں اور ایک قریب الوقوع تباہی پر غالب آسکوں۔ میں اس لئے پیدا نہیں ہوا تھا کہ پھانسی کی کوٹھی میں بکھر جاؤں اور ایک احسان فراموش اور بد باطن شخص کے انتقام کی ہوس بجھانے کے لئے پھانسی پر چڑھ جاؤں۔ میں اس لئے پیدا نہ ہوا تھا کہ ایک دانش اور غلیظ آئولہ میری بے عزتی اور تحقیر کرے۔ میں اس لئے پیدا ہوا تھا کہ عوام کے لئے آزادی لائوں اور اپنی خود ساختہ کی منزل تک پہنچاؤں۔ جلد یا بدیر سب عوام کے لئے ایک دن آتا ہے جب وہ باستیل پر چڑھائی کرتے ہیں۔ فرانس کے عوام نے اپنی نفرت کی پلکار نفرت کی اس علامت پر ۱۴ جولائی ۱۸۹۹ء کو کی تھی۔ پاکستان کے عوام کا بھی یہ مقصود ہے کہ وہ اپنے باسٹیل پر چڑھائی کے دن تک پہنچیں۔ اگر ۱۹۷۸ء میں نہیں تو ۱۹۸۹ء میں۔ وہ دن آ رہا ہے اور ایسا کوئی شخص پیدا نہیں ہوا جو اس دن کی آمد کو روک سکے۔ میں واحد شخص ہوں جو اپنی ہی تباہی کی طرف بڑھنے والوں کی پیش رفت کا رخ پھیر سکتا ہوں۔ مجھے عوام کا اعتماد حاصل ہے اور میں اپنے وطن سے اتنی محبت کرتا ہوں کہ مجھے جو عزت حاصل تھی اسے میں نے بطور ادارہ مسلح افواج کے وقار پر گنوا دیا، وقت ابھی ہاتھ میں ہے، گولیاں کیلئے کا وقت گزر چکا ہے۔ میں پھر واپس آتا ہوں کہ حل، جو دھندلا رہا ہے اب بھی آنکھوں کے سامنے ہے۔

(۱) ملک کو آئین کی ضرورت ہے۔

(ب) عوام جمہوریت چاہتے ہیں۔

(ج) صوبوں کو خود مختاری کی ضرورت ہے۔

(د) محنت کش اور کسان پاکستان پیپلز پارٹی چاہتے ہیں۔

کیا آپ سمجھ گئے؟ یہ ہے جو عوام چاہتے ہیں۔ اپنے آپ کو مہدی بنانے کی کوشش ختم کرو!

(۰۱)

موت کی گھنٹی

چیف مارشل لائیڈ منسٹر، ناظم اعلیٰ نے اپنے انٹرویو میں یہ کہا کہ جمہوریت سے ان کی مراد ویسٹ منسٹر (انگلستان) قسم کی جمہوریت نہیں ہے۔ بلکہ ایک ایسی جمہوریت ہے جو مقامی حالات سے مطابقت رکھتی ہو۔ جیسے کہ ”بنیادی جمہورتوں کا بہت اچھا تجربہ“ پہلے کیا گیا تھا لیکن وہ تجربہ کس قدر اچھا ثابت ہوا تھا؟۔ آتش مزاج بنگالیوں کی خواہش شراکت کی خوشنودی کے لئے اگندہ بڑوں نے کئی دہائیاں پہلے بنیادی جمہورتوں قسم کی ایک چیز نکال میں متعارف کرائی تھی۔ ایوب خان کی حکومت میں، وزیر خارجہ منظور قادر نے اسے پسند کر کے چن لیا، اس میں ترامیم کر کے صدر ایوب کو مشورہ دیا کہ اس کا آغاز کیا جائے کیونکہ اس میں پاکستان کے تمام سیاسی امراض کا علاج موجود ہے۔

ایوب خان کو یہ سکیم پرکشش لگی اور بتدریج وہ اس سکیم سے محبت کرنے لگے۔ بنیادی جمہوریت میں آخری حل قرار دیدیا گیا۔ کیونکہ اس میں صدر ایوب کو پہلی بار غیر فوجی مرکز اقتدار میں کہیں پاؤں ٹکانے کی جگہ مل رہی تھی اور وہ فوج کے محدود ”جنرل ہیڈ کوارٹرز“ کے پوسٹلوں جلتے محل کے بڑے حلقے میں پہنچ سکتے تھے اور اس طرح ایک قابو میں رہنے والا اقتدار کا سولہاں آؤہ انہیں مل جاتا تھا۔ ایوب خان افسر شاہی اور منظم کرپشن میں اس طرح جکڑے ہوئے تھے کہ اس سکیم کے ذریعے انہیں اپنا اقتدار برقرار رکھنے کے لئے گویا ایک بنی بنائی شین ہاتھ لگ گئی۔ بہت جلد قوم کے سامنے اس نئے ضابطے کا خاکہ پیش کر دیا گیا۔ جس دن یہ اعلان ہوا اس کے ایک دن بعد ایوب خان، جنرل برکی اور میں تیر کے شکار کے لئے خان گڑھ گئے۔ ہمارے میزبان کے ایوب خان سے تعلقات اس زمانے سے شروع ہوئے تھے جب ایوب خان کا متقرر بطور کمانڈر ان چیف پاکستان کی حیثیت سے ہوا تھا۔ وہ ایک ان پڑھ قبائلی سردار اور زمہدار تھے۔ دوپہر کے کھانے کے دوران ایوب خان نے میزبان سے پوچھا کہ کیا اس نے نئے نظام

کے بارے میں سنا ہے؟ زمیندار نے جواب دیا کہ اس نے اس کا خاکہ ریڈیو سے سنا ہے۔ صدر ایوب خان نے پوچھا کہ ”آپ کی اس کے متعلق کیا رائے ہے؟“ زمیندار کو علم نہیں تھا کہ ایوب خان اس سکیم پر کتنا فریفتہ ہے۔ اس کا جواب تھا ”خدا کرے یہ سکیم کامیاب رہے جناب، ایوب خان اس کے اس جواب پر حیران ہوا“ آپ اس پر شک کیوں کر رہے ہیں؟“

اس زمیندار نے اس کا جواب مندرجہ ذیل شکایت میں دیا۔

(ا) لوگ گزشتہ بیس سال سے زیادہ عرصے سے بالغ رائے دہندگی کے اصول پر ووٹ کا استعمال کرتے چلے آ رہے ہیں، اب بالغ رائے دہی میں کمی کی گئی یا اسے ختم کر دیا گیا تو اس سے نظام سے لوگ ناراض ہو جائیں گے۔

(ب) افسر شاہی زیادہ طاقتور اور پرمزاج ہو کر عوام کے ساتھ زیادہ غیر مردود ہو جائے گی۔

(ج) افسر شاہی اور بنیادی جمہوریتوں کے نمائندے ایک ساتھ مل کر عوام کی کھال اتارنے لگیں گے۔

(د) وہ لوگ جو ان چھوٹے چھوٹے حلقوں سے منتخب ہوں گے وہ بد معاش قسم کے افراد ہوں گے۔

(ر) چونکہ طلبہ بہت چھوٹے ہوں گے اس لئے باہمی رقابتیں اور ستازے ناپ اور بیٹے اور بھائی اور بھائی کے درمیان اس لئے خڑے ہو جائیں گے کہ وہ بنیادی جمہوریتوں کے رکن بننا چاہیں گے۔ یوں ذاتی حرص و ہوس اور انتقام پر کاؤں کے ہر جموں پر سے تنک پہنچ جائے گا۔

(س) یوں ایک نئے مراعات یافتہ طبقہ کی تحقیق ہوئی اور عوام ان سے نفرت کریں گے۔

(ش) ملک کی سیاسی زندگی میں کرپشن پھیل جائے گی۔

بنیادی جمہوریتوں کے بارے میں میں نے ایسا بہتر واسطاف کرنے والا، سچا تجزیہ حکومت میں اپنے کسی رفیق سے بھی نہ سنا تھا۔ اس اعتبار سے یہ بطور خاص قابل تعریف ہے کہ ایک بار اس ”تیم“ کا سرسری نمائندہ ریڈیو سے سننے کے بعد، ایک ان پڑھ زمیندار نے بڑی آسانی اور سادگی کے ساتھ اس کے بنیے صدر ایوب کے سامنے اوجھڑ کر رکھ دیئے تھے۔

دوسرے زمیندار جو شامیانے کے نیچے بیٹھے ہوئے تھے وہ دیکھ رہے تھے کہ ایوب خان کے چہرے کے تاثرات ناخوشگوار ہو رہے ہیں۔ ایوب خان بہت پریشان ہوا۔ کراچی کی طرف واپسی میں، ایوب خان نے مجھے کہا کہ علی گوہر جیسا محمد و دبیرت رکھنے والا شخص بھلا اس نظام کے ثمرات سے نیٹے آگاہ ہو سکتا ہے۔ چچو ماد بعد وہ زمیندار معدے کے مرض سے فوت ہو گیا۔ کراچی واپس آکر میں نے صدر ایوب کو بتایا کہ میں اس کے خاندان سے اظہار تعزیت کے لئے

خان گڑھ گیا تھا۔ ایوب خان نے بتایا کہ اُسے اپنے دوست کی وفات کی خبر سے بہت دکھ ہوا ہے۔ پھر اس نے کہا ”اس کے ساتھ گڑبڑ یہ تھی کہ وہ بہت زیادہ پیتا تھا۔“ ایک لمحے کی خاموشی کے بعد اس نے مزید کہا ”غالباً اس روز بھی اس نے بہت پی رگھی تھی جب اس نے بنیادی جمہوریتوں کے نظام پر تنقید کی تھی۔“

دس برسوں کے بعد ایوب خان کو پتہ چلا کہ یہ تو وہ خود تھا جو بنیادی جمہوریتوں کے نظام کے نئے میں چور تھا۔ گول میز کانفرنس میں اسے یہ تسلیم کرنا پڑا کہ بنیادی جمہوریتوں کا نظام نام کام ہو چکا ہے۔ اگر وہ نظام 1953 میں ناقابل قبول تھا اور اسے عوام نے 1969 میں ختم کر دیا تھا تو اس کی کوئی بھی دھلی دھلائی سفید تشریح اس دھتکار سے ہونے نظام کو 1978 میں عوام کے لئے قابل قبول نہیں بنا سکتی۔

فوجی حکومت اب بھی اپنی اس رائے پر قائم ہے کہ پاکستان کے عوام جذباتی اور ان پڑھ ہیں۔ مسیبت یہ ہے کہ پاکستان میں دو دنیا نہیں ہیں۔ عوام کی دنیا اور آقاؤں کی دنیا۔ اپنے بارے میں عوام اپنا ایک تصور رکھتے ہیں۔ جبکہ اس منکبر اور پرمزاج ٹولے نے عوام کا ایک الگ تصور بنا رکھا ہے۔ ہم عوام پر اعتقاد رکھتے اور ان کی دانش پر سمن یقین رکھتے ہیں۔ ہمارا یہ خیال نہیں ہے کہ پاکستان کے عوام ایسے بچے ہیں جنہیں کوئی مداری تماشاکار کھا کر بہلا سکتا ہے۔ نہ ہی ہمارے عوام، غیر پرمزیاں ہیں کہ جنہیں بانک کر ذبح خانے پہنچا دیا جائے۔

میں اردو زبان پر عبور نہیں رکھتا، عطاء اللہ شاہ بخاری جیسے لوگ اس پر عبور رکھتے تھے۔ بخاری کی تقریروں سے پر جوش ہونے اور بے جا جانے کے باوجود لوگوں نے انہیں یا ان جیسے خطیبوں کو ووٹ نہیں دیا۔ لیکن انہوں نے میری کمزور اور ٹوٹی پھوٹی اردو سنی اور چونکہ وہ خود کمزور و نادار اور ٹوٹے پھوٹے ہیں اس لئے مجھے اپنے غیر مشروط اعتماد سے نوازا۔ میں نے ان کے اعتماد سے کبھی غداری نہیں کی اور نہ ہی اس وقت جبکہ موت کی وادی کے سائے میں بیٹھا ہوں، ان کے اعتماد سے غداری کروں گا۔ مجھے جس اعتماد سے نوازا گیا ہے، وقت گزرنے کے باوجود آج بھی جتنے اس میں کوئی شک ہو، اس کا امتحان لے سکتا ہے۔ عوام کو ووٹ کے ذریعے اپنی رائے ظاہر کرنے کا موقع دے کر دیکھ لیں کہ کیا میں نے عوام کے ساتھ دھوکا کیا ہے یا انہیں خود داری کی ان دشمنی بلندیوں تک پہنچایا ہے؟

انتخابات کے انعقاد کو مشروط کر دیا گیا ہے کہ پیشگی مثبت نتائج کی ضمانت ملے۔ کوئی بھی سیاسی پارٹی مثبت نتائج کی ضمانت نہیں دے سکتی۔ فوجی حکومت کے ذرائع کے مطابق مثبت نتائج کا مفہوم ہے ان کے ذرائع کے مطابق مثبت دھاندلی۔ گزشتہ چودہ مہینوں میں ہر

اپنے قریب کو چھپانے کے لئے محض دوسرے الفاظ استعمال کر رہا ہے۔ اس لائسنس اور شرائط کی حرف جائے بغیر، جو اس نے قائم کر رکھی ہیں زیادہ اہم اور قابل توجہ امر یہ ہے کہ سپریم کورٹ نے جو فیصلہ دیا تھا اس کے نتیجے میں مابعد حالات مثبت اور آئینی بننے چاہئیں تھے۔ سپریم کورٹ کے اس تحریری فیصلے کی روح کی پامالی کی ذمہ داری کس پر عائد ہوتی ہے؟ اس آدمی سے کون باز پرس کرے گا۔ جس نے کہا تھا ”خود یہ آئینی ہے یا نہیں ہے پاکستان میں زمام اقتدار اُس آدمی کے ہاتھوں میں ہمیشہ رہے گا جو چیف آف دی آرمی سٹاف کی کرسی پر بیٹھا ہے اگر یہ پاکستان کی سیاست میں فوج کے کردار کے بارے میں رسمی اعلان ہے تو پھر اس کا مفہوم یہ ہے کہ پھر رسمی اور آخری مہر ثبت کی جا چکی ہے۔ نہ کوئی جمہوری نظام اور نہ ہی کوئی غیر جمہوری نظام اس شرارت کو توڑ سکتا ہے۔

ایک نظام وہ ہوتا ہے کہ عوام اپنے نمائندوں کا انتخاب کرتے ہیں اور وہ نمائندے حکومت قائم کرتے ہیں۔ دوسرا نظام وہ ہوتا ہے کہ ملک میں صرف ایک ہی سیاسی پارٹی ہوتی ہے۔ اور حکومت کی باگ ڈور اس کے ہاتھوں میں ہوتی ہے۔ لیکن دونوں صورتوں میں مسلح افواج شہری حکومت کے تابع ہوتی ہیں۔ اور اسی کے حکم و ہدایت کے مطابق عمل کرتی ہیں۔ اگر ایک ملک کی وحدت اور خود مختاری عوام اور ان کے منتخب نمائندوں کے اعلیٰ ہاتھوں میں محفوظ نہیں تو پھر یہ دوسرے ہاتھوں میں بھی محفوظ نہیں رہ سکتی۔ یہ عوام اور ان کی حب الوطنی کی توہین ہے کہ غیر منتخب، تنخواہ یافتہ چوکیداروں کو قومی اتحاد و وحدت کا علمبردار بنادیا جائے۔ یہ قومی وحدت کی موت کا ماتی نغمہ ہو گا۔

بلاشبہ فوجوں کو بغاوتیں، سیلاب وغیرہ اور بد امنی کو دبانے کے لئے احکام دینے جاتے ہیں۔ لیکن ایک عارضی ضرورت کو قومی زندگی کا ایک مستقل حصہ نہیں بنایا جاسکتا۔ پرنسپل اور موازنے کی پرنسپل ترغیبات اقتدار کی ہنت کے لئے سازشوں اور منصوبوں کے اٹھانے سے بیدار کرتی ہیں۔ اس کے اختیار اور غیر مؤثر ہو جاتے ہیں۔ غیر ملکی نوآبادیاتی نظام نے ہمارے عوام پر اندرونی نظام نوآبادی مسلط کیا تھا۔ جس کا سلسلہ انتظام تک پہنچتا ہے۔ برتر اختیار و اقتدار صرف پارلیمنٹ کے ذریعے قائم کیا جاسکتا ہے۔ اور اس پر کوئی چیز ٹھوس نہیں جاسکتی۔ ایسی صورت حال میں سیاست کے لئے کوئی عجائبات باقی نہیں رہتے۔ اور پھر اگر سیاست کے لئے کوئی جگہ نہیں ہے تو پھر کسی نظام ریاست کے لئے بھی جگہ نہیں رہ سکتی۔

میں نوشتہ دیوار دیکھ چکا ہوں۔ میں نے اکتوبر 1977ء میں انتخاب کر دیا تھا۔ سپریم کورٹ میں آئینی رٹ درخواست کی سماعت کے دوران میں نے کہا تھا۔ ”آئین کو حد درجہ کم

غیر قانونی حربہ آزمایا گیا ہے کہ پاکستان پیپلز پارٹی کو نیست و نابود کر کے ”مثبت نتائج“ کی راہ ہموار کی جائے۔ اور اب بڑے جاد و جلال کی تحریک کے ساتھ ایک سویلین کابینہ کچھ پتلیوں کے تماشے کی طرح کھڑی کی گئی ہے اور انتخابات ایک سال بعد چلانے کا اعلان کیا گیا ہے۔ اب وہ اکتوبر 1979 میں منعقد ہوں گے۔ میں بے وقوف نہیں بن سکا عوام کو بھی بے وقوف نہیں بنایا جا سکا۔ یہ تبدیلیاں سرے سے تبدیلیاں ہی نہیں ہیں۔ سارے پھیل کی باگ دوڑ اب بھی چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کے ہاتھوں میں ہے۔ اب بھی فوجی حکومت ہے۔ اب بھی مارشل لاء ہے۔ آئین کو پامال کیا گیا ہے۔ اسے پھاڑ کر ٹکڑے ٹکڑے کر دیا گیا ہے۔ اکتوبر 1979ء کی تاریخ بے حد مبہم ہے۔ یہ بہت دیر کے بعد آتی ہے۔ عوام کو ایسا یقین نہیں دلا گیا کہ کسی کوئی ضمانت نہیں دی گئی کہ ان کی آزادیاں اور حقوق بحال کر دیئے جائیں گے۔ درحقیقت، چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر نے محض، لیکن زیادہ کھوکھلے وعدوں کے کوڑا کرکٹ کے پیچھے پناہ لے لی ہے۔

نظر یہ ضرورت کا اصول بھی کب سے اپنی معیاد پوری کر چکا ہے۔ تنظیم اس کی درخواست پر سپریم کورٹ کا فیصلہ نہ توں سے ہوا کارخ بدل چکا ہے۔ سپریم کورٹ کے نظریہ ضرورت کے اصول کو ان بنیادوں پر قبول کیا تھا کہ یہ حکومت اپنے وعدوں کے عین مطابق ایمانداری سے انتخابات کرائے گی۔ نظریہ ضرورت کو تسلیم بھی اس لئے کیا گیا تھا کہ انتخابات جلد از جلد کرائے جائیں۔ جبکہ فوجی حکومت یہ اعلان کرتے ہوئے کوئی شرم محسوس نہیں کر رہی۔ ”آئندہ انتخابات کئی سیاسی پارٹیاں کسی مداخلت کے بغیر لڑیں گی۔ انہیں یہ یقین دہانی تھے اور قوم کو کرائی ہوئی کہ انتخابات کے نتائج مثبت ہوں گے۔ یہ لمزور اور لاغر اشارہ سرے سے کوئی بنیاد نہیں رکھتا شرائط کے تحت انتخابات کرائے کی اس کوشش کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ ایک بار پھر عوام کو بے وقوف بنا کر دھوکا دیا جائے۔ درحقیقت چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر انتخابات سے خوفزدہ ہے۔ وہ مثبت نتائج کی باتیں کرتا ہے۔ اختصاصی ابتری کو ختم کرنے کا بہانہ بنا کر انتخابات کو انہیں دلا جا رہا ہے۔ اصل میں شکست اور ناکامی وہ اسباب ہیں جن کی وجہ سے وہ انتخابات کرانا نہیں چاہتا۔

یہ معاشی ابتری اور انتشار اس فوجی حکومت کے چیف اور اس کی مطلق العنان غیر مفید پالیسیوں کا پیدا کردہ ہے۔ وہ اور اس کی حکومت اس معاشی ابتری اور انتشار کو ختم نہیں کر سکتے کیونکہ وہ اور اس کے ساتھی ہی تو اس ابتری کے سرچشمے ہیں جو گذشتہ ایک برس میں ابھار در ابھار جمع ہوا ہے۔ یہ پہلا موقع نہیں ہے کہ چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر نے پیشگی شرائط کی بات کی ہو۔ پہلی دفعہ اس نے پہلے معاشی ابتری کا ذکر کیا اور پھر ثانیا مثبت نتائج کی ضمانت۔ اب وہ

سے کم عرصے کے لئے معطل کیا جانا چاہیئے۔ اگرچہ عرصہ طول کھینچنے کا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ چاروں صوبوں نے رضا کارانہ طور پر اپنی خود مختاری مرکز کو سونپ رکھی ہے۔ وہ قانونی طور پر مرکز کے اختیار میں اسی صورت میں رہ سکتی ہے کہ انتخابات کا وقت مقرر کر دیا جائے۔ جب بجوں میں سے ایک نے استفسار کیا کہ میں مارشل لاء پر وقت کی پابندی لگانے کے متعلق کہہ رہا ہوں تو میں نے جواب دیا تھا، بالکل، یور لارڈ شپ، آپ وہی کہتے ہیں جو میں کہہ رہا تھا۔ اس سے زیادہ بعید از معنی اور غلط بات نہیں ہو سکتی کہ میں نے عدالت سے یہ کہا تھا کہ اگر سو بے چارے تو وہ مرکز سے علیحدگی اختیار کر سکتے ہیں۔ یہ قطعی مختلف اور شاذ الکلیز بات ہے جو میں نے غیر معینہ عرصے کے لئے آئین کی معنی کے بارے میں سپریم کورٹ میں کی اور جو میرے کام منسوب کی گئی۔ ان دونوں میں زمین آسمان کا فرق ہے۔

میری ان معروضات کا اطلاق پوری شدت کے ساتھ 1973 کے آئین میں کی جانے والی ترامیم پر بھی ہوتا ہے۔ اگر آئین کی بجلی میں غیر معتدل تاثیر کے لئے فحش مضامین تراشیم کا سلسلہ جاری رہا، بطور خاص نئے شدہ بنیادی امور کے متعلق جیسے کہ انتخابات، تو پھر یہ بہت مشکل ہو جائے گا کہ آئین کا چہرہ سیدھا رکھا جاسکے اور یہ کہا جائے کہ 1973 کا آئین اب بھی زندہ ہے۔ اسی صورت میں پھر حق انتخاب کے سارے راستے پھر سے کھل جائیں گے۔ جس میں یہ امور بھی شامل ہوں گے کہ خود مختاری ”پوری“ ”مکمل“ پوری اور مکمل سے کم ہے۔ یہ بنیادی اور سنگین امور جو پاکستان کی بقا سے تعلق رکھتے ہیں، ان کا تفسیر ان نو منتخب نمائندوں کے اجماع سے ہونا چاہیئے جن کے لئے آزادانہ اور منصفانہ انتخابات کا انعقاد بلا تاخیر ہونا چاہیئے۔ خود مختاری کی حدود کا تعین فطری طور پر اس اجماع کے ذریعے ہونا چاہیئے جو نئے منتخب اراکین کا ہو۔

میں یہ نہیں کہہ رہا کہ 1973 کا آئین مردہ ہو چکا ہے۔ اس کا انحصار تو اس امر پر ہے کہ اسے کب تک اس پر جوش تعطل میں رکھا جاتا ہے۔ اور کب تک اس میں ترامیم ہوتی رہیں گی۔ اگر آزادانہ منصفانہ انتخابات کا جلد انعقاد نہ ہوا اور آئین میں ترمیم چلتی رہی تو پھر یہ سوچنا بھی ویم وگمان ہو گا کہ 1973 کا آئین اب بھی اس سرزمین کا اعلیٰ ترین قانون ہے۔ انتخابات کی ضرورت اور اہتمام یہ ہوتا ہے کہ وہ آزادانہ اور منصفانہ ہوں۔ انہیں معاشیات اور نظام مصطفیٰ کے ذیلی ڈھانچے لوندے کے ساتھ نہیں جوڑا سکتا۔

حکومت کا فوج سے ناگہانی تختہ الٹا جانا ایک ناخوشگوار تجربہ ہوتا ہے۔ یہ اپنے پیچھے ایک خوفناک ورثہ چھوڑ جاتا ہے۔ پاکستان۔ پاک انسانوں کی سرزمین۔ فوجستان بن کر رہ گیا ہے۔ اگر فوجی بغاوتیں اور انقلاب سیاسی ڈھانچے کا مستقل حصہ بن جائیں تو اس کا مطلب یہ

ہے کہ مجھانے ہوئے پھول کی آخری پتی بھی نیچے گر جائے گی۔ اس کا مفہوم ہے خاتمہ! بہت سی قومیں ایسی ہیں جو ہمیشہ سے لافانی وقت میں اپنا وجود برقرار رکھے ہوئے ہیں۔ حتیٰ کہ روز اول سے قائم اقوام بھی اپنے آپ کو ایسی مہم جوئی اور خطرے میں نہیں ڈال سکتی ہیں۔ وہ ریاستیں جو دو عالمی جنگوں کے درمیان آزاد ہوئیں وہ بھی اپنی وحدت کے لئے اس قسم کا جوا نہیں کھیل سکتی ہیں۔

موجود ریاستوں سے ہی نئی ریاستیں اپنے عوام کے ارادوں سے تخلیق ہوئی ہیں۔ عوام کی جدوجہد اور ان کے ایشارے کے بغیر، اس قسم کی ریاستیں کبھی معرض وجود میں نہیں آسکتی تھیں۔ اگر وہ اپنے اتحاد اور اپنی تخلیق کو برقرار نہیں رکھ سکتی ہیں تو پھر قربانی اور جدوجہد غائب ہو جاتی ہے۔ اگر اس کے اتحاد اور سلامتی کی محافظ چیف آف آرمی سٹاف کی کرسی بن جائے تو پھر اسی کا اللہ ہی مالک ہے۔ قائد اعظم نے تو کبھی اس کا تصور بھی نہیں کیا تھا کہ فوج پاکستان کی سیاست میں ایک مستقل کردار کی مالک بن جائے۔ ایسا خیال بھی ان کے لئے مکروہ تھا۔ انہوں نے کالوں میں کینڈوں کو نصیحت کی تھی کہ وہ دل و جان سے حکومت کے وفادار اور آئین کے وفادار رہیں۔ لیکن قائد اعظم کی یہ تقریر میرے علم میں نہیں تھی۔ جون 1977ء کے اواخر میں جب میں مشرق وسطیٰ کے مختصر دورے پر روانہ ہونے والا تھا۔ اس سے ایک دن پہلے چیف آف آرمی سٹاف جنرل ضیاء الحق نے میری توجہ اس تقریر کی طرف اس وقت مبذول کرائی۔ جب وہ ہوائی اڈے سے میرے ساتھ کار میں کراچی میں میری رہائش گاہ کی طرف جا رہے تھے۔ اس نے کہا کہ اس کے لئے میری حکومت سے وفاداری ایک واضح اور ٹھوس فریضہ ہے جس کا درس قائد اعظم نے مجھے دیا ہے۔

وہ کون سے اعصابی دباؤ تھے جو ایسی زمانی اور تاریخی تبدیلیوں کا پس منظر بنے؟ کون سے مضامین محرم کاٹے تھے جنہوں نے یوں رخ بدل دیا؟ وہ کون سی نفسیاتی الجھنیں تھیں جو ایسی بائیل کروائی تھیں۔ ایوب خان کے ”سنہری دور“ کا نو شیلیا بنیادی جمہوریتوں کی صفت و ثناء۔ انتخابات کا تصور کہ نتائج اس کی مرضی کے مطابق ہوں جو انتخابات کروا رہا ہو۔ پاکستان کی سیاست میں فوج کے مستقل کردار کا خود کشی کا نظریہ، ایسے ہی خیالات ہیں جو ان لوگوں کے ذہنوں میں اٹکتے ہیں جو تاریخ کے دروازے کے باہر کھڑے ہیں۔ ایسے خیالات صرف منجمد ذہنوں کو ہی اپیل کر سکتے ہیں۔ ایسے رجعت پسند ذہنوں کو جو پاکستان کو گھسیٹ کر ماضی کی پسمنادگی میں لے جانا چاہتے ہیں۔ اگر ماضی کی طرف واپسی ممکن نہیں ہے تو پھر یہ فوجی حکومت اپنی پوری کوشش کر رہی ہے کہ ایک ادارے کی حیثیت سے اس نے جو اختیار و مقام حاصل کیا

ہے وہ ہر صورت میں برقرار رکھا جائے۔ ایک ہی اقتدار اور مقام کو قائم رکھنا، ایک ایسے معاشرے کی نشاندہی کرتا ہے۔ جس کی ٹھکانا مارک چچی ہو۔ پوریس کے خیال میں "انسان تبدیلی کے متعدی اثرات کے تحت پیدا ہوتا ہے" میرے خیال میں تبدیلی کے لئے کینہ توڑی کی ضرورت نہیں پڑتی بلکہ اس کے لئے عوام کی ذہانت لازمی ہوتی ہے۔ اور یہ کینہ پرور ذہنوں سے جنم نہیں لیتی جو کینہ پروری سے مغلوب ہو چکے ہوں۔

دو غلطیوں سے ایک سچ نہیں بنتا

اس حکومت نے اپنے تحفظ کے لئے وقیانوسی منطق کا سہارا لیا ہے۔ اپنی برسرِ دست مارشل لاء کو مبنی پر حقائق ثابت کرنے کے لئے اس نے اس ہنگامی اور ایمر جنسی حالت کا حوالہ دیا ہے جو میرے دورِ اقتدار میں ملک پر نافذ رہی۔ اور یہ منطق ہے کہ اگر ایک منتخب حکومت ایمر جنسی نافذ کر سکتی ہے تو پھر فوجی حکومت اس سے بھی کئی قدم آگے جا کر آئین کو دفن کر سکتی ہے۔ دوسرے الفاظ میں یہ کہ اگر پارلیمنٹ قانونی طریقے سے، آئین کی بعض محدود شقیں جو بنیادی حقوق کے بارے میں ہیں، معطل کر سکتی ہے تو پھر فوجی حکومت کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ پورے قانون کو معطل کر دے۔ چونکہ میری حکومت نے ایمر جنسی کے زمانے میں خصوصی ٹریبونل قائم کئے اس لئے فوجی حکومت حق بجانب ہے کہ وہ دوسری انتہا پر جا کر سری ملٹری عدالتیں، دوسری سری کورٹس، خصوصی ٹریبونل اور نااہل قرار دینے والے ٹریبونل قائم کر دے چونکہ میری حکومت نے قانون کے ضابطوں کے مطابق آئین میں ترامیم کیں اس لئے پیٹیف آف وی آرمی سٹاف کو یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ اکیلا ہی اپنی مرضی کے مطابق آئین میں ترامیم کر دے۔ چونکہ وزیر اطلاعات و نشریات نے ایک اخبار کے خلاف کچھ انتظامی تدابیر لالو کرنے کا مشورہ دیا اس لئے فوجی حکومت حق بجانب ہے کہ وہ صحافیوں کو کور سے لٹائے اور جیلوں میں بند کر دے اور پرنٹنگ پریسوں کو ضبط کر لے۔

چونکہ میری حکومت نے بعض بدنام ٹیکس خوروں سے ٹیکس وصول کیا اسی لئے فوجی حکومت سمجھتی ہے کہ اسے پاکستان پیپلز پارٹی کے رہنماؤں اور کارکنوں کی املاک ضبط کرنے، ہراساں کرنے اور ان سے روپیہ پیسہ چوڑا لینے کا اختیار حاصل ہے۔ چونکہ میری حکومت پر یہ الزام ہے کہ اس نے انتخابات میں دھاندلی کی۔ اس لئے فوجی حکومت سمجھتی ہے کہ جب تک ان کے لئے موزوں نہیں اس وقت تک انتخابات ملتوی کر دیئے جائیں۔ اس کامیابی کا ریکارڈ گواہ ہے کہ مستقبل میں بھی اچھا نہیں ہوگا۔ انتخابی مہم کے عین وقت پر، مجھے اور میری

پارٹی کے اعلیٰ لیڈروں کو گرفتار کر لیا گیا۔ اس سے انتخابات ایک پُر فریب تماشیاں بن گئے۔ ان گرفتاریوں کے باوجود، جب پاکستان پیپلز پارٹی کے جلسوں میں عوام جوق درجوق آنے لگے اور یہ نشاندہی ہو گئی کہ پاکستان پیپلز پارٹی ایک بار پھر اپنی زبردست قوت کا مظاہر کرے گی تو فوجی حکومت نے بڑی عجلت میں انتخابات ملتوی کر دیئے۔ فوجی حکومت کا دعویٰ ہے کہ میں نے انتخابات میں دھاندلی کی۔ اس کا اپنا طرزِ عمل اس کے مقابلے میں بدتر ہے۔

میری حکومت پر یہ مبینہ الزام لگایا جاتا تھا کہ وہ اپنی پارٹی کی سرپرستی کرتی تھی۔ اس لئے فوجی حکومت سوچتی ہے کہ وہ اس امر میں حق بجانب ہے کہ پی این اے کی شناخت کو اپنی شناخت میں ضم کر لے۔ پی این اے میں اب کچھ بھی نہیں رہا ہے۔ ایک میکسین کہوت ہے جو انتہائی بر محل ہے۔

وہ جو کتنوں کے ساتھ سوتے ہیں۔ وہ پوسوں کے ساتھ جاگتے ہیں، چونکہ میری پارٹی نے انتخابات میں حلقوں کی نئی حد بندیوں کے لئے سفارشات قانونی طریقے سے الیکشن کمیشن کے سامنے پیش کی تھیں۔ اس لئے فوجی حکومت یہ سوچنے میں اپنے آپ کو حق بجانب سمجھتی ہے کہ وہ الیکشن کمیشن محض رزکی مہر لگانے والے سفارشی ادارے میں تبدیل کر دے۔ چونکہ میری حکومت نے سابق چیف الیکشن کمیشن کی ملازمت میں توسیع کی تھی اس لئے فوجی حکومت اس میں یقین رکھتی ہے کہ لاہور ہائی کورٹ کے چیف جسٹس کو چیف الیکشن کمیشن کشف بھی بنا دیا جائے۔ چونکہ میری حکومت نے یہ سوچا تھا کہ ایک سنگین قومی بحران کے حل کے لئے ریفرنڈم کرایا جائے۔ اس لئے فوجی حکومت بھی سوچتی ہے کہ وہ بھی اس امر کے لئے ریفرنڈم کروائے کہ لوکل باڈیز کے انتخابات دوسرے انتخابات سے پہلے کرائے جائیں یا نہیں؟ اسی طرح قرطاس امضے میں دھوکہ دہی کے انداز میں میرے دور کی ایمر جنسی کے حوالے دیئے گئے ہیں۔ قرطاس امضے کے تحارف (صفحہ ۱) پر کہا گیا ہے "جب تک وہ برسرِ اقتدار رہے، ملک میں ایمر جنسی کی حالت مکمل طور پر نافذ رہی۔ حتیٰ کہ عام انتخابات کے زمانے میں بھی اسے نہ اٹھایا گیا"

مگر الزام میں نے آزادانہ منصفانہ طور پر عام انتخابات تو کروائے تھے۔ چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر اب دوسرے لوگوں کو یہ یقین دلانے کی کوشش کر رہے ہیں کہ وہ انتخابات کروائیں گے۔ جس سے صورت حال ابتر ہو گئی ہے۔ چہرہ چلانے کے لئے یہ بھی محض ایک سٹنٹ ہے۔ جب کہ یہ اسی عمل کا محض ایک حصہ ہے جو 5 جولائی 1977 سے شروع ہے۔ جس روز اس نے اقتدار پر غاصبانہ قبضہ کیا اس نے مذہبی محاذات سے وعدہ کیا کہ انتخابات نوے دنوں میں ہوں گے۔ 28 ستمبر 1977 کو اس کے خراجِ جان اعلیٰ نے اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کے اجلاس میں

جنرل اسمبلی کو اطلاع دی کہ پاکستان میں انتخابات طے شدہ پروگرام کے مطابق 18 اکتوبر 1977 کو ہوں گے۔ اور اقتدار عوام کے منتخب نمائندوں کو منتقل کر دیا جائے گا اور اس کے تین دن بعد اس کا وعدہ ٹوٹ چکا تھا اور انتخابات اچانک ملتوی کر دیئے گئے۔

اگر میں نے یہ گناہ کیا کہ ایرجنسی کی حالت میں بھی انتخابات کرادینے تو اس کا یہ مطلب نکلتا ہے کہ اگر کبھی انتخابات کرادینے گئے تو مارشل لاء اٹھا دیا جائے گا۔ مارشل لاء تو ایرجنسی کی انتہائی صورت ہے۔ اگر انتخابات اور ایرجنسی میں کوئی مطابقت نہیں تو پھر اس سے بھی زیادہ یہ ناقابلِ مضامنت حقیقت ہے کہ مارشل لاء انتخابات کے ساتھ اپنا وجود برقرار رکھے۔ اس طرح کی مثالیں اور تشبیہیں دینے کا حاصل کیا ہے۔ یہ کہ فوجی حکومت اپنی جرح و شقاق کا اظہار کرنا چاہتی ہے۔ ان کے کاسہ لیس اور خوشامدی کہتے ہیں کہ میں انتخابات کا مطالبہ اس لئے نہیں کر سکتا کہ میں نے احتجاج کے دنوں میں پاکستان کے تین شہروں پر مارشل لاء لگا دیا تھا۔ یا یہ کہ جب میں نے 20 دسمبر 1971 کو پاکستان کے صدر کی حیثیت سے حلف اٹھایا تو اس کے ساتھ ہی چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر بھی بن گیا میں اس کی وضاحت پہلے بھی کر چکا ہوں کہ 1962 کا آئین شیخ خان نے منسوخ کر کے ایک خلا پیدا کر دیا تھا۔ جب تک اس خلا کو اپریل 1972 کے عارضی آئین سے پُر نہ کیا جائے ورثے میں ملنے والی تمام ذمے داریاں اس کے دور کے سنگین حالات کے تحت قبول کرنی تھیں۔ جہاں تک پاکستان کے تین شہروں پر مارشل لاء نافذ کرنے کا تعلق ہے تو اس کی وجہ وہ گڑبڑ تھی جو انتہا کو پہنچ گئی تھی۔ اور پھر ایک ایسا مارشل لاء جو دستور کے تحت لگایا جائے اور ایسا مارشل لاء جو ڈیوک آف ویلنگٹن لگوائے اس میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ جب لوگ یہ مطالبہ کر رہے تھے کہ سیاسی سرگرمیوں پر پابندی مکمل طور پر اٹھائی جائے تو ضابطہ فوجداری کے سیکشن 144 کے استعمال کے لئے میری حکومت ریفرنس پیش کرتی ہے۔ اس قسم کی تباہ کن منطق کا کوئی جواب نہیں دیا جاسکتا۔ یہ ہر ایک کو گھٹا بنا دیتی ہے۔ قرطاس ایٹش کے صفحہ 384 پر "ایرجنسی کا کوئی خاتمہ نہیں" کے عنوان کے تحت قرطاس ایٹش میں کہا گیا ہے اس کے باوجود کہ پاکستان کے دوسرے ملکوں کے ساتھ مکمل تعلقات کے دعوے اور اس حقیقت کے باوجود کہ بھارت کی نئی حکومت نے خارجی ایرجنسی اٹھالی تھی۔ انہوں نے پاکستان میں ایرجنسی کی حالت ختم کرنے سے انکار کر دیا۔ جسے وہ اپنے مخالفین اور حزب اختلاف کو کھینچنے کے لئے مؤثر انداز میں استعمال کر رہے تھے۔ میں نے (ایرجنسی کے بارے میں) جو کہا تھا وہ یہ تھا کہ میں ایرجنسی اٹھانے کے سوال پر اس وقت تیار ہوں جب بھارت خارجی ایرجنسی کو اٹھالے گا۔ لیکن میں نے یہ کبھی نہیں کہا تھا کہ جو بھی بھارت ایرجنسی

ختم کر دے گا۔ ہمارے ہاں بھی ایرجنسی خود بخود ہٹا دی جائے گی۔ بھارت نے پاکستان کے ساتھ ایک جنگ لڑی تھی۔ لیکن دوسروں کے ساتھ بھی ہمارے تعلقات کشیدہ اور خراب تھے۔ ہمارا ملک ٹکڑے ہو چکا تھا اور اس کے علاوہ افغانستان کے ساتھ بھی شدید غلط فہمیاں پیدا ہو چکی تھیں۔ لیکن اس سے بھی کہیں زیادہ دوسرے عناصر تھے، جیسے اندرونی لڑبڑ اور ہنگامہ آرائی بھی تھی۔ قرطاس ایٹش اپنی من مرضی سے پیشہ وارانہ وجہ ان کے ساتھ آدھا سچ ہی بیان کرتا ہے۔ بھارت میں احتجاجی بیرونی ایرجنسی پر نہیں بلکہ اندرونی ایرجنسی پر کیا گیا تھا۔ جہاں تک افغانستان کے پاکستان کے ساتھ اختلافات کا معاملہ ہے تو قرطاس ایٹش نے اس حقیقت کو بہت گھٹا کر بتانے میں بڑی جلدت سے کام لیا ہے۔ بجائے اس کے کہ یہ حکومت ایسے سنجیدہ امور پر غور و فکر کرتی اس نے اسے سکینڈل بنانے اور کچھ اچھالنے میں زیادہ دلچسپی لی ہے۔

قرطاس ایٹش کے صفحات 167 اور 168 پر مسماۃ رانی کا سیلا حوالہ دیا گیا ہے۔ میرا رانی سے کیا واسطہ، میں اسے کیا کروں؟ جنرل اس میں زیادہ دلچسپی رکھتے تھے۔ وہ جنرل رانی ہے۔ بھارتی رانی کی طرح بھارت کی رانی ہے۔ اُسے میرے ساتھ جنرل آغا محمد یحییٰ خاں کمانڈر انچیف آف پاکستان آرمی نے فروری 1971 میں متعارف کرایا تھا۔ گزشتہ ساڑھے پانچ سال کے عرصے میں جب میں پاکستان کی حکومت چلاتا رہا، میں نے اس سے ملاقات نہیں کی۔ اس نے مجھے کئی خط لکھے جن میں التجائیں کی گئی تھیں کہ پانچ منٹ کے لئے اس سے ایک بار مل لوں۔ ان حالات میں، میں نے آفیسر اون سپیشل ڈیوٹی برائے پنجاب کو ہدایت کی وہ پتہ کرے کہ وہ کیا چاہتی ہے۔ جنرل رانی کے چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کی نئی فیم کے ساتھ انتہائی شاندار روابط ہیں۔ ان کے بے داغ اور پاک وزیر برائے افرادی قوت، جو بھارت سے تعلق رکھتے ہیں، جنرل یحییٰ خان کے "تین دور" میں انہوں نے جنرل رانی کے پورے اختیارات کو استعمال میں لائے تھے۔ آئیے ہم ان فضول لوگوں، رانی اور راجہ کی باتیں بند کریں۔ اس سے ایسا کوئی مقصد حاصل نہیں ہو سکتا کہ میری "غلطیوں" کے پیچھے بنادے کر زیادہ سنگین غلطیوں کو من مانی سے لطف لیتے ہوئے سامنے لایا جائے۔ فوجی حکومت ان غلطیوں کو جمہوریت بحال کر کے ٹھیک کر سکتی ہے کہ آمریت کو مزید مستحکم کرے۔ اس فوجی حکومت نے عوام کے منتخب نمائندوں سے اقتدار چھینا ہے اور اس جواز کے ساتھ کہ وہ اسے عوام کو واپس کر دیں گے۔ نہ کہ اپنی شان و شوکت اور چمک بک سے اُسے آگ کا گولہ بنا دیا جائے۔

میرے دور حکومت میں ایرجنسی کا نظاد حالات و واقعات کے شدید جبر کا نتیجہ تھا۔

کے بعد کہ شینگ کا مشیر اور وزیر برائے شینگ کو بے حساب گندم کی برآمد کا ٹھیکہ دے دیا گیا ہے۔ ”محبت کا آخری حرف بد لاجا چکا ہے۔“ سمندری جہازوں کے ایک ارب پتی مالک جس کی اس ملک میں حقیقی جڑیں بھی نہیں ہیں قوم پر تحو پ دیا گیا اسے اس فوجی حکومت نے یہ ٹھیکہ دیا ہے جس کا وزیر جہاز رانی ہے۔ کہ وہ اپنی کمپنی کے جہازوں کو استعمال کر کے پاکستان گندم لائے۔ جہاز رانی کا مشیر خود جہازوں کا اربوں پتی مالک اسے لاکھوں ٹن گندم برآمد کرنے کی اجازت داری دے دی گئی۔

یہ کہنا کہ جہازوں کے اربوں پتی مالک نیز مشیر یا وزیر کو یہ ٹھیکہ اس لئے مل گیا کہ اس کا ٹینڈر سب سے کم تھا تو یہ کہانی جو ٹوے پرندوں کے لئے ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ کرپشن کے پاتال میں گرنا ہے۔ کس فخر سے یہ تسلیم کیا گیا ہے کہ جیسے یہ کوئی نادر واقعہ ہو کہ اس نے ٹرانسپورٹ کا انتظام کر لیا ہے۔ جب کہ حقیقت یہ ہے کہ اس طریقے سے ہمارے ملک کو اس وزیر جہاز رانی کو پچاس لاکھ ڈالر کا اضافی منافع اس شرح سے زیادہ دیا جا رہا ہے جو اگر صحیح معنوں میں ٹینڈر لئے جاتے تو پخت ہو جاتی۔ واقعی، ملک میں گندم کی صورت حال خراب ہے۔ اگر ایسی صورت حال ایک منتخب حکومت کے دور میں پیدا ہو جاتی تو حزب اختلاف جب تک درجن بھر یا زیادہ سروں کو گرتے ہوئے نہ دیکھ لیتی، اس سے کم پر نہ رکتی لیکن ایک اربوں پتی جس کی قومیت مشکوک ہے ملک سے منافع حاصل کر رہا ہے۔ اور ہم 25 جنوری 1978 کو کیا دیکھ رہے ہیں۔ یہ کہ 27 اگست 1973 کو دوبارہ نافذ کیا جانے والوں کی پریشانیوں اور ہراسانیوں کے لئے کرپشن کی قلوپڑاؤں نے سرکس میں نشیمن سنبھال لی ہیں۔ یہ قلوپڑہ ملکہ نیل نہیں ہے۔ بلکہ جرات کے نالے کی کلی ہے۔ کرپشن کی اس قلوپڑہ کے ساتھ بیٹھے ہوؤں کے لئے چنگی بجا لے ہی زمین پر جنت اتر آئی ہے۔

یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ جہاں تک کرپشن کا تعلق ہے قرطاس ایضاً مجھے اس میں ملوث قرار دینے میں ناکام رہا ہے۔ اس کے صفحہ 18 پر رافز شید کا حوالہ دیا گیا ہے۔ جس میں انہوں نے کہا ”حکومت کا کمزور ترین پہلو یہ ہے کہ سیاسی کرپشن کو دبانے اور ختم کرنے کے عمل کا فقدان ہے۔“ اس سے لوگوں نے سمجھا ہے کہ حکومت اس قسم کی کرپشن کو نظر انداز کر رہی ہے۔ اس لئے یہ لازمی ہو گیا ہے کہ ہر صوبے میں سیاستدانوں نے جو کرپشن کی ہے ان کے خلاف سخت کارروائی کی جائے۔ ورنہ عظیم کو چاہئے کہ وہ چاروں وزرائے اعلیٰ سے رجوع کریں کہ وہ چند ایسے کیسوں کا انتخاب کریں اور اس کا ختم کرنے کے لئے اُن کے خلاف فوری طور پر مؤثر کارروائی کی جائے۔“ قرطاس ایضاً اپنے ہی الفاظ میں اس کی تصدیق کرتا ہے۔ ”ایسے امور

قوم کی دھجیاں بکھر چکی تھیں۔ ملک ٹکڑوں میں بٹ چکا تھا۔ کوئی آئین نہیں تھا۔ کرنسی کی قیمت کم کرنی پڑی۔ ہمارا پانچ ہزار مربع میل کا علاقہ بھارتی فوج کے قبضے میں تھا۔ نوے ہزار جنگی قیدی بھارت کی قید میں تھے۔ مجید آباد کے محکمہ موسمی کی دھکیاں دے رہا تھا۔ پٹنہ دیش کو تسلیم کرنے کا مسئلہ تھا۔ پولیس ہسپتال کر رہی تھی۔ مرکور ہسپتال کر رہے تھے حتیٰ کہ جیلو غیس بھی ہسپتال ہو رہی تھی۔ یہ ”جلاؤ“ اور ”گھیراؤ“ کے دن تھے۔ مزید برآں اسی زمانے میں بین الاقوامی اقتصادی اور مالی بحران سے بھی دوچار ہونا پڑا۔ تیل کی قیمتیں چار گنا بڑھ چکی تھیں۔ نوے سالہ پرانے احمدی مسئلے کو حل کرنا تھا۔ سندھ میں لسانی اختلافات کو طے کرنا تھا۔ معیشت کو بحال کرنا تھا۔ بلوچستان کی بغاوت کا مقابلہ کرنا تھا۔ صوبہ سرحد میں ہوں کے جو دھماکے ہو رہے تھے انہیں بند کرنا تھا۔ واؤد حکومت کی دھکیاں بھی توجہ پلانتی تھیں۔ شمالی علاقوں میں زبردست زلزلہ آیا۔ دوزبردست سیلاب آئے اور بارشیں سیلابی کا سبب بن گئیں۔ سندھ، راوی اور جہلم میں طغیانی آئی۔ زمین پانی کی چادر بن گئی۔ احمدیاد ویم کے ڈھانچے کے دوبارہ معاشے اور مرمت کا مسئلہ اٹھ کھڑا ہوا۔

یہ وہ چند بڑے مسائل تھے، جنہوں نے سب سے بعد دیگرے بڑی تیزی سے ملک پر یہ خیریں لٹائی تھیں۔ میری حکومت نے قوم کو موت کے جبروں سے باہر نکالا۔ ہم نے عوام کی قوت کے ہل بوتے پر شدید ترین مسائل پر قابو پایا۔ جہاں بہ تنظیمی کمی وہاں ہم نے اختیار پیدا کیا۔ ٹوٹ پھوٹ اور انتشار کو استحکام میں بدل دیا۔ ایک چھوٹا سیلاب، جو چھوٹا سا سیلاب بھی نہیں ہے اس نے فوجی حکومت کو پکڑا دیا ہے۔ میری حکومت کو پہلے مارشل لاء کے ترکے میں جو مسائل ملے تھے اگر ان کا ایک چوتھائی بھی اس فوجی حکومت کو ملتا تو یہ اب تک ٹوٹ پھوٹ کر ہوا میں تحلیل ہو چکی ہوتی۔ چند ماہ تک یہ فوجی حکومت بڑے ٹھانڈے ہاتھ سے، ان قابل تعریف حالات کے تحت، جو ہماری محنتوں کا نتیجہ تھے، دعوت اڑاتی رہی ہے۔ اب وقت آگیا ہے کہ جھوٹ اور جعلی موازنوں کا سلسلہ ختم ہو جائے۔ اگر ایمر بنسی کا شفاذ براتہا تو مارشل لاء اس سے بدتر ہے۔ اس فوجی حکومت کو مستقبل کی طرف دیکھنا چاہئے اور گنتی کرنی چاہیے کہ کتنے پوزے مرغئے کے لئے نگر آ رہے ہیں۔ ہمارے گناہ اب ایچندے پر نہیں رہے ہیں۔ اس فوجی ٹولے کی ڈائری وسط کرما کی نصف شب کے اسی لمحے لکھی جا رہی ہے۔

ایر جنسی کی حالت کے سامنے میں، انتخابات میں بد عنوانی کی سرگرمیاں، ہمیں کرپشن تک لے آئیں، جو تمام برائیوں کا سرچشمہ ہے باغ عدن میں داخل ہونے سے پہلے، اس کی دہلیز پر یہ کہنا ضروری ہے کہ درخت اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے۔ قوم کو بڑے فخر سے مطلع کرنے

میں مسٹر بھٹو کی منظوری کا بھی فقدان نہیں ملتا۔

ان اقتباسات سے یہ واضح ہوتا ہے کہ ہم نے اپنے کمزور ترین پہلوؤں پر غور و فکر کرنے میں اور ان کا مداوا کرنے میں کبھی کبھار کوتاہی کا مظاہرہ نہیں کیا۔ ہم نے ناخوشگوار واقعات کی سزا مارشل لاء کی سزاؤں سے نہیں دی۔ اس سے یہ بھی عیاں ہوتا ہے کہ جب بھی کرپشن کا معاملہ آیا میں کسی کو بھی معاف کرنا نہیں چاہتا تھا۔ میں نے فی الفور ان شکایات کو متعلقہ جازرہ تحقیقاتی اداروں کو روانہ کر دیا۔ جن میں آئی جی رسوائی ایف آئی ایف بھی شامل ہے۔ میرے زمانے میں ایف آئی ایف قانون کی اطاعت کرتی تھی۔ میرے پاس مارشل لاء کی یہ طاقت حاصل نہیں تھی کہ میں گواہوں سے جھٹی اور جھوٹے بیان لینے کے لئے ان پر تشدد کروں۔ مارشل لاء کے تحت کسی بھی شہری کو قانون کے تقاضوں کو پورا کئے بغیر، چند منٹوں میں قید یا شدت دی جاسکتی ہے۔ اس میں یہ ممکن ہے کہ حراست کے بعد ایک شخص کے بھی کم وقت میں کوڑوں کی سزا دی جاسکے۔ ہم خدا کے شکر گزار ہیں کہ ہمارے پاس ایسے شاندار مارشل لاء نہیں تھے۔ ہمیں قانونی طریقہ کار پر چلنا پڑتا تھا۔ قبل از گرفتاری ضمانتیں منظور کی جاتی تھیں۔ حتیٰ کہ کیس کی رجسٹریشن سے بھی پہلے۔ درخواست گزار کی ضمانت نہ صرف اس کیس میں ضمانت منظور کر لی جاتی تھی جس کے لئے اس نے درخواست دی تھی بلکہ اس کے خلاف کئے جانے والے مستقبل کے مقدموں میں بھی ضمانت قبل از گرفتاری دیدی جاتی تھی۔ خواہ وہ قابل سماعت اور عدالتوں کے دائرہ اختیار میں ہوتی تھیں یا نہیں ہوتی تھیں۔

چیف آف آرمی سٹاف جنرل ضیا الحق پر یہ دھن سوار تھی کہ کراچی کے ایک سیاست دان اور اس کے بیٹے کو گرفتار کیا جائے۔ ان کے اپنے قول کے مطابق، رنجیز کے پاس اس سیاست دان کی سمگلنگ کی سرگرمیوں کے سو فیصدی ثبوت موجود ہے۔ اسے یہ اجازت دیدی گئی۔ لیکن ایک ہفتے کے بعد، قانون نے مداخلت کی اور ان کے شکار کو رہا کر دیا۔ جب 28 اگست 1977 کو راولپنڈی میں میں ان سے ملا تو اس نے مجھے بڑی چمکتی ہوئی مسرت سے بتایا کہ مارشل لاء کے نفاذ کی وجہ سے اب اس شخص کو سزا دینے میں کوئی مشکل پیش نہ آنے گی۔ یہ سچ ہے کہ مارشل لاء کے تحت کسی کو بھی سزا دینا اب کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ جین گینے سے پہلے پہلے بہت کچھ ہو سکتا ہے۔ جب کہ مہذب قوانین کے تحت، میں کسی شخص کے ساتھ ایسا نہیں کر سکتا۔

صفحہ 214 پر قرطاس ایض میں بیان کیا گیا ہے ”بھٹو کی کابینہ کے وزیر اور پارٹی کے حامی، وہ ریکارڈ جو اس حکومت نے خود اپنے پیچھے چھوڑا ہے۔ اس کے مطابق دولت میں

ڈوبے ہوئے تھے۔ مثال کے طور پر ان کاغذات کا صرف کچھ حصہ جو مسٹر ممتاز علی بھٹو، جو اسی وقت وزیر مواصلات تھے اور مسٹر عبداللطیف پیرزادہ جو پہلے وزیر تعلیم اور پھر وزیر مالیات ہوئے کے بارے میں یہاں دیا جا رہا ہے تاکہ رویے کا جو لین دین چھپا کر ہوا تھا، اس پر کچھ روشنی پڑ سکے۔ یہ لین دین اس زمانے میں ہوا جس کا اب جائزہ لیا جا رہا ہے۔

قرطاس ایض اسی صفحے پر یہ تسلیم کرنے پر مجبور ہو گیا ہے کہ ”سابق وزیر اعظم نے 17 مئی 1976 کو انکوائری کا حکم جاری کیا تھا“ انکوائری ایف آئی ایف نے کی تھی۔ اس تاثر سے قطع نظر جو قرطاس ایض پیدا کرنا چاہتا ہے۔ مجھے ٹھوس انداز میں یہ مشورہ دیا گیا تھا کہ مزید کارروائی کے لئے مناسب ثبوت مہیا نہیں ہونے۔ اس حقیقت کو قرطاس ایض نے خود صفحہ 218 پر صریح کر کے تسلیم کیا ہے۔ اس کے بعد جب کسی عام شہری نے مجھے نہیں جانتا تھا، دو خط بھیجے جن میں مسٹر ممتاز علی بھٹو پر سنگین الزامات عائد کئے گئے تھے تو میں نے فوراً ڈائریکٹر انٹیلیجنس بیورو اور ایف آئی ایف کو حکم دیا کہ ”وہ اس سلسلے میں کارروائی کرے“ وہ ایک نامعلوم آدمی تھا، میں چاہتا تو ان خطوں کو محاذ دیتا یا فائل کر دیتا۔ لیکن میں نے کیا کہا؟ میں نے ایک نہیں بلکہ دو تحقیقاتی ایجنسیوں کو حکم دیا کہ وہ اس پر کارروائی کریں۔ قرطاس ایض کے صفحہ 218 پر ریکارڈ کیا گیا ہے۔ ڈائریکٹر انٹیلیجنس بیورو نے مجھے بتایا کہ متعلقہ فرد مسٹر ممتاز علی بھٹو کے خلاف عناد رکھتا ہے کیونکہ انہوں نے کسی معاملے میں اس کی بات نہیں مانی تھی۔

مسٹر عبداللطیف پیرزادہ کے بارے میں حوالہ دیا گیا ہے۔ اس کا تعلق اس رپورٹ سے ہے جو حکومت سندھ کے ڈپٹی انسپکٹر جنرل آف پولیس پیدیش اور کریمیل براؤنچ محمد عرفان نے پیدیش کی تھی۔ اس معاملے کی تحقیقات بھی ایف آئی ایف کے ذریعے کرائی گئیں۔ اس کا تعلق نیشنل سیکورٹی کمیٹی کراچی کو لائٹ سٹون کی سپلائی کے ٹھیکے کے متعلق تھا۔ صوبائی اور وفاقی تحقیقاتی ٹیمیں یہ معلوم کرنے میں کامیاب ہو گئی کہ کس طرح ”کم از کم سات ٹرک“ ایک خود ساختہ فرد نے پاکستان بینک قرضوں پر خریدے تھے۔ ایف آئی ایف کی رپورٹ محرکہ عظیم جنوری 1977 کا خلاصہ قرطاس ایض کے صفحات 219 اور 220 پر دیا گیا ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ میں نے قومی سلامتی کے خصوصی مشیر جنرل ٹکا خان سے اس معاملے پر بات چیت کی۔ لیکن میں نے اس کے خلاف کوئی کارروائی نہ کی۔ اس رپورٹ میں مجھے جو معلومات فراہم کی گئی تھیں، ان کی بنیاد پر کیا کارروائی کی جاسکتی تھی؟ معلومات یہ تھیں۔

(1) سلمان بروہی کبھی ایک مزدور تھا لیکن اب وہ ایک خوشحال ٹھیکیدار تھا۔ وہ ایسا شخص تھا جسے ہم برصغیر میں ایک سلف میڈ (خود ساختہ) آدمی کہتے ہیں۔

(ب) اس نے کچھ ٹرک جو چودہ سے زیادہ نہیں تھے غیر محفوظ بلاضمانت قرضوں پر حاصل کئے تھے۔

(ج) عام طور پر یہ مشہور ہے کہ مسٹر عبدالغنیظ پیرزادہ سلمان بروہی کے کاروبار میں حصے دار ہیں یہ اس پر بہت سے دلائل دیئے جاسکتے ہیں۔

(ا) یہاں بہت سے خود ساختہ افراد ہیں وہ صوبہ جسے کرپشن کے سلسلے میں کارروائی کرنے کے منتخب کیا گیا اور جو زیر بحث ہے۔ اس میں مسٹر عبداللہ ہارون سید کے زیادہ مشہور خود ساختہ آدمی ہیں۔ اس کا قطعاً یہ مطلب نہیں ہے کہ سر عبداللہ ہارون کے دوست کی حیثیت سے قائد اعظم کو غلط سمجھا جائے۔

(ب) رپورٹ میں کہا گیا تھا کہ بروہی بڑے ٹھانڈے بانڈ سے رہتا ہے اور اس نے کاروبار میں بہت دولت کمائی ہے۔ اس لئے وہ قرضہ جو بلاضمانت یا بلاضمانت، مسٹر عبدالغنیظ پیرزادہ کی وجہ سے دیئے گئے یا نہیں دئے گئے لیا جاسکتا تھا۔ اگر مسٹر پیرزادہ نے قرضوں کی سفارش کی تھی تو اس نے کسی دیوالیہ شخص کی سفارش نہیں کی تھی۔

(ج) پھر ایسا کون سا ثبوت پیش کیا گیا تھا کہ جس سے یہ ثابت ہو سکے مسٹر عبدالغنیظ پیرزادہ کاروبار میں بروہی کے حصے دار تھے۔ کہ ان کے خلاف کارروائی کی جاسکتی۔ ایسا کوئی ثبوت تحقیقاتی ایجنسیوں نے پیش نہیں کیا تھا۔ میں نے اس مسئلے پر جنرل ٹک خان سے تفصیل کے ساتھ بات چیت کی تھی۔ میں ایک وفاقی وزیر کو اس طرح بے وقعت نہیں کر سکتا تھا۔ اگر ہم اس کے خلاف کارروائی محض ان الفاظ "عام طور پر سمجھا جاتا ہے" پر کرتے تو اس طرح تو کوئی بھی ایسا شخص جو گڑھی پہنتا ہے اور ایک مناسب چھت کے نیچے اپنا سر رکھتا ہے شیعہ سے نہیں بچ سکتا۔ کون سا ایسا آدمی ہے جو صحیح دماغ رکھتے ہوئے مجھے یہ مشورہ دے سکتا ہے کہ جو کچھ اس رپورٹ میں فراہم کیا گیا ہے ان کی بنیاد پر کسی شخص کے خلاف کارروائی کی جاسکتی ہے؟

میں سیاسی کیریئر، اہم افراد کی شہرتوں کو محض گپ شپ اور افواہوں کی بنیاد پر پھانسی پر نہیں لٹکا سکتا۔ یہ تحقیقاتی ایجنسیوں کی ذمہ داری تھی کہ مجھے حصے داری کا کچھ ثبوت فراہم کرتے۔ یہ حکومت، اپنی ایک برس کی پاک و مقدس عمرانی کے ایک برس بعد خود اپنے زعمانی بدعنوانیوں کے بارے میں افواہیں سنیں گی۔ یہ سارا فساد اور عتاب سست یا اس سے زیادہ چودہ ٹرکوں کی وجہ سے کیا جا رہا ہے۔ اور اس وقت جب کہ مارشل لاء ایڈمنسٹریشن کہتا ہے کہ اس نے اپنے جہاز رانی کے مشیر، ایک ارب پتی جہازران کو لاکھوں ٹن گندم اس کے جہازوں میں اسپورٹ

کرنے کی اجارہ داری بخش دی ہے۔

تیسرا کیس صفحات 229 سے 234 تک نام نہاد ملین ڈالر الیکشن فنڈ کے بارے میں ہے یہ ایک جعلی اور بے بنیاد کہانی ہے۔ جہاں تک میں اس کی تصدیق کروں گا تو یہ پتنگ بازی ہے۔ قرطاس ایض صفحہ 229 پر بیان کرتا ہے۔ شکایات پر دستخط فرضی ناموں کے تھے۔ معمول کے مطابق ایسی شکایتوں پر غور نہیں کیا جاتا۔

قرطاس ایض اعتراف کرتا ہے کہ ان شکایات پر فرضی دستخط اور عام طور پر ایسی شکایتوں پر توجہ نہیں دی جاتی۔ طے شدہ طریق کار کے مطابق ایسی شکایات فائل کر دی جاتی ہیں۔ اسی کا صحیح طریقہ یہ تھا کہ شکایات کو فائل یا ضائع کر دیا جاتا ہے۔ کیونکہ ان سے کچھ حاصل نہ ہوتا تھا۔ طے شدہ ضابطے کے برعکس میں نے متعلقہ وزیر کو اس ہدایت کے ساتھ بخجوادیا، یہ بہت سنجیدہ معاملہ ہے۔ میں مکمل انکوائری چاہتا ہوں۔ قصور وار کو اس کی پوری سزا دی جائے۔ (صفحہ 230)

فیاضی کے بغیر جیسے کہ قرطاس ایض میں کھینچ تان کر بات بنائی جاتی ہے۔ صفحہ 230 پر قرطاس ایض کہتا ہے۔ اس ریکارڈ میں فیسلے کرنے سے پہلے کا عنصر پایا جاتا ہے۔ مسٹر بخٹو کیوں اور کیسے، بیکہ انکوائری ہی نہیں ہوئی، اس نتیجے تک کیسے پہنچے۔

اگر میں ثبوت کے فقدان کی وجہ سے کسی وزیر کے خلاف کارروائی نہیں کرتا تو مجھ پر تنقید کی جاتی ہے۔ اگر میں مجرم شخص کو سزا دینے کی دھمکی دیتا ہوں تو مجھ پر تنقید کی جاتی ہے۔ جب کہ فطری بات یہ ہے کہ یہ دھمکی اس صورت میں دی گئی ہے کہ اگر الزامات ثابت ہو جائیں تو سزا دی جائے۔ قرطاس ایض اسی صفحے پر تسلیم کرتا ہے "انکوائری کے دوران بہت کم آڈیٹنگ اور اکثر متنازع قسم کا ڈھیروں ریکارڈ جمع ہو گیا تھا۔ جنہیں متوازی خطوط پر خودی آتی ایم اور ایف آئی اے نے تحقیقات کیں مؤخر الذکر انکوائری کا حکم وزیر اعظم نے دیا تھا۔"

ایک ایسی شکایت جسے میں قانونی طور پر داخل دفتر کر سکتا تھا۔ اور جس کا اعتراف خود قرطاس ایض نے کیا ہے۔ میں نے اس پر ایک سخت نوٹ متعلقہ وزیر کے نام لکھا اور ایف آئی اے کو بھی تحقیقات کرنے کے لئے کہا۔ 9 دسمبر 1979 کو وزیر پیداوار مسٹر رفیع رضانے ایک نوٹ لکھ کر بھیجا جس میں پلانڈیشن کی وضاحت کی گئی تھی۔ جیسا کہ اس نوٹ میں دیکھا جاسکتا ہے جو بطور نمبر 248 شامل کیا گیا ہے۔ اس کے بارے میں کچھ بھی نہیں کیا جاسکتا تھا۔ الزام کے برعکس انتظامات میں ایک پریس بھی بطور کنفرس میوشن نہیں لیا گیا تھا۔ یہ دونوں انکوائریاں خود سب کچھ کہہ رہی ہیں۔ سچی کہ جاپان میں پاکستان کے سفیر سے بھی ایف آئی اے

نے رابطہ قائم کیا۔ اگر وہ سامنے آکر یہ کہیں کہ ایسے سکینڈل میں مافی پر مبنی الزامات میں سچائی کا ایک ذرہ بھی موجود ہے تو میں انہیں خوش آمدید کہوں گا۔ ایک بوکس ایکشن فنڈ کے ساتھ ریشہ کاروں کا ربط جو ریسے کی وجہ صاف عیاں ہے۔ انہیں اس ریسے میں اس لئے ہنزا گیا ہے کہ یہ کہا جاتا ہے کہ وہ انتخابی الیم کے انچارج تھے۔ رفیع رضا ایک مجازیر سٹریٹ لاء ہیں اور وہ اپنا دفاع خود کر سکتے ہیں۔ عبدالحفیظ پیرزادہ بھی ایک ممتاز سٹریٹ لاء ہیں اور وہ بھی اپنے مفادات کا تحفظ کر سکتے ہیں اس وقت وہ ایسٹ نااہل قرار دینے جانے والے ٹریبونل کا سامنا کر رہے ہیں۔ مسٹر ممتاز علی بھٹو ایک شہزادے ہیں اور ایک شہزادے کے فرزند۔ وہ ایک سٹریٹ لاء ہیں اور وہ اپنی شہرت کا دفاع کرنے کے اہل ہیں۔

میرا واسطہ دراصل اصولوں سے ہے۔ اس سلسلے میں قرطاس انیشی اٹو ہے۔ چیئرمین کی کابینہ کے وزیر اور پارٹی کے حامی، وہ ریکارڈ جو اس حکومت نے خود اپنے پیچھے چھوڑا ہے، اسی کے مطابق دولت میں ڈوبے ہوئے تھے۔ مثال کے طور پر ان کاغذات کا صرف کچھ حصہ جو مسٹر ممتاز علی بھٹو، جو اس وقت وزیر مواصلات تھے اور مسٹر عبدالحفیظ جو پہلے وزیر تعلیم اور پھر وزیر مالیات ہوئے، کے بارے میں یہاں دیا جا رہا ہے۔۔۔ (قرطاس انیشی صفحہ 214) یہ بتانا کتنا دلچسپ اور مزیدار ہے کہ میری حکومت انھوں پر مشتمل تھی، جس نے اپنے پیچھے ایسا ریکارڈ چھوڑ دیا جو یہ دکھاتا ہے کہ وہ دولت میں ڈوبے ہوئے تھے۔

یہ بیان اس چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کے اس بیان سے بھی متصادم ہے جو اس نے یکم جنوری 1978 کو راولپنڈی میں پریس کانفرنس میں دیا تھا۔ روزنامہ جنگ کے ایڈیٹر کے وجہ ان سوال کے جواب میں دیا تھا کہ عوام میں محاسبہ کی سست رفتار سے اشتعال اور بے چینی پیدا ہو رہی ہے۔ جنرل ضیا الحق نے کہا کہ ہم ذہین لوگ تھے۔ اسی قسم کے آدمی نہیں تھے کہ اپنے پیچھے ضیاء الحق کے لئے ایسا ریکارڈ چھوڑ جاتے جو ہمارے خلاف ثبوت ہوتا۔

وفاقی حکومت میں تیس یا اس سے زیادہ وزیر، خصوصی معاون اور مشیر تھے۔ 1971 سے سندھ اور پنجاب کے صوبوں میں ہماری پارٹی کی حکومتیں تھیں۔ 1973 کے موسم بہار میں پاکستان پیپلز پارٹی بلوچستان اور صوبہ سرحد میں بھی برسر اقتدار آگئی۔ اس کا مفہوم یہ ہے کہ پاکستان پیپلز پارٹی مرکز اور چاروں صوبوں میں کئی برسوں تک اقتدار میں رہی۔ ہر صوبائی حکومت کے اپنے کئی وزیر اور مشیر تھے۔ ملک بھر میں پارٹی کے حامیوں کی تعداد کا کوئی شمار نہیں ہو سکتا۔ قرطاس انیشی کے نقطہ نظر کے مطابق کہ میری کابینہ کے وزیر دولت میں

ڈوبے ہوئے تھے۔ میں حیران ہوں کہ کیا یہ ایک انتہائی حادثہ ہے کہ ممتاز علی بھٹو اور عبدالحفیظ پیرزادہ بھی کو چننا گیا ہے؟ میں یہ سوال ایک جائزہ برہمی اور طیش سے پوچھتا ہوں کہ کیا ایک صدر اور وزیر اعظم کی موت کی مثال لے کر سیاسی کرپشن کی تمام مثالیں صرف ایک صوبے سے ہی قائم کی جا رہی ہیں۔

جب چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر جولائی 1977 میں مجھے مری میں ملے اور جب ایک ماہ بعد ہماری راولپنڈی میں ملاقات ہوئی تو اس نے ذہنوں میں سے ایک کی بدبودار کرپشن کے بارے میں ضرر رساں انداز میں بات کی۔ لیکن اسے ہی نکال دیا گیا کیونکہ وہی غداری کر کے فوجی حکومت سے ساز باز کر کے ان کا سنا بھی بن گیا تھا۔ لیکن اگر افراد کا ایک دستہ دولت میں ڈوبا ہوا تھا تو مثال کے لئے صرف انہی دو گناہکاروں کو ہی کیوں چننا گیا۔ میں اس پر قطعاً حیران نہیں ہوا، کیونکہ اس کے برعکس اس فوجی ٹولے کی حکمت علی اور سازش کو بھونی سمجھا جاسکتا ہے کہ پاکستان کی تمام برائیوں کو پیش کرنے کے لئے مثالیں ایک ہی صوبے سے کیوں پیش کی جا رہی ہیں۔ اب مجھے اس ٹیلی گرام کا صحیح مفہوم کا علم ہو گیا ہے۔ جو سرچارلس نیپیئر نے میانی کی لڑائی کے بعد ملکہ وکٹوریہ کو بھیجا تھا۔ اس نے فقیہ الفاظ میں یہ پیغام بھیجا تھا ”میں سندھ حاصل کر چکا“ اس سوال کو پوچھتے ہوئے ان بیانات حلفی کے متن بھی میرے سامنے ہیں جو غلام مصطفیٰ کھر اور راؤ عبد الرشید نے سپریم کورٹ میں اپیل میں داخل کئے تھے۔ راؤ عبد الرشید نے دوسری باتوں کے علاوہ بتایا کہ بریگیڈیئر نعیم نے انہیں ایڈم آباد میں کیا۔ مصیبت یہ ہے کہ سب سے بڑا صوبہ جو کہ پنجاب ہے اسے ہمیشہ اقتدار میں حصہ دینے سے انکار کیا گیا ہے۔ اور فوج پر ضمانت چاہے گی کہ پنجاب کو ملک کی حکمرانی میں اس کا مناسب حصہ دیا جائے“

راجی، بریگیڈیئر نعیم نے 1977 کے انتخابات کی انکوائری کی۔ اس کی کمیٹی نے لگ بھگ نو سو شہادتیں لیں۔ قرطاس انیشی اسے عمدہ کام اتنے مختصر عرصے میں انجام دینے پر خراج تحسین پیش کرتا ہے۔ یقیناً ان کے پاس استقامت نہیں۔ تاکہ وہ بنیادی گواہوں کی شہادتیں لیتے جو ان کی رسائی میں تھے۔ موجود تھے اور جن کا پتہ بہ آسانی چلایا جاسکتا تھا۔ ایک ہزار پوائس صفحات پر مشتمل یہ ضخیم قرطاس انیشی براہ راست اور حقیقی شہادتوں سے خالی ہے۔

یہ ضخیم دستاویز بریگیڈیئر نعیم کی انکوائری کمیٹی کی تحقیقات پر استوار ہے۔ جھوٹے صوبوں کے خلاف اس کی محاسمت واضح طور پر ظاہر ہو چکی ہے۔

پوچھنے کے لئے میرے پاس کئی معقول دل لگتے سوالات ہیں۔ ان سوالوں کا وقت ضرور آئے گا۔ اگر مجھے پچاسی دے کر منتقل کر دیا گیا تو ان سوالوں کو یہ شور و غل بچا کر کہ ”یہ

حکومت ریکارڈ خود اپنے پیچھے چھوڑ گئی ہے۔ نتیجہ کیسے نکلیں یا نکالا نہیں جاسکتا۔ جب تک ان سوالوں کا جواب آئے۔ گزٹ یا تہائی، تصادم اور انتشار آئے گا۔ ان دستاویزی اور اہم ترین نکات کی طرف توجہ دلو اگر میں صوبہ پرستی کا پرچار نہیں کر رہا۔ میں صوبہ پرستی کو ظاہر کرتے ہوئے اسی کی شدید مذمت کر رہا ہوں۔

(۱۱)

غیر ملکی ہاتھ

قرطاس ایض کی حدود میں ہی آگے بڑھتے ہوئے پھر کرپشن کے بعد سیاسی پارٹیوں کے فنڈز کی باری آئے گی۔ پارٹی فنڈز کے سلسلے میں قرطاس ایض نے میری پارٹی اور مجھ پر تہمتیں لگائی ہیں۔ اس میں ایک غیر ملکی سربراہ مملکت کو بھی ملوث کرنے میں کسی قسم کی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کی۔ اس کے مشمولات میں ہماری پارٹی کے بینک اکاؤنٹوں کے بھی کئی حوالے ملتے ہیں۔ ہماری بدنامی اور رسوائی کی کوئی کسر اٹھانا نہیں رہی گئی۔ انتخابات کے لئے فنڈز کی ضرورت ہوتی ہے۔ روپیہ انتخابات کے لئے استہابی ضروری ہوتا ہے جتنا موٹر کاروں کے لئے پٹرول۔ کلیننگی اور کانگریس کو برلا، ڈالیا اور تانا جیسے بڑے صنعتکاروں نے مالی مدد دی تھی۔ جب آزادی قریب تر آنے لگی تو مہاراجوں نے بھی کانگریس کے فنڈز میں مدد دے کر اضافہ کیا۔ مسلم لیگ کی تحریک کو بھی اصفہانیوں راجہ صاحب محمود آباد اور بعض دوسرے افراد نے مالی سپورٹیں فراہم کی تھیں۔ جب تقسیم قریب تر آگئی تو نظام حیدر آباد، نواب جونا گڑھ اور نواب بھوپال کے علاوہ بعض دوسروں نے بھی اپنا کردار ادا کیا۔ 1965 کے انتخابات کے دوران ایوب خان نے صنعت کاروں کو دوا اور ٹیوٹا۔ اُس نے پاکستان میں کاروبار کرنے والی غیر ملکی کمپنیوں بطور خاص غیر ملکی آئل کمپنیوں سے بھی آزادانہ مالی چندے حاصل کئے۔

مؤقر پورٹوں کے مطابق، حال ہی میں موجودہ حکومت نے اصلی مسلم لیگ کے فنڈز اس کی نائب نمائندگی کو دیے ہیں۔ 1958 میں جب مارشل لاء کے تحت یہ فنڈز قبضے میں لئے گئے تو اس وقت رقم دو کروڑ (20 ملین) کے لگ بھگ تھی۔ اب مرکب سودور سود کے بعد یہ ایک بہت بڑی رقم بن چکی ہوئی۔ یہ خطیر رقم کجرات کے کسی گندی چھت والے مکان پر حالیہ بارشوں میں تو نہیں برہی۔ کسی اہمیت کی حامل، واحد سیاسی جماعت جسے انتخابات یا تنظیم کے لئے فنڈز کی ضرورت نہیں پڑتی، جماعت اسلامی ہے۔ یہ پارٹی قربانی کی کھالوں پر زندہ رہی

ہے اسے روپے کی ضرورت نہیں۔ وہ چیک جو مودودی نے یہ ون ملک سے وصول کیا اور جس کا فوٹو سٹیٹ اخبارات میں شائع ہو چکا ہے، ملوہ ہانٹے کے لئے تھا۔ قرطاس ایضاً یہ کہتے ہوئے ممکن ہے کہ جب ہم ہوائی جہازوں میں اڑتے تھے تو پی لین اسے گدھا گاڑیاں استعمال کرتی تھی۔ جب پاکستان ہینڈل پارٹی ریل گاڑیوں اور بسوں پر سفر کرتی تھی تو پی لین اسے والے اپنا سفر ریل گاڑیوں پر یا ہینڈل سٹے کرتے تھے۔ جب پی پی پی کو فنڈز کی ضرورت ہوتی اور استعمال کئے جاتے تو پی لین اسے کی مہم خود بخود چل پڑتی تھی۔ ہم نے فنڈز استعمال ضرور کئے لیکن غیر ملکی فنڈز استعمال نہیں کئے۔ پی لین اسے نے بھی فنڈز کا استعمال کیا لیکن یہ غیر ملکی فنڈز تھے۔ انہی حال ہی میں پی لین اسے کے سیاست دانوں میں فنڈز کے نامناسب استعمال پر ایک دوسرے پر الزامات عائد کئے گئے ہیں۔ مسلم لیگ کے ایک رکن نے الزام چھلایا ہے کہ پی لین اسے کی تحریک کے درمیان اسفر خان کو کئی لاکھ روپے دیئے گئے تھے۔ جس کا کوئی حساب انہوں نے پی لین اسے کو نہیں دیا۔

یہ بات سامنے آچکی ہے کہ پی لین اسے نے میری حکومت ختم کرنے کے لئے جو تحریک چلائی وہ برصغیر کی تاریخ میں بہترین مالی تحریک تھی۔ جس میں ان گنت روپیہ خرچ کیا گیا۔ فعال کارکنوں اور جلسوں میں حصہ لینے والوں کو یومیہ معاوضہ، ٹرانسپورٹ، سہولتیں اور تفریحی الاؤنس دیئے جاتے تھے۔ ان کے لئے فیاضانہ تلافی کی گئی جو تصادم میں مارے گئے یا زخمی ہوئے۔ وہ موٹر سائیکلیں اور سائیکلیں جو ہم نے اپنے نادار اور مستحق کارکنوں کو دیئے وہ پارٹی فنڈز سے دی گئی تھیں۔ یہ موٹر سائیکلیں اور سائیکلیں غیر قانونی طور پر ضبط کر لی گئیں کیونکہ یہ رجعت پسند نظام پر رواشت نہیں کر سکتا کہ ایک عام آدمی، ایک غریب اور پسماندہ آدمی اپنی پارٹی سے ایسی سہولت حاصل کر سکے۔

جہاں تک قرطاس ایض کے تیز مطالبے سے جمع کر چکا ہوں اس میں پی لین اسے کے فنڈز کے حوالے سے اندازاً چار حوالے دئے گئے ہیں۔ جو قرطاس ایض کے صفحات 237، 238 اور 239 پر بیان کئے گئے ہیں۔ اور میں انہیں پورا منتقل کروں گا۔

”پی لین اسے نے انتخابات کیسے لڑے اور کس طرح ضروری فنڈز جمع کئے اس قرطاس ایض کا موضوع نہیں ہے۔ جو کہ بنیادی طور پر عام انتخابات کے انعقاد کے متعلق ہے۔ جس کی ذمہ داری حکمران پارٹی اور الیکشن کمیشن پر عائد ہوتی تھی۔ مسٹر بھٹو نے پی لین اسے کے فنڈز کے ذرائع کے بارے میں اپنی رائے دی تھی۔ ان کے ساتھ انصاف روار کھنے کے لئے ضروری ہے کہ اسے ریکارڈ پر لایا جائے۔“

”قومی اسمبلی اور سینٹ کے مشترکہ اجلاس سے 28 اپریل 1977 کو خطاب کرتے ہوئے انہوں نے کہا ”کیا یہ راز ہے کہ گزشتہ چند ماہ میں کس طرح پاکستان میں غیر ملکی کرنسی کا سیلاب آیا ہے؟ ایسی ریل بیٹل کی کوئی مثال نہیں ملتی۔ اسی کے نتیجے میں کراچی میں ڈالر کی قیمت گر کر سات روپوں سے چھ روپے تک پہنچ گئی۔ یہ روپیہ لوگوں کو مختلف کام کرنے کے لئے رشوت میں دیا گیا۔ انہیں بیٹل جانے کے لئے رشوت دی گئی۔ انہیں اذانیں دینے کے لئے رشوت دی گئی۔ بہت سے ڈاکو، دودھ والوں اور میٹر ریڈروں کو پی پی پی پی مخالفانہ لٹریچر تقسیم کرنے کے لئے رشوتیں دی گئیں۔ ڈالروں کو طشتریوں میں پیش کیا گیا۔ میری پارٹی کے ارکان میرے نوٹس میں یہ باتیں لارہے تھے لیکن میں احتجاج کے لئے باہر نہیں نکلا۔“

”ڈالروں کی اس ریل بیٹل کے بارے میں ایک اور حوالہ ان سرکاری کاغذات میں ملتا ہے۔ جو اس وقت کے وزیر اطلاعات مسٹر طاہر محمد خان کی ذرائع ابلاغ کے سربراہوں کے ساتھ یومیہ کارروائی سے متعلق ہے۔ 27 اپریل 1977 کو مینیٹک کی تحریری کارروائی میں پی پی پی کے لئے ایک ہدایت کے ضمن میں تجاویز ایک خبری کہانی تھی کہ پشاور اور کوئٹہ میں ڈالر سستے نرخوں پر بک رہے ہیں اس کے پیچھے آئیڈیہ تھا کہ مسٹر بھٹو پر الزامی حملے کے لئے زمین ہموار کی جائے۔ یہ حملہ تو پسپا کر دیا گیا لیکن مسٹر بھٹو کراچی کی منڈی کے ذکر کو ترجیح دیتے ہیں۔“

”28 مارچ 1977 کو ”منتخب“ قومی اسمبلی کی حلف برداری کی تقریر میں مسٹر بھٹو نے بھر حال قدر سے مختلف انداز میں بات کی اس تقریر میں انہوں نے کہا تھا۔ ”اگر میں اشتعال میں آجاؤں یا حوالہ مستند ہے تو پھر میں یہ ثابت کرنے کے لئے مکمل اقتباسات دہرا سکتا ہوں کہ کس طرح وہ اپنی اندرونی کونسل میں یہ دعوے کرتے ہیں ان کی قوت، وسائل اور پیسے سمندر پار سے آئے ہیں۔ کیا یہ جائز تھا کہ ایوزیشن کے ارکان ایسی غیر ذمہ داری کا مظاہرہ ایسے دعوے کے ساتھ کرتے انہوں نے انتخابات جیتنے کی قسم کھا رکھی تھی اور ان کے وسائل پاکستان کی سرحدوں کے باہر سے آئے۔ اس سلسلے میں ایوزیشن جو دعوے کر رہی ہے میں ان پر یقین کرنا پسند نہیں کرتا۔ وہ ہرزہ سرا، نا تجربہ کار اور غیر ذمہ دار ہیں کیونکہ جیسا کہ آپ جانتے ہیں دنیا کے تمام ملکوں کے ساتھ ہمارے تعلقات بہت شاندار اور عمدہ ہیں۔“

”پی پی پی کے پلیٹ فارم سے جو کسی تقریر میں یہ الزام دہرایا جاتا رہا کہ پی لین اسے

نے غیر ملکی مدد حاصل کی ہے۔ 25 کروڑ روپے کی رقم کا ذکر کیا گیا۔ یہ بات بھی کبھی گئی کہ ظلیج کی منڈی سے پاکستانی کرنسی غائب ہو گئی۔ اگر ایسا ہوا تو پی لین اسے لے گیا کیا اس کے علاوہ بھی کچھ ہوا ہو گا۔ جیسے کہ آغا حسن عابدی کے سفر، جن میں روپوں سے بھرے ہوئے تھیلوں سے لدے پھندے آتے تھے۔ مسٹر بھٹو نے اس سلسلے میں اپنی طرف سے پی لین اسے پر لٹکانے کے الزام کے بارے میں موضوع ”محل اقتدار“ بھی نہ دہرائے جب تک وہ اقتدار میں رہے اور اس کے بعد بھی انہوں نے اس سلسلے میں کوئی ثبوت پیش نہ کیا۔ اگرچہ ان کے وکلاء نے سپریم کورٹ کے سامنے اصلی خطوط پیش کئے ہیں لیکن ایسی کوئی دستاویز جو پی لین اسے کے فائدہ حاصل کرنے کے الزام کے بارے میں ہو ابھی تک روشنی میں نہیں آئے۔ وہ ریکارڈ جو وزیر اعظم کے سیکریٹریٹ سے دوبارہ حاصل ہوئے ہیں ان میں پی لین اسے کے اندرونی مالیاتی امور کے حوالے ملتے ہیں۔ ایک رپورٹ (شمولات نمبر 259) کے ذریعہ مورخہ 12 اپریل کو بھیجی تھی۔ اس میں بیان کیا گیا ہے۔

”ان لوگوں میں سے جنہوں نے پی لین اسے کے فائدہ میں بڑی رقوم لاہور میں دی ہیں۔ وہ شہزادہ منوں نسیم سہگل، فضل دین اینڈ سز، شیخ سلیم علی (دین فیکسی والے) ہیں پی لین اسے کے احتجاجی فائدے کے لئے یہ معلوم ہوا ہے کہ گورنر انوال کے عاجزوں نے رقوم دی ہیں۔ ان میں سے بہت سے لوگ جن کا نام لیا جاتا ہے ان میں ایک ”حاجی بلیک“ ہے۔ اس کا بھیجا عزیز انصاری (جو اب قاتلانہ حملے کی واردات اور دوسرے الزامات میں جیل میں ہے) سیاسی طور پر سرگرم رہا ہے۔ جب تک احتجاج کا سلسلہ جاری ہے اسے رہا نہیں کیا جانا چاہیے۔

انکم ٹیکس ڈیپارٹمنٹس، ایکسٹرا اینڈ فیکسیشن کے شعبوں سے کہا جائے کہ وہ ان صنعت کاروں کا خیال رکھیں تاکہ یہ کسی دوسری طرف مصروف ہو کر احتجاج میں دلچسپی لینا چھوڑ دیں۔ وزارت تجارت سے بھی کہا جائے کہ عارضی طور پر ان لوگوں کو بلیک لسٹ کر دیا جائے اور جب تک احتجاج بند نہیں ہوتا انہیں امپورٹ ایکسپورٹ کا کوئی لائسنس جاری نہ کیا جائے۔ تاکہ وہ اپنے کاروبار پر زیادہ سے زیادہ توجہ دیتے ہوئے سیاسی احتجاج میں کم سے کم دلچسپی لیں۔ براہ کرم نوٹ کر لیجیے کہ ایسی صفت اور ایسے ہی مفاد رکھنے والے نوٹ صرف لاہور ہی میں نہیں بلکہ ہر جگہ ہیں۔“

جو تھا حوالہ جو مابعدہ کے عنوان کے تحت صفحہ 283 پر دیا گیا ہے۔ صفحات 237، 238

اور 239 پر دیئے گئے بنیادی حقائق کی تکرار ہے۔ تاہم یہ اس لئے منتقل کرنے کے قابل ہے کہ اس میں پی لین اسے کے دفاع کے لئے موجودہ حکومت کی فکر مندی دکھائی دیتی ہے۔

تحریک (پی لین اسے) کے خلاف حکومت نے حملہ کرنے کی جو ایک دوسری لائن اپنائی یہ تھی کہ اس کے شروع ہوتے ہی اس سنگین پہلو کی تشہیر کی گئی کہ اس کا منصوبہ بنانے اور اسے مالی امداد دینے والی قومی غیر ملکی طاقتیں ہیں جو انقلابی حکومت کے خاتمے میں دلچسپی رکھتی ہیں۔ یہ الزام کہ غیر ملکی رومیہ پاکستان میں بہہ رہا تھا، اس پر سابقہ باب میں بحث ہو چکی ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ حقیقت میں اس کی کوئی بنیاد نہیں تھی۔ نہ ہی کوئی ایسا ثبوت ملا ہے جس سے پتہ چلتا ہو کہ احتجاج میں کوئی غیر ملکی طاقت ملوث تھی۔ یہ اس حکومت کا فرض تھا کہ یہ ثبوت شائع کرتی لیکن ایسا نہیں کیا گیا۔

یہ امر دلچسپ ہے کہ ابتدا میں ہی جب سرکاری پرائیگنڈے میں تحریک کے پس منظر میں غیر ملکی ہاتھ کے سکنل دئے جانے لگے تو خود مسٹر بھٹو نے پہلے بڑا اذیت ناک طریقہ اپنایا۔ 28 مارچ 1977 کو انہوں نے اس الزام تراشی کا آغاز کیا کہ پی لین اسے کی انتخابی مہم کے دوران پی لین اسے نے دعویٰ کیا تھا اسے ہر طرح سے انتخاب جیتنے میں کیونکہ انہیں وسائل بیرون ملک سے ملے ہیں مسٹر بھٹو نے بھی اس کا کوئی ثبوت پیش نہ کیا بلکہ یہ الزام لگایا یہ دعویٰ لیوریشن کی اندرونی کونسل سے منکشف ہو کر باہر آیا ہے۔ اور انہوں نے اس ذریعہ کے انکشاف کی دھمکی بھی دی ایسی دھمکی جو عملی شکل میں کبھی سامنے نہ آ سکی۔

یہ پی لین اسے کے لئے ایک کھلم کھلی شرمناک معذرت ہے فوجی حکومت پی لین اسے کا ایسے طریقے سے کیوں دفاع کر رہی ہے کہ جیسے کہ دونوں ایک ہیں اور ایک جیسے 59 جولائی 1977 کی افغانی تقریر سے اب تک سکھریرا کے نیچے سب بہت سا پانی بہہ چکا ہے کہ کسی سے کبھی اسے ”آپریشن فیئر پلے“ کے متعلق پوچھا جاسکے۔ جنوری 1977 سے ہی پی لین اسے اور پیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر ایک دوسرے کے ساتھ کھل مل گئے تھے۔ احتجاجات تو ایک روزمرہ کا معاملہ ہوتا ہے۔ لیکن شہری لباس پہنوا کر جوانوں کو پی لین اسے کے مظاہروں میں اس لئے بھیجا جاتا کہ جوم بڑا ہو اور لوگوں میں اشتعال پیدا کیا جاسکے۔

لاہور میں احتجاج کے دنوں میں چوتھی کوریس کے تین بریگیڈروں نے کھلم کھلا جس طرح احکامات کی نافرمانی کی، یہ پہلے سے طے شدہ تھا۔ حتیٰ کہ اس نام نہاد نافرمانی کے وقت

بریگیڈیروں کا کورٹ مارشل نہیں کیا گیا۔ حتیٰ کہ انہیں ملازمتوں سے بھی ڈسمس نہ کیا گیا۔ اس فیصل میں انہوں نے جو کردار ادا کیا تھا اسے سراہتے ہوئے انہیں راولپنڈی تبدیل کر دیا گیا تاکہ وہ منظروں سے اوجھل ہو جائیں۔ اسے ایک ایسی طرح اور طریقے سے ترقی دی جا چکی ہوگی یا انعام دینے کا پلٹے ہوں گے۔ جس طرح کراچی میں جب مسٹر عزیز احمد وزیر خارجہ خطاب کر رہے تھے تو جوئیئر فوجی افسروں کو حکم دیا گیا تھا کہ ان پر سوالوں کی پوچھا کر کے انہیں تنبیہ کر دیا جائے۔ جنرل اقبال کے استعفیٰ کی کہانی محض ایک چال تھی۔ 5 جولائی 1977 کو چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر نے اپنی تقریر میں خود تسلیم کیا کہ تین شہروں میں لگایا جائے والا مارشل لا۔۔۔ لوالنگڑ مارشل لا تھا۔ ساکھوڑی و داستان بھی چیف آف آرمی سٹاف کی دیکھو وہ اجازت سے ہی گھڑی کٹی تھی۔

ہے ان الزامات کا ذمہ دار مجھے ہر گز نہیں ہے۔ اس دستاویز میں یہ حقائق موجود ہیں کہ پی پی پی نے انتخابات کیسے لڑے کس طرح فٹڈز جمع کئے یہ قریطاس ایض کا موضوع نہیں ہے۔ جو کہ بنیادی طور پر عام انتخابات کے انعقاد اور طرز عمل سے متعلق ہے۔ جس کی ذمہ داری حکمران جماعت اور الیکشن کمیشن پر تھی (صفحہ 237)

اگر ”پی این اے“ نے انتخابات کس طرح لڑے اور کس طرح فنڈز جمع کئے اسے قریطاس ایض کا موضوع نہیں ہے۔“ تو اس حوالے سے قریطاس ایض اس موضوع پر بھی بات نہیں کر سکتا کہ پی این پی نے کس طرح انتخابات لڑا اور کس طرح ضروری فنڈز جمع کئے۔ اگر انتخابات میں پی این اے کی سرگرمیاں اور رویہ قریطاس ایض کے دائرے سے باہر ہے تو پھر انتخابات میں پی این پی کا رویہ بھی قریطاس ایض کی شرطی چال میں محض اس لئے نہیں آسکتا کہ پی این پی حکمران پارٹی تھی۔ حکمران جماعت اور اپوزیشن پی این اے انتخابات میں دونوں فریقین تھے عام انتخابات کے رویے میں بھی ان دونوں کی شرکت تھی۔ اگر اپوزیشن بائیکاٹ کر دیتی تو انتخابات ہی نہ ہو سکتے تھے۔ عام انتخابات کا رویہ اور طرز عمل مقابلے سے بنم لیتا ہے۔ دونوں فریقین کی سرگرمیاں جائز اور صحیح ہیں۔ انتخابات حکمران جماعت اور الیکشن کمیشن کے مابین نہیں تھے کہ جس میں پی این اے ایک بے کار اور مست تماشائی تھی عام انتخابات کے بارے میں جس طرح کی بھی بات ہوگی اس کا تعلق دونوں فریقین حکمران پارٹی اور اپوزیشن میں برابر برابر بنتا ہے۔

رہے۔ اور اس کے بعد بھی انہوں نے کوئی ثبوت پیش نہیں کیا۔ یہ فوجی ٹولہ ڈپلومیسی کی دنیا اور انتظامیہ کو چلائے کی اطلاعات کے شعبوں میں دودھ پیتے بچے کی مانند ہے۔ چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر کو ایسی کسی احتیاط کی ضرورت نہیں کہ وہ سرکاری دستاویزات کو محفوظ رکھیں۔ جس انداز میں سرکاری دستاویزات قرطاس ایٹش میں ٹھونس دی گئی ہیں اس سے یہ واضح ہو جاتا ہے۔ ان بے مثال حماقتوں کی پاکستان کو بہت جلد بھاری قیمت ادا کرنی پڑے گی میں سمجھتا ہوں کہ میں سرکاری دستاویزات کے ساتھ جن ردی اور پوکے کے کھیل نہیں کھیل سکتا۔ لیکن چونکہ چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر نے اس کی غیر معمولی مثال قائم کر دی ہے۔ ہم بھی اس کی تقلید کریں گے لیکن جوازیوں اور مہم جوؤں کی طرح نہیں۔ قومی مفادات میری راہ میں رکاوٹ کھڑی کر دیتے ہیں کہ جیسی جست چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر نے لکائی تھی ویسی ہی جست میں بھی لگاؤں۔

قرطاس ایٹش میں قومی اسمبلی میں میری 28 اپریل 1977 کو تقریر کو منقل کیا گیا ہے اور اس کا آخری جملہ ہے۔

”ڈالر طشتریوں میں رکھ کر پیش کئے گئے۔ میری پارٹی کے ارکان یہ باتیں میرے نوٹس میں لا رہے تھے لیکن میں احتجاج کرنے کے لئے تیزی سے باہر نہیں نکلا“

اس سے میرا طرز عمل ظاہر ہو جاتا ہے۔ اگر اس وقت میں احتجاج کے لئے جلت میں باہر نہیں نکلا، جب میں ملک کا وزیر اعظم تھا اور انتہائی اشتعال انگیزی کے دباؤ میں بھی تھا تو اب جبکہ میں موت کی کونڈی میں ہوں اور ماضی کے تمام واقعات دھندلا گئے ہیں تو ایسا نہیں کروں گا۔ میں فوجی حکومت کو یہ موقع نہیں دوں گا کہ وہ ایک بار پھر غیر ملکی طاقتوں پر حملہ کر سکیں ساری کہانی معلوم ہو چکی ہے زیادہ سے زیادہ باہر آ رہی ہے۔ میں اپنا فرض ادا کر چکا ہوں۔ میں 28 اپریل 1977 کو سرکاری طور پر قوم کے نوٹس میں سب کچھ لے آیا تھا اور اس کے لئے کوئی معمولی نہیں بلکہ قومی اسمبلی کا پلیٹ فارم استعمال کیا تھا۔ اس کے بعد بھی کئی سیاسی تقریروں اور عدالتوں میں میں نے انہی باتوں کو دہرایا۔ میں پاکستان کی لڑائیاں موت کی کونڈی سے نہیں لڑ سکتا۔

گزشتہ بیس برسوں کے واقعات نے مجھے اس غیر مبہم نتیجے پر پہنچایا ہے کہ اس وقت تیسری دنیا کے اتحاد اور ترقی کو سب سے بڑا خطرہ فوج کے جبری طور پر حکومتوں کے انشادینے سے ہے۔ نوآبادیاتی دور مچکا ہے صرف چند ایسے مقامات رہ گئے ہیں جہاں نوآبادیات کو ابھی دفن کرنا باقی رہ گیا ہے ان مقامات پر بھی ہمدردانہ کا وقت بہت قریب آچکا ہے۔ تیسری دنیا کو غیر ملکی قیادتوں کے خلاف جدوجہد کرنی ہے لیکن غیر ملکی قیادتوں کے خلاف جدوجہد کا بہترین

195

ملکی مدد نہیں لی۔ کوئی بھی شخص جو ان اقدار کو بڑھانے اور اس میں معمولی سی قوت متحید اور حس مزاج ہو یہ بتانے کے قابل ہے کہ میں ڈپلومیسی کی زبان استعمال کر رہا تھا میں تو کہاوت کے مطابق ”زبان رخسار میں رکھ کر بات کر رہا تھا۔ میں اپنے سامعین اور تمام بیرونی پبلک کو یہ دعوت دے رہا تھا کہ جو بات میں اسطور ہے وہ اس کا مطالعہ کریں۔

طرز و چہن کی بھاری خوراک اقتصادی الفاظ میں دی گئی ہے جیسا کہ آپ جانتے ہیں کہ دنیا کے تمام ملکوں کے ساتھ ہمارے تعلقات انتہائی شاندار ہیں۔ چونکہ بعض ملکوں کے ساتھ ہمارے تعلقات محض نارمل ہیں۔ اس لئے میں نے اشار کیا کہ کہا تھا کہ دنیا کے تمام ملکوں کے ساتھ ہمارے شاندار تعلقات کے پیش نظر پی لین اسے غیر ملکی مدد کے بارے میں ایک کھولنی بڑبانگ رہی ہے۔ یہ دودھاری الفاظ میں نے بڑی احتیاط سے استعمال کئے تھے تاکہ پی لین اسے کے دعووں کی تصدیق کر دے اور غیر ملکی مداخلت کی مذمت تمام تر احتیاط کے ساتھ کر سکوں۔ میں اپنے ملک کا ذمے دار وزیر اعظم تھا اور اپنے عوام کے سامنے جوابدہ تھی۔ میں پاکستان کی قومی اسمبلی میں بات کر رہا تھا ساپ کو مارتے ہوئے لاٹھی کو بھی پھانسا جاتا تھا۔ چنانچہ غیر ذمے دارانہ انداز میں ایگزیشن کو کھلی دے کر بات نہیں کر سکتا تھا کہ کھلے عام اس حساس ترین موضوع پر طاقتور غیر ملکی قوتوں پر حملہ کروں۔ کسی غیر ملکی طاقت کے خلاف کیس ایک اینٹ پر دوسری اینٹ اور قدم کے بعد دوسرا قدم رکھ کر تیار کیا جاتا ہے۔

پی لین اسے کا دفاع کرتے ہوئے قرطاس ایٹش میں کہا گیا ہے کہ پی لین اسے کے فنڈز کے ذرائع غیر ملکی نہیں بلکہ اندرونی تھے۔ اس بات کا ذکر ملتا ہے کہ لاہور میں جو صنعت کار پی لین اسے کو روپیہ دے رہے تھے میں ان کی رپورٹیں وصول کرتا رہا ہوں۔ پی لین اسے کے سیاست دان ایسے نہیں ہیں کہ وہ ایک پیسہ بھی چھوڑ دیں۔ انہوں نے صنعت کاروں، تاجروں اور ان لوگوں سے روپیہ لیا جن کی پروسپیکٹ فیکٹریاں قومیائی گئی تھیں۔ اس کے باوجود، اندرونی عطیات کا موازنہ باہر سے آنے والے زبردست اور خطرہ فنڈز سے نہیں کیا جاسکتا۔ یہ گواہی کہ مفادات رکھنے والے اندرونی لوگوں نے اپنے مفادات کے لئے پی لین اسے کو جو عطیات دئے وہ غیر اہم ہیں یا کم، اس سے یہ مفہوم نہیں نکالا جاسکتا کہ پی لین اسے نے غیر ملکی ذرائع سے بڑے فنڈز وصول نہیں کئے۔

قرطاس ایٹش نے اپنی سی کوئی کوشش نہیں اٹھائی کہ مجھے مشتعل کر کے اپنی مرضی کے رد عمل کے لئے مجبور کرے۔ اس میں کہا گیا ہے جہاں تک مسٹر بخٹو کا تعلق ہے۔ پی لین اسے پر لگائے گئے الزام کے بارے میں مکمل کہانی کو سمجھی نہیں بتایا۔ جب تک وہ اقتدار میں

اگر فوجی حکمران ٹولہ یہ سمجھتا ہے کہ غیر جانبداری — جانبداری سے زیادہ اہم ہے اور اپنے ناصتہ سے غیر جانبدار کانفرنس میں شرکت کے لئے ہلکارا روانہ کرنا ہے تو اس کے لئے نیوکلیر پلانٹ کے سلسلے میں جو دباؤ ڈالا جا رہا ہے اس کے جواب میں رد عمل کے طور پر سنیٹو سے علیحدگی کے لئے معمولی سی دشواری بھی پیش نہ آ سکتی تھی۔ لوگ ٹھوس اقدامات کی توقع کئے ہوئے ہیں۔ لیکن اس کے برعکس باتیں اور مزید باتیں ہی کی جارہی ہیں امریکہ پر یہ الزام کیسے لگایا جاسکتا ہے کہ وہ اپنے عالمی سیاسی مقاصد کے لئے کام نہ کرے؟ ہمارے درمیان وہ لوگ بولناچ اور بھوک کی بنیادوں پر کام کرتے ہیں۔ وہی لوگ اس سے پہلے کہ دوسرے لوگ کام کر جائیں پاکستانی عوام کے سامنے جوابدہ ہیں اگر پی لین اسے کو قومی مفادات اور پاکستان کے عوام کی بہبود کے ساتھ اتنی زیادہ دلچسپی تھی تو پھر یہ احتمالات کے دوران 25 کروڑ (225 ملین روپے) اور احتمالات کے بعد 5 کروڑ (50 ملین) روپے لے کر میری حکومت کا تختہ الٹنے اور اس کے بدلے میں پاکستان کے اہم ترین مفادات پر سمجھوتہ نہ کرتی۔

دوسری طرف نے اس معاہدے کی شرائط کو پورا کرنے کا اپنا حصہ مکمل کر دیا ہے۔ اب یہ سمجھتی ہے کہ معاہدے کے مطابق پی لین اسے کو اپنے حصے کا کردار ادا کرنے کے لئے مناسب وقت دیا جا چکا ہے۔ جوشی و غضب، تیغ و پکار اور چلانے کے ذریعے عوام کو دھوکا دیا جائے گا۔ اس قسم کا بلا کلا ایک وقت تک ہی برداشت کیا جاسکتا ہے لیکن پالیسی میں کوئی بنیادی تبدیلی گئی تو اسے اس سے فرشتی حتیٰ فیصلے کی خلاف ورزی تصور کیا جائے گا جو فروری 1977 میں طے پایا تھا ایک قیمت ادا کی گئی تھی اور یہ قیمت ایک خاص معاملے کے لئے ادا کی گئی تھی۔

پی لین اسے کے ساتھ جو مذاکرات اس سلسلے میں بظاہر کئے جارہے ہیں کہ وہ اس سرکاری حیثیت اپ میں شامل ہو جائے، اس مرکب معاہدے کا ایک لازمی حصہ ہے۔ پانچ حکمت کے حواس سے جو مزاحیہ ڈرامہ کھیل کر ہنگامہ کیا جا رہا ہے یہ ایک پہلے سے تیار شدہ سٹیج کا عمل ہے۔ جاگ اس طرح پی لین اسے کی خود مختاری اور آزادی کو ثابت کیا جاسکے۔ اس قسم کی شائد ار، سازشوں پر ہر شخص کو اعتماد میں نہیں لیا جاسکتا اس لئے ایسی کارروائیوں میں دابنے ہاتھ کو علم نہیں ہوتا کہ بالیاں ہاتھ کیا کر رہا ہے۔ پورا منصوبہ جو انتہائی خفیہ راز میں تھا، اس کا علم صرف چند چید افراد کو تھا۔ معمولی مقاصد میں سب عناصر کو شریک کیا جاسکتا تھا۔ وہ بھی محض باتوں اور گفت و شنید نظر ملت کی، ہم آہنگی اور عام مفادات کی حد تک اس سازش میں صرف ایک پارٹی اور اس ایک پارٹی کے ایک سیاست دان کو مکمل اعتماد میں لیا گیا تھا۔ صرف اسے ہی یہ بات بتائی گئی تھی۔

طریقہ یہ ہے کہ فوج کے ذریعے حکومتوں کے جبری تختہ الٹنے کی سازشوں کے خلاف کھڑا ہوا جائے۔ بیرونی نوآبادیاتی نظام کا سب سے بڑا ذریعہ اندرونی نوآبادیاتی نظام ہوتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ غیر ملکی قیادتوں کو ہم پر فوجی جبر و قوت کے بغیر نہیں تھوپا جاسکتا فوج کے ذریعے حکومتوں کا جبری تختہ الٹنا۔ ملکی اتحاد کے ساتھ بدترن دہمنی ہے۔ فوجی بغاوتوں کے ذریعے آزاد لوگوں کو تقسیم کر دیا اور بنیادوں سے ہلاک کیا جاتا ہے۔ اگر اس میں کوئی شبہ تھا تو اب پاکستان کے حالات سے تیسری دنیا کے عوام کو اندازہ ہو گیا ہو گا کہ انہیں بنیادی طور پر اپنے اندرونی دشمنوں کا مقابلہ کرنا ہے۔ اگر غیر ملکی برتری اور قیادت کو مٹا دیا جاتا ہے تو پھر جان لینا چاہئے کہ فوجی سازشیں اور فوجی اقتدار کا ہی وہ پہل ہے جس پر چل کر غیر ملکی قیادت ہمارے ملکوں کے اندر آتی ہے۔

پی لین اسے کے ساتھ غیر ملکی عناصر کا تعاون کسی محبت کے بغیر نہیں تھا۔ باہمی مضامنت ہو چکی تھی۔ یہ باہمی مضامنت اور سمجھوتہ اس بات پر ہوا کہ پی لین اسے کو ملہری حکومت کا تختہ طے شدہ احتجاج کے ذریعے الٹنا ہو گا اور اس کے لئے پی لین اسے کو مالی اور سیاسی مدد دی گئی پہلے مرحلے میں فوج اقتدار پر قبضہ کرے گی۔ زمین ہموار کی جائے گی اور رکاوٹیں دور ہو چکی ہوں گی۔ اس کے استحکام کے بعد یہ توقع کی جائے گی کہ میری حکومت کا تختہ الٹنے کی کوشش مکمل ہو جائے گی۔ ان شرائط اور مقاصد کو فروری 1977 میں حتمی طور پر طے کر لیا گیا تھا۔

امریکہ کے اس فیصلے پر احتجاج کہ جب تک نیو پراسیڈنٹ پلانٹ کا معاملہ طے نہیں پاتا امداد روک دی جائے گی، اس ضمن میں کوئی غیر متوقع یا نیا واقعہ نہیں ہے۔ 5 جولائی 1977 کو حکومت کا فوج کے ذریعے تختہ الٹنے کی سازش کا یہ ایک جزو لاینفک تھا۔ پی لین اسے سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ اس سودے میں اپنا حصہ اور کردار ادا کرے گی ڈپلومیٹک الفاظ کا رقص زوردار بیانات اور ان کے گندے جوہر جیسے پریس کے ادارے۔ لوگوں کو بے وقوف بنانے کے کھیل میں۔ پی لین اسے سمجھتی ہے کہ وہ چونکہ پہلے عوام کو بے وقوف بنانے میں کامیاب ہو چکی ہے اس لئے ایک بار پھر انہیں بے وقوف بنانے میں کامیاب ہو جائے گی جو شور مچا رہا ہے وہ نقلی پاکستان کے مقابلے پر ہو رہا ہے۔ یہ وہ چیز ہے جسے ڈریس ریپر سل کہا جاتا ہے۔ اگر وہ اس اعلان پر ناراض ہوئے تھے تو انہیں مثبت جوابی کارروائی کرنی چاہیے تھی۔ کسی پینلنگ کا مقابلہ کرنے کے لئے عوام میں حرکت پیدا کرنے کے لئے ٹھوس اقدام کئے جاتے ہیں۔ پی لین اسے اور اس کے آقاؤں کو اس میں سنجیدہ دلچسپی ہی نہیں ہے۔ وہ حسب معمول زبانی کلامی سطح پر معاملے کو لے رہے ہیں۔

طرح چیلنج کیا گیا اور اس کے ساتھ مشتعل کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ میں اس دور کی تفصیلات کو نہیں چھوؤں گا۔ یہ میرے لئے ممکن نہیں کہ جس جگہ پر میں نہیں ہوں وہاں سے میں حاضر نہ ہکاؤ کے علاوہ کسی بات میں کوئی اضافہ کر سکوں۔

جب میں اگست 1977 میں راولپنڈی آیا تو میں نے مسٹر عزیز احمد سے کہا کہ وہ مجھے اس پچاس صفحات پر مشتمل دستاویز کی نقل دیں۔ جو دفتر خارجہ نے تیار کی تھی جس میں غیر ملکی عناصر کے ملوث ہونے کو ”اول سے آخر تک مکمل“ بیان کیا گیا تھا۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ اس کی جو واحد نقل تھی وہ میں نے اس وقت کے سینئر ٹری جنرل ان چیف مسٹر غلام اسحاق کو دیدی ہے۔ قرطاس ایٹش کس جعلی تسکین کے ساتھ یہ بیان کرتا ہے کہ احتجاج میں کسی غیر ملکی عنصر کے ملوث ہونے کا کوئی ثبوت وجود نہیں رکھتا۔ دوسرے ہر قسم کے مواد کو ایک طرف رکھتے ہوئے آپریشن پہلیہ جام کا کیا کریں گے کہ جو کہ عمل میں نہ لایا جاسکے گا۔۔۔

غیر ملکی نگرانی میں آپریشن ”پہلیہ جام“ 1958 کے مارشل لاکے درمیان فوج نے منظم کیا تھا۔ یہ فوج کا ایک انتہائی خفیہ پروجیکٹ تھا۔ تربیت چراٹ میں دی گئی۔ اس آپریشن کا مقصد یہ تھا کہ ”پہلیہ جام“ کر کے ایک حکومت کو ناکارہ بنا دیا جائے۔ جب کراچی میں پہلیہ جام کیا جائے گا تو چیف آف دی آرمی سٹاف یہ سن کر بہت پریشان ہوا کہ جب میں نے اسے بتایا کہ میں اس پر اسے پروجیکٹ سے واقف ہوں جو فوج نے بنایا اور اس کا نام ”آپریشن“ پہلیہ جام رکھا گیا تھا میں نے اسے بتایا کہ اسی کوڈ کا استعمال ایک ناخوشگوار اتفاق بن گیا ہے۔ چیف آف آرمی سٹاف کی زبان بند ہو گئی۔ اس نے برٹراٹے ہوئے کچھ ایسی بات کہی کہ کئی رپورٹرز فوجی افسر نے اسے میں موجود ہیں۔

اگرچہ قرطاس ایٹش میں میری 28 اپریل 1977 کی تقریر نقل کی گئی ہے جس میں یہ نشانہ دہی موجود ہے کہ میں احتجاج کے لئے میز سے باہر نہیں نکلا۔ اس کے باوجود قرطاس ایٹش مجھے چوکے دیتا ہے کہ میں غیر ملکی موجودگی کے بارے میں ”اول سے آخر سب کچھ“ بتانے کے لئے چاہتا ہوں۔ اس میں کہا گیا ہے۔ جب تک وہ اقتدار میں رہے انہوں نے کوئی ثبوت فراہم نہ کیا۔

(صفحہ 238)

جس حد تک جائز حدود ہیں ان میں رہتے ہوئے میں بات کر چکا ہوں میں سرکاری دستاویزات کے ساتھ تاشل کے پتوں یا اس سے بھی بدتر سلوک نہیں کر سکتا۔ مجھے ذمہ دارانہ اور محتاط طرز عمل اپنانا ہے۔ اس کے اندر کے ذاتی اختلافات اور فوجی ٹولے کے تضادات

خاندانوں کو اس تصویر میں شامل نہیں کیا گیا۔ انہیں نظام مصطفیٰ کے نعروں میں ہی الجھایا گیا مکمل صورت میں حقیقی پلان پی ڈی پی پر بھی ظاہر نہیں کیا گیا تھا۔ ایک اور واحد رابطے اور ترسیل کا ذریعہ جماعت اسلامی تھی اور حیات خلیل محمد رابطہ تھے دوسروں کو اس سازش کے بارے میں بہت کم اور مختلف معلومات حاصل تھیں۔ فردے فردا پارٹی سے پارٹی تک اس میں کثیر الجہت تنوع تھا۔ انہی اسباب کی بنا پر، میں خلیل بوٹیک پیشہ ور ”ایجنٹ پرو کو فیئر“ تھاب امریکہ پر دکھاؤ کے تنقید کر رہا ہے۔ یہ صرف اس لئے کیا جا رہا ہے کہ ہمارے سادہ دل لوگوں کو کنفیوز کیا جاسکے۔ لوگ ابھی یہ فراموش نہیں کر سکے کہ پونٹک کے دن کراچی، حیدر آباد اور ملتان جیسے بڑے شہروں میں فسادات کی آگ بھڑک اٹھی تھی۔ ہر کسی کو یاد ہے کہ پی این اے کے کرانے کے آدمیوں اور شہر پسندوں نے پونٹک سٹیشنوں کو جلایا، حملہ کیا اور پلان کیا تھا۔ احتجاجات سے پہلے ہی پی این اے کے رہنماؤں نے حکومت پر فوجد کرانے کی جو دھمکیاں دی تھیں ان کی صدائے بازگشت اب بھی سنائی دے رہی ہے۔ اگر احتجاجات کے بارے میں انکوائری کے موضوع سے یہ کارروائیاں خارج کی جارہی ہیں تو پھر میں چاہوں گا کہ مجھے احتجاجات کے معنی پر درس دیا جائے۔ فوجی ٹولے نے پی این اے کا دفاع کیا ہے اور پی این اے اسے فوجی ٹولے کا دفاع کر رہی ہے۔

قرطاس ایٹش میں غیر ملکی عناصر کے ملوث ہونے کے بارے میں چوتھا حوالہ قرطاس ایٹش کے صفحہ 383 پر ہے۔ جس میں دیگر باتوں کے علاوہ بیان کیا گیا ہے۔ وہ یہ الزام کہ پاکستان میں غیر ملکی عطیات کا سیلاب آیا ہوا تھا۔ اور گزشتہ باب میں بحث ہو چکی ہے۔ جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس میں کوئی صداقت نہیں تھی۔ نہ ہی کوئی ایسی شہادت ہی ملی ہے کہ جس سے یہ ثابت ہوتا ہو کہ احتجاج میں کس طرح بھی غیر ملکی ملوث ہوں آخر فوجی ٹولے پی این اے کے کپڑوں کو پاک کرنے میں استغفار مند کیوں ہے؟ میں نے جرنیلوں پر تو غیر ملکی رقوم وصول کرنے کا الزام نہیں لگایا۔ میں نے پی این اے پر الزام لگایا تھا۔ فوجی حکومت پی این اے کا اس طرح دفاع کر رہی ہے جیسا کہ اپنا دفاع کر رہی ہو اور پی این اے کی بے گناہی کو ثابت کرتے ہوئے جیسے اپنی بے گناہی کا ثبوت پیش کرنے کی کوشش کی جارہی ہے۔ یہ ایسا طرز عمل ہے کہ فوج کی صفائی اسی طور ثابت ہو سکتی ہے کہ پہلے ہی پی این اے کو بے گناہ ثابت کر دیا جائے۔ پھر پی این اے پر جو الزام خلیہ غیر ملکی رقوم وصول کرنے کا ہے اس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس الزام کی کوئی بنیاد ہی نہیں پھر یہ کہ نہ ہی ایسا کوئی ثبوت ملا ہے کہ جس سے یہ ثابت ہو سکے کہ غیر ملکی کس طرح بھی احتجاج میں ملوث تھے قرطاس ایٹش کے ذریعے مجھے جس

نے ان چیزوں کو سطح سے اوپر تک پہنچا دیا ہے اور واقعات اب ڈھکے چھپے نہیں رہے۔ بالکل اسی طرح جیسے کہ پی این اے کے تمام سیاست دانوں کو اندرونی کہانی نہیں بتائی گئی تھی۔ بالکل اسی طرح بیشتر جرنیلوں کو اس پلاٹ کی گہرائی کے بارے میں اعتماد میں نہیں لیا گیا تھا۔ ایک برس کے اس طویل مہمے میں چیف مارشل لائیڈ منسٹر نے اپنی تمام دستاویزات ضائع کرنے کی کوشش کی ہے جو ان کے خلاف ثبوت پیش کر سکتی تھیں۔

صرف ایک سیاست دان کو غیر ملکی فنڈز دینے گئے تھے اور وہ جماعت اسلامی کے میاں طفیل محمد تھے۔ ان خفیہ رقوم کو انہوں نے کس طرح اور کن میں تقسیم کیا۔ یہ ان کا اور پی این اے کے دیگر افراد کا معاملہ ہے۔ حکومت کا فوج کے ذریعے جاری شدہ الزامات کے جاننے کے فوراً بعد میاں طفیل محمد نے چیف مارشل لائیڈ منسٹر کو مشورہ دیا کہ ان کے خلاف ثبوت فراہم کرنے والی تمام دستاویزات ضائع کر دی جائیں۔ 23 جولائی 1977 کو مجھے مری میں یہ اطلاع ملی کہ اس موضوع سے تعلق رکھنے والی دستاویزات کا ایک انبار 19 جولائی 1977 کو جلا گیا ہے۔ میں یہ کہنے کی جسارت کروں گا کہ 385 دنوں میں جن کے بعد قرطاس امتیاز جاری کیا گیا ہے۔ ایسے ہی الاؤ جلائے جا چکے ہیں۔ اس عقیدے پر مکمل طور سے اعتماد کر لینے کے بعد کہ اس موضوع کے بارے میں تمام شواہد اور ثبوت ضائع کئے جا چکے ہیں۔ قرطاس امتیاز مجھے یہ پہنچ کر رہا ہے کہ پانچسی کی کوٹھڑی سے میں اول سے آخر تک مکمل صورت میں میاں طفیل احمد کی اس سازش میں شمولیت کا ثبوت پیش کروں۔

میں یہ بات پھر دہراؤں گا جو کچھ نجی ہو رہا ہے اداکاری ہو رہی ہے جو کچھ نجی وقوع ہوا، جو کچھ سب منصوبے کے تحت معاہدے کے مطابق ہوا ہے۔ ایک فریق نے اس سودے کی تشکیل میں سامان اور اشیاء فراہم کیں۔ دوسرا فریق اپنے قدم خمیدہ رہا ہے۔ اور عزرائف پیش کرتے ہوئے وقت کی توسیع کے لئے اہیل کی جارہی ہے۔ کوڑوں اور اذیتوں کی مکمل آزادانہ آمریت کی سزائیں عوام کو اپنا مکمل مضیق بنانے کے لئے کافی نہ تھیں۔ پی این اے کے ساتھ کھلی شادی شادیہ مواقع فراہم کر دے کہ جس سے موعودہ تبدیلی لائی جاسکے اہم نوعیت کے مفادات کو پیشہ محض مضبوط میانوں سے پورا نہیں کیا جاسکتا اہم ترین مفادات کے حصول و تحفظ کے لئے قربانیوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ بیانات کی نہیں۔ یہ قربانیاں جو عوام دیتے ہیں اسی وقت دی جاسکتی ہیں جب عوام کو متحرک کیا گیا ہو۔ غیر غایتہ فوجی ٹولہ کبھی عوام کو متحرک کر کے انہیں قربانی کے لئے تیار نہیں کر سکتا لوگ صرف ان رہنماؤں کی پیروی کریں گے جن پر انہیں اعتماد ہے۔ باقی سب آنکھ دھونے والی بات ہے۔ لافانی وقت سے ریاستوں کے

درمیان پالیسی یہ رہی ہے کہ جوابی دباؤ کا جواب موثر ترین دباؤ ہوتا ہے۔ عوام کی روح پر کوڑے برسائے کے بعد عوام میں ہیر و کی بلندیوں کے لئے لرزش تک پیدا نہیں کی جاسکتی عوام کے جوابی دباؤ کے بغیر لڑائی ہاری گئی ہے۔ باقی جو کچھ ہے وہ سب ناکارہ اور کواس ہے۔ چیف مارشل لائیڈ منسٹر اور پی این اے کے وفدوں نے مشترکہ خیال اپنا لیا ہے کہ امدادی بندش سے خود اعشاری کا احساس پیدا ہو گا اور یہ بندش دراصل ایک برکت ہے یہ طرز فکر ایک منافقانہ کوشش ہے، عوام کو دھوکہ دینے کے لئے اس وقت موضوع جو داؤ پر لگا ہے اقتصادی امداد کی بندش نہیں ہے۔ بلکہ ری پروسیٹنگ پلانٹ ہے۔ میں پہلے ہی اٹمی ری پروسیٹنگ پلانٹ کے بارے میں بات کر چکا ہوں کہ اس میں تبدیلی کی جائے گی یا اسے ترک کر دیا جائے گا۔ اور ظاہر ایسا ہوتا ہے کہ اسے ترک کیا جا چکا ہے۔

قوم کو بذات خود چند تاریخی فیصلے کرنے چاہئیں۔ چیف آف آری شٹاف نے اپنے عوام سے جو وعدے کئے تھے وہ توڑ چکا ہے۔ اب وقت آیا ہے کہ ایسا ہی پختہ وعدہ وہ ایک غیر ملکی طاقت سے توڑے اپنے لئے نہیں بلکہ پاکستان کے لئے۔ اگر فوجی ٹولہ نیو کلیئر پروسیٹنگ پلانٹ کے بارے میں واقعی دباؤ محسوس کرتا ہے تو کم سے کم جو کر سکتا ہے یہ ہے کہ قومی رہنما اور ناراضی کے مظاہرے کے لئے سینٹوسے نکل جائے۔ ایسی صورت میں شاید لوگ جنرل کے بارے میں کچھ نہ سمجھ سکیں گے سوچنے لگیں۔ مغرب کی غماز سے پہلے یا بعد میں اسے ٹیلی ویژن پر چار غیر ملکی دباؤ کے بارے میں قوم کو اپنے اعتماد میں لے کر قومی وحدت اور اپنی حکومت کے انکسار کے اعتبار کے لئے یہ اعلان کرنا چاہیے کہ پاکستان نے سینٹو محوڑ دیا ہے۔ پہلی تعمیر یہی ہے کہ غیر ملکی دباؤ کی ماحمت کی جائے۔ اسے چاہیے کہ وہ یہ اعلان کسی بھی ذرا سے کے بغیر کرے کیونکہ قوم دانتوں تک اس کے ایسے ڈراموں سے بےزار ہو چکی ہے۔

نیو کلیئر پروسیٹنگ پلانٹ کے بارے میں بنیادی سوال جو پیدا ہوا اور اس کے مابعد جو واقعات پیش آئے انہوں نے ایک سال میں پاکستان کی آزادی کو نازک سمت میں لاکھڑا کیا ہے۔ ملک کی یہ حالت ہو گئی ہے دو ملین ٹن گندم سپورٹ کی جارہی ہے۔ خود اعشاری کے لئے ایک یہ فیصلے راستہ ہے گندم کے لئے یہ سال کا بہترین زمانہ ہوتا ہے۔ اس کے باوجود گندم کی قیمتیں بڑھ کر اسی روپے یا اس سے زیادہ تک پہنچ گئی ہیں۔ انتظار کیجئے کہ کمزور مہینوں میں کیا ہوتا ہے۔

اپنے موضوع سے امور نکالتے ہوئے کہ تخمیناً کتنے بلین روپے افواج پر خرچ ہوتے ہیں جن میں مزید اضافہ یعنی تعاون کا لے لیجئے ملکی زرخیز آبادی کی آمدنی کا نوے فیصد گندم، خوردنی تیل اور پٹرولیم اور تیل پر اٹھ جائے گا۔ صرف ان تین اشیاء کے اخراجات 1,130 بلین ڈالروں

سے زیادہ ہوں گے اس میں قرضوں کا سود وغیرہ شامل نہیں ہے۔ اور دوسری امپورٹس پر کم از کم روایتی طور پر 2.5 بلین ڈالر خرچ ہوں گے۔ اگر روایتی زمینوں کے مطابق رواں سال میں ٹوٹل امپورٹس 3.5 بلین ڈالر سے کم نہیں ہو سکتی ہیں تو تجارت میں خسارہ 2.1 بلین ڈالر سے کم نہیں ہو گا یہ خیال رکھتے ہوئے کہ حالیہ بارشوں نے کیا اس کو زیادہ نقصان نہیں پہنچایا یہ ایک انتہائی تکلیف دہ صورت حال ہے۔ کاسٹ گداڑی کے کریم ایک برا عظیم سے دوسرے برا عظیم پھریں گے غیر ملکی ریاست (نام خارج کیا جاتا ہے) کے صدر تک رسائی کی جاسکے گی۔ وہ کہے گا پلیز اپنا پہلا وعدہ یاد کیجئے اور پینٹ چھوڑ دس۔ کیا میں نے پینٹ سنا؟ اوہ میرا مطلب ہے پلائٹ۔۔۔! میں پاکستان کی کئی لڑائیاں لڑ چکا ہوں۔ اب مجھے یہ دیکھنا ہے کہ میرے بغیر یہ کس طرح لڑی جائے گی۔ میں سلاخوں کے پیچھے کوئی لڑائی نہیں لڑ سکتا اس کے علاوہ بہت تاخیر بھی ہو چکی ہے۔ کھیل ختم ہو چکا ہے۔ یہ اسی وقت ختم ہو گیا تھا جب کی لندن اسے نے اپنی روح بیچ دی تھی۔ آج مجھے جو کچھ برداشت کرنا پڑ رہا ہے بھی برداشت نہ کرنا پڑتا اگر اندر سے غداری نہ کی جاتی۔ میں کسی بیرونی طاقت پر الزام نہیں لگا رہا۔ اپنے ملک کے مفادات کے لئے پاکستان کے وقار کو سر بلند رکھنا لازمی ہے اور اس کا مجھے صلہ ملا ہے۔ میں عوام کا شکریہ گزار ہوں ان کی ہمدردی اور تعاون کے لئے دنیا بھر کے رہنماؤں نے میری قیادت کے متعلق جن خیالات کا اظہار کیا ہے مجھے اس پر فخر ہے۔ ماضی کے کسی کینے اور بغض کے بغیر میں اپنی بصیرت کو نئی جلاد سے سکتا ہوں میں عالمی سیاست کی اہمیت سے واقف ہوں۔ یہ وہ لمحہ ہے کہ جس میں مجھے ان عالمی رہنماؤں اور ان کے ملکوں کا شکریہ ادا کرنا ہے جنہوں نے تردد اور فکر مندی کا اظہار کیا ہے۔ انہوں نے اس غل کا مظاہرہ کرتے ہوئے دراصل پاکستان کے عوام کو خراج تحسین پیش کیا ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ میرا مقدر کس حد تک پاکستان کے مقدر کے ساتھ جڑا ہے فوجی حکومت کے مسخروں کی طرح میں کسی ایک رہنما یا ملک کو اپنی تعریف، اپنے خاندان کی تعریف اور اپنی پارٹی اور ہم وطنوں کی تعریف سے نہیں بچاؤں گا۔ اس وقت جہاں میں ہوں وہ میرے وقار اور خوداری کی اتنی اہانت ہے کہ اپنے مستقبل کے بارے میں کوئی بات کر سکوں۔ بھر بھی میں نے فیصلہ کیا ہے کہ میں اپنے دل کے ایک راز میں اپنے ہم وطنوں کو شریک کروں۔

اپنی جوانی کے دنوں سے میں برطانوی امپیریلزم کے خلاف ایک تندہ خور اور پر جوش لڑاکا رہا ہوں بھٹی میں میں نے کیٹھڈرل اور جان کونن ہائی سکول میں تعلیم حاصل کی۔ یہ برصغیر کے چند بہترین انگریزی سکولوں میں سے ایک تھا۔ اس کے باوجود تب بھی ایک سکول کے لڑکے کی حیثیت سے بھی میں اپنی سیاسی سرگرمیوں کی وجہ سے تکلیف میں مبتلا رہتا تھا، خاص طور

ہر ہندوستان چھوڑ دو اور راست اقدام کا دن کے زمانے میں لیکن اس سے بھی پہلے 1935 میں جب میری عمر سات برس تھی۔ میرے والد کو جو اس وقت بھٹی کی حکومت میں وزیر تھے، بھٹی کے گورنر لارڈ براہورن نے اپنے تینوں بیٹوں کے ساتھ چائے پر مدعو کیا۔ جب میرے بڑے بھائی لدا علی کے ساتھ تعارف ہو چکا جو اس وقت آکس برس کے تھے تو لارڈ براہورن نے رائے دی۔ لکنا خوبصورت جوان آدمی ہے ایک مہذب اور تربیت یافتہ اسٹوڈنٹ ہوتے ہوئے لدا علی نے جواب میں کہا میں اپنے آپ کو بہت مسرور و مغرور سمجھتا ہوں کیونکہ میری تعریف ہمارے خوبصورت گورنر نے کی ہے جب میری باری آئی تو میں نے اپنی باریک آواز میں کہا ”ہر ایک کی لینی گورنر اس لئے خوبصورت ہے کہ وہ ہمارے خوبصورت ملک کے خون پر پلٹے ہیں“ لارڈ براہورن ششدر رہ گیا۔ ایک لمحے تک وہ حیرت زدہ میری طرف دیکھتا رہا پھر اپنی اٹھکی سے میرے طرف اشارہ کر کے میرے والد کی طرف منہ کر کے کہنے لگا اور اس میں سر شاہنواز آپ کو شاعر اور ایک انقلابی ملا ہے۔ یہی کچھ ہے جو میں ان سارے برسوں میں رہا ہوں ”ایک شاعر اور ایک انقلابی“ اور جب تک میرے جسم میں سے آخری سانس نہیں نکل جاتی میں یہی رہوں گا۔ میں نے اپنی اس لڑائی کو برسرِ مکہ میں نیزہ تانے پر آبادیاتی نصب العین نظام کے دشمن نصب العین کے لئے جاری رکھا۔ اور اقوام متحدہ میں رنگ کے ہر کارڈ میں نے عسکری جذبے کے ساتھ حمایت کی انھیں میں مجھے کرائسٹ چرچ، آکسفورڈ اور بعد میں لنکازن میں تعلیم حاصل کرنے کا فخر حاصل ہوا۔ لندن اور آکسفورڈ دونوں جگہ میں نو آبادیاتی نظام کے خلاف ہر کارڈی تحریک کے ہراول دستے میں رہا۔

حکومت پاکستان کے ایک وزیر کی حیثیت سے میں نے پریلیٹ فارم پر نو آبادیاتی نظام کی شہادت سے نہ تھکنے والے ولولے جذبے اور عقیدہ کے ساتھ خدمت کی۔ ہر برطانوی وزیر اعظم، بینکین سے ایڈروڈ میٹھو تک میں نے گرم اور پر جوش دلائل کا سلسلہ جاری رہا۔ پاکستان کے صدر کی حیثیت سے میں نے دولت مشترکہ کے ساتھ پاکستان کے تعلقات ختم کرنے پر پاکستان کے وزیر اعظم کی حیثیت سے میں نے مطالبہ کیا کہ کوہ نور ہیرا جو تاج کے ہیروں میں ہے واپس کیا جائے۔ صحت برسن کی عمر سے پچاس برس تک چھوٹا زمانہ نہیں ہوتا۔ جب گورنر کی چائے کی دعوت کے بعد ہم واپس آ رہے تھے تو میرے والد نے مجھ سے پوچھا ”سانیں وہ بات وہاں کرنے کی کیا ضرورت تھی“ تو میں جو تب سے دباؤ میں بکڑا ہوا تھا اس کے لئے پرسش اس دباؤ سے نجات کا سبب بن گئی۔ میں نے اپنے دونوں ہاتھ پہرے پر رکھے اور سسکیوں کے ساتھ تقریباً ہڈیانی انداز میں سنہری میں پیچ ”اٹھا ہمارا ملک ہے یہ ہمارا ملک ہے۔ یہ ہمارا ملک ہے۔ ہر وہ ملک جو نو آبادیاتی نظام کے جوئے میں جکڑا ہوا تھا۔ اسے میں

یوں سمجھتا تھا جیسے وہ میرا ملک ہے۔

برطانوی ایسپائر کا خاتمہ ہو چکا ہے۔ تیسری دنیا کے لئے اب سب سے بڑی دہشت فوجی سازشیں ہیں۔ برطانیہ کے ساتھ میرے طویل اور تلخ تصادمات انقلابی تبدیلیوں کی وجہ سے ختم ہو چکے ہیں۔ برطانوی حکومت اور برطانوی عوام نے میرے تین بچوں اور ساتھیوں کو جس باوقار انداز میں پناہ دی ہے اس سے میں بہت متاثر ہوا ہوں میں برطانوی رہنماؤں اور حکومتوں کے خلاف اسی وجہ سے لڑتا رہا کہ ایشیا کو دانش اور اخلاقی سطح پر مساوی تسلیم کریں۔ میں یہ ایشیائی عوام کی شان و شوکت کے لئے کرتا رہا۔ برطانیہ کے ساتھ میری لڑائی ختم ہو چکی ہے۔

پی لین اسے نے کس طرح فنڈز جمع کئے۔ اگر یہ اس قرطاس امینض کا مواد و موضوع نہیں بن سکتا جو عام انتخابات کے طرز عمل اور روسے پر تھا تو پھر یہ بھی حقیقت ہے کہ پاکستان ہینڈلز پارٹی نے کس طرح فنڈز جمع کئے اسے بھی اس قرطاس امینض کا موضوع و مواد نہیں بنایا جا سکتا جو عام انتخابات کے انعقاد کے رویوں کے بارے میں ہے۔ ہر شخص درباری سے منہ منہ سے تک یہ جان چکا ہے کہ پی پی پی کے لئے ایک قانون ہے اور پی لین اسے کے لئے ایک دوسرا قانون ہے۔ پی پی پی کے لئے ایک معیار ہے اور پی لین اسے کے لئے دوسرا معیار قرطاس امینض صفحات پر صفحات پی پی پی کے فنڈز کے لئے وقف کرنے کے باوجود ہمارے خلاف کسی بے قاعدگی کو ثابت نہیں کر سکا۔ پی پی پی نے غیر ملکی مدد وصول نہیں کی۔ پی پی پی کا سرمایہ عوام ہیں۔ یہ کبھی نہ ختم ہونے والا سرمایہ ہے اور اسے عوام سے کبھی چھیننا نہیں جاسکتا۔ اگر میں کل عوام سے عطیات کے لئے اپیل کروں تو لاکھوں دھکی روچیں خوشی سے آگے بڑھ کر اپنا آخری پیسہ بھی مجھے دیدیں۔ یہ میری پارٹی کی طاقت ہے۔ میں کوئی کلرک یا آڈیٹر نہیں ہوں کہ جس حقیر مواد کا ذکر قرطاس امینض میں کیا گیا ہے اس کا جواب دوں دستاویزات خود بنائی گئی ہیں سچ اور حقائق کو جھٹلانے کے لئے فینٹسی اور فکشن کو انتہائی مبالغے اور سچ و جج سے استعمال کیا گیا ہے۔

ایک بڑا الزام یہ لگایا گیا ہے کہ دو سال یا اس سے زیادہ عرصے میں ایک بے نام سربراہ حکومت سے 2 سے 3 کروڑ (20 سے 30 ملین) روپے لئے گئے اس بیان کا مفہوم و مطلب میرے سیکرٹری مسٹر افضل سعید کی طرف سے بیان کیا گیا ہے۔ منیر بر آں افضل سعید نے یہ بتایا کہ مذکورہ رقم اسے یونائیٹڈ بینک کے سابق مینجنگ ڈائریکٹر یا چئرمین آغا حسن عابدی نے پہنچائی تھی۔ یہ مسٹر افضل سعید کے صرف الفاظ ہیں۔ اخباری رپورٹوں کے مطابق آغا حسن عابدی نے اس شمولیت اور کام سے صاف انکار کیا ہے۔

ایک ضمنی بیان جو مسٹر افضل سعید سے 26 ستمبر 1977 کو لیا گیا میں بتایا گیا کہ افضل سعید نے مندرجہ ذیل بیان دیا۔

”مسٹر آغا حسن عابدی مسٹر بھٹو کو ادا کرنے کے لئے مندرجہ ذیل روپے لاتے تھے۔ اور مجھے یہ کہتے تھے کہ اسے۔۔۔ ایک غیر ملکی سربراہ حکومت نے وزیراعظم کو انتخابات کے مقاصد کے لئے پہنچوایا ہے۔ اور مجھے کہتے کہ میں اسے وزیراعظم تک پہنچا دوں میں فوراً جی یہ رقم وزیراعظم تک پہنچا دیتا تھا۔ یہ سلسلہ دو سال یا اس کے لگ بھگ عرصے تک جاری رہا اور رقم ہر بار چند لاکھ ہوتی تھی یہ رقم جو میرے ہاتھوں سے گزری دو یا تین کروڑ روپے بنتی ہے۔ مجھے یہ بتایا گیا تھا کہ یہ انتخابات کے مقاصد کے لئے ہے۔

مسٹر افضل سعید کے بیان پر بحث کرنے سے پہلے یہ دیکھنا ہے کہ اس میں کون سا شخص شامل تھا۔ آغا حسن عابدی نے اس الزام کی تردید کی ہے۔ یہ بھی مد نظر رکھنا چاہئے کہ میری حکومت نے پاکستان کے تمام نجی بینکوں کو قومیایا تھا۔ جس میں آغا حسن عابدی کا یونائیٹڈ بینک بھی تھا۔ جو نجی بینکوں میں ایک انتہائی ممتاز اور خوشحال بینک تھا۔ ایک ممتاز بینکر کو اس طرح اپنی پیارا اور چھیتا بنانا بہت مشکل ہوتا ہے۔ میری حکومت نے آغا حسن عابدی کا پاسپورٹ ضبط کر لیا اور انہیں اس وقت تک پاکستان سے جانے کی اجازت نہ دی جب تک ان کے بینک کے معاملات کی تحقیقات مکمل نہ ہو گئیں اور جب تک وہ خود بری الذمہ قرار نہ پاسے ملک سے باہر نہ جاسکے۔

غیر ملکی سربراہ مملکت کا نام نہیں دیا گیا۔ اگر میں نے ایک غیر ملکی دوست سربراہ مملکت سے پیسے لئے ہوتے اور اگر جو مواد قرطاس امینض میں فراہم کیا گیا ہے اس سے اس غیر ملکی سربراہ مملکت کی شناخت ہو گئی تو میں اس کا اور اس کے ملک کا نام لینے میں کبھی ہچکچاہٹ محسوس نہ کرتا، قرطاس امینض میں جو مواد فراہم کیا گیا ہے اس میں سے کسی شک و شبہ کے بغیر یہ استدلال کیا جاسکتا ہے کہ یہ انہی کا حوالہ دیا گیا ہے تو وہ اس غلط بیانی کا اور اگر میں نے ذکر کر دیا تو وہ اس الزام کو شدید کراہت سے روک دے گا۔ ایک غیر ملکی سفارت کار کا ذکر ہو گیا ہے جو چیف الیکشن کمشنر کے ساتھ ٹینس کھیلتا تھا اور جسے اس کا سفارت خانہ بھی پہنچتا تھا اور میں بھی۔ اس کے برعکس یہ حوالہ اس قسم کا کوئی سراغ اور اشارہ فراہم نہیں کرتا۔ جب میں نے کسی سربراہ مملکت یا حکومت سے کسی قسم کا کوئی عطیہ لیا ہی نہیں تو میں اندھیرے میں نشانہ نہیں دلا سکتا۔ مسٹر آغا حسن عابدی ایک درمیانی رابطہ ہو سکتے تھے اگر ان کے تعلقات صرف ایک ملک یا ایک حکومت سے ہوتے۔ آغا حسن عابدی نے اپنے کاروباری مفادات کو بہت وسیع سطح پر بہت سے ملکوں میں پھیلا رکھا ہے۔ ان کے کاروباری اور بینکاری کے مفادات ابو ظہبی، دہلی

مرتبہ کا حامل تھا اس کا وقار افسانہ حد تک گھٹا کر اسے غلاموں کی سطح پر جانے کی اجازت تھی یہی سینئر اور مستقل سرکاری افسر مارشل لا کے تحت بھی تو غلاموں کی سطح تک پہنچایا جاسکتا ہے بلکہ اس سے بھی کہیں زیادہ نیچے مسٹر افضل سعید نے اپنے 22 ستمبر 1977ء کے بیان میں یوں کہا ہے۔

وزیراعظم کسی قسم کی نافرمانی حکم عدولی اور بدلیات سے گریز کو برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ وہ کسی سے ”نالا“ نہیں سن سکتے تھے۔

اس اعتراف کا نتیجہ مسٹر افضل سعید کو بہت کم روشنی میں سامنے لاتا ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ وہ بہت ڈھیلا اور شرمیلا شخص تھا۔ جبکہ قرطاس میں بھی کہیں یہ بیان کیا گیا ہے کہ میں کس طرح ٹھنڈے دل سے راولپنڈی اور محمد حیات من کے نوٹس میں سخت ترین تنقید کو برداشت کرتا تھا۔ کس طرح میں نے فی الفور رفیع رضا سے ناقابل قبول خفیہ پیغام قبول کر لیا تھا۔ اگر دوسرے مستقل سرکاری ملازم میرے ساتھ بحث کر سکتے اور دلائل اسے پیش کرتے اور مختلف رائے رکھتے ہوئے اپنے نظریات بے خوفی سے بیان کر سکتے تھے تو پھر ایک بہت کمزور اور بزدل سرکاری افسر ہی ایسا مہینہ الزام لگا سکتا ہے جیسا کہ مسٹر افضل سعید نے لکھا۔ ایک انتہائی نازک لمحے میں مجھ سے مشورہ کئے بغیر، سابق اٹارنی جنرل نے مجھے بختیار فارمولا کے نام سے فارمولا پیش کر دیا اگر میں نے اپنے وزیروں کو اقتدارات تفویض نہ کئے ہوتے اگر میں نے انہیں مناسب وسعت اور کارروائی کے لئے آزادی نہ دی ہوتی تو مسٹر یحییٰ بختیار ایسا بے باک قدم نہ اٹھاتے اور میرے اعتماد کو بحال نہ رکھ سکتے۔ قرطاس ایض میں پینلٹی کیٹی کا ذکر بھی موجود ہے جس نے اپنی ایک مینٹنگ میں یہ فیصلہ کیا کہ مجھے درخواست کی جائے کہ میں حمود الرحمن کمیشن کو شائع کرنے کے لئے اپنے فیصلے پر نظر ثانی کے لئے پھر غور کروں۔ اس سے یہ قطعی طور پر واضح ہو جاتا ہے کہ صرف افضل سعید جیسا ایک کمزور اور بزدل افسر ہی اپنی مذمت خود کر سکتا ہے۔ ایسے اشخاص اپنی ہی بزدلی کا نشانہ بن جاتے ہیں۔

جیسا کہ میں پہلے ہی یہ ثابت کر چکا ہوں قرطاس ایض صفحہ 77 پر بیان کرتا ہے ”مسٹر افضل سعید ہمیشہ مسٹر بھٹو کے برتر موڈ کے مطابق چوکس رہتا تھا کیس کو فی الفور تیار کر دیتا تھا۔ یہاں بھی قرطاس ایض مسٹر افضل سعید کے کردار کے بارے میں کوئی اچھی رائے نہیں دیتا۔ یہ پہلے ہی ثابت کیا جا چکا ہے کہ وہ ایک کمزور آدمی تھا۔ اب یہ ثابت ہوا کہ اس میں ذاتی وقار کا بھی فقدان تھا۔ وہ اپنی رائے کاویا تندی سے اظہار نہیں کرتا تھا۔ وہ ہر وقت میرے برتر و بالا موڈ کے مطابق اس لئے چوکس رہتا تھا کیونکہ میں چیف لیڈنگ کٹو تھا۔ اور اس وقت وہ موڈ“

کے مطابق زیادہ حساس ہو گا چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر کے برتر یا دوسرے قسم کے موڈ جس نے اسے نظربندی میں رکھا اور اسے چارج شیٹ بھی کیا۔

قرطاس ایض میں صفحہ 218 پر بتاتا ہے۔ بہر حال کچھ بھی ہو مسٹر افضل سعید خان نے یہ دیکھنے میں سوچو بوجھ کا ثبوت دیا کہ تحقیقات نے مسٹر علی حسن منگی کے ساتھ تعلق رکھنے والے حکمت کی توثیق کر دی ہے۔ اس نے مسٹر ممتاز علی بھٹو کا کوئی ذکر نہ کیا ”اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ قرطاس ایض مسٹر افضل سعید کو ایک چوڑے کا دل رکھنے والا جھوٹا سمجھتا ہے۔ بے چارے آدمی کو قرطاس ایض نے کلنک کا ٹیکا لگا دیا ہے۔ اس کا دبو پن ظاہر کر دیا گیا۔ اسے ایک ایسا آدمی بنا کر پیش کیا گیا جو موقع پرست، بے وقعت، ابن الوقت اور بے ایمان افسر ہے اس کے باوجود یہ قرطاس ایض اس کے وقار اس کی کارکردگی کو تباہ کرنے کے بعد چارج شیٹ کئے گئے افضل سعید کے بارے میں یہ توقع رکھتا ہے کہ اس کی بات کا یقین کیا جائے جو صرف اور صرف اس نے ہی کیا ہے۔ اور مجھ پر اپنے ضمنی بیان میں الزام لگایا ہے۔ جبکہ وہ مارشل لا کی حراست میں تھا۔ یہ تاکیدی واصرار قطعی طور پر ناقص اور بنیادی طور پر ضعیف اور ناپائیدار ہے۔ ثانیاً، اگر یہ رقم مجھے دو سال سے زائد عرصے میں پہنچائی گئی تھی تو تب میرے وہ الزامات کہ انتخابات کے دوران روپے کی قیمت چڑھ گئی تھی۔ اور بعض بیرونی ملکوں سے روپیہ غائب ہو گیا تھا تو ان کا اطلاق ان 30 کروڑ (300 ملین) روپوں پر ہوتا ہے جو بی۔ این۔ اے کو فروری اور مئی 1977ء کے اندر دئے گئے تھے۔ روپے کی قیمت اس صورت میں کس طرح کم نہ ہو سکتی اگر مہینہ الزام کے تحت رقم دو اس سے زائد سالوں میں دی گئی تھی۔ نہ ہی اس طرح غیر ملکوں سے روپیہ غائب ہو سکتا تھا۔ کیونکہ زمانہ دو یا اس سے زائد برسوں پر محیط بتایا جاتا ہے۔ روپے کی قیمت اس طرح بڑھ گئی اور وہ بعض بیرونی منڈیوں سے اس صورت میں غائب ہو گا کہ اگر غیر ملکی کرنسی کی بہت بڑی رقمیں پاکستان میں ایک مختصر عرصے میں بھردی جائیں۔

یہ سمجھ کر کہ شکار کر لیا گیا قرطاس ایض صفحہ 238 پر بڑے فاتحانہ انداز میں بتاتا ہے۔ ”اس کے بعد پی پی پی کے پلیٹ فارم سے ہونے والی یکے بعد دیگرے تقریروں میں یہ الزام دہرایا جاتا کہ بی۔ این۔ اے نے غیر ملکی ہر دو صول کی ہے۔ 25 کروڑ کی رقم کا بندہ بتایا جاتا تھا۔ یہ بھی کہا جاتا تھا کہ کلف کی ملائیت سے پاکستانی کرنسی غائب ہو گئی ہے۔ اگر ایسا ہوا تھا تو پھر کچھ نہ کچھ کیا جانا چاہیے تھا۔ اس سے قطع نظر کہ بی۔ این۔ اے کی کارروائیوں کے آفاقی عابدی کے سفر بھی تو تھے جو روپوں سے بھرے ٹیکے لایا کرتے تھے“

اگر افضل سعید کی لاکھوں اور واحد ہمت پر یقین کیا جائے کہ 2 یا 3 کروڑ روپے دو یا اس سے زائد برسوں میں پہنچائے گئے اور ہر بلاتم چند لاکھ روپوں پر مشتمل ہوتی تھی۔ تو پھر ایسی

صورت میں پاکستانی کرنسی دنیا کی کسی بھی مارکیٹ سے غائب نہیں ہو سکتی تھی۔ نہ ہی آفا حسن عابدی کی ان سیاحتوں سے ہی روپے کی قیمت ہی اضافہ ہو سکتا تھا۔ افضل سعید کے بیان کا ان دو جڑے ہوئے توام واقعات سے کوئی تعلق بننا ہی نہیں ہے۔ ایک عام کاروباری اور تاجر بھی اس امر کی آسانی سے تصدیق کر سکتا ہے کہ صرف ایک بہت بڑی خطیر رقم کے ایک مختصر عرصے میں اندر داخل کئے جانے سے ہی روپیہ اس طرح متاثر ہو سکتا ہے۔ جس طرح یہ 1977 کے موسم بہار میں متاثر ہوا تھا۔ اور یہ اس لئے تھا کہ جماعت اسلامی کے میاں طفیل محمد کو تین یا چار مہینے کے عرصے میں 30 کروڑ روپے دئے گئے۔ مسٹر افضل سعید نے میرے اس بیان کی حمایت کی ہے جو میں نے پوری ذمہ داری سے اپنے اعلیٰ انتخابی ادارے پاکستان کی قومی اسمبلی میں 28 اپریل 1977 کی شکرہ میں لگایا تھا۔

وہ رقم جو ہر بار دولاکھ روپے تھی جو دو سال یا اس سے زیادہ عرصے میں پہنچانی گئی تو پھر مسٹر افضل سعید کو ہر بار جتنی رقم ان کے ہاتھ میں دی گئی اس کی ٹھیک اور صحیح تعداد معلوم ہونی چاہیے۔ یوں وہ اب لاپرواہانہ انداز میں نہ کہتے کہ وہ دو سے تین کروڑ تک تھی۔ دو اور تین کروڑ میں بہت بڑا فرق ہوتا ہے۔ ایک کروڑ روپے (10 ملین) رومی کاغذ نہیں ہوتے کہ مسٹر افضل سید کو یاد ہی نہ رہیں۔ یہ نقد روپیہ تھا۔ جس طرح کی لاپرواہی ان کے بیان میں ملتی ہے ایسی لاپرواہی کا مظاہرہ صحیح رقم کے بارے میں کوئی نہیں کرتا۔ ایسی صورت میں یہ کوئی معمولی بات نہیں بلکہ اس کا اطلاق بہت جائز اور صحیح طریقے سے ہوتا ہے کہ رقم ہر بار چند لاکھ ہوتی تھی اور دو یا اس سے زائد برسوں میں پہنچانی گئی تھی۔ جو شخص یہ رقم لے کر آتا تھا اگر وہ اس کی تصدیق تحریری یا خفیہ تحریر میں نہیں تو زبانی طور پر ضرور مانگتا ہو گا۔ اس کے ساتھ ساتھ مسٹر افضل سعید بھی مجھ سے کہتے کہ میں رقم کی کتنی کروں۔ تاکہ یقین ہو سکے کہ رقم مناسب طریقے سے پہنچا دی گئی ہے۔ رقم جو چند لاکھ روپے ہوتی تھی۔ اس کی گنتی میں افضل سعید یا میرا دونوں کا زیادہ وقت نہیں لگ سکتا تھا لیکن یہاں کس لاپرواہی اور بے نیازی سے بتایا جا رہا ہے کہ رقم دو یا تین کروڑ روپے تھی مسٹر افضل سعید نے جو جھوٹ بولے ہیں ان کے بارے میں ان کا اپنا رویہ بہبود ہے۔۔۔۔۔ آفا حسن عابدی جیسے پختہ کار بینکار، جو ایک غیر ملکی سربراہ مملکت کے لئے کام کر رہا ہو، اس نرم و حساس نوعیت کے کاموں کو ایسی بے ترتیبی سے انجام نہیں دیتے۔

خود قرطاس ایٹش کا رویہ جی اس رقم کے بارے میں بڑا لاپرواہانہ ہے۔ صفحہ 236 پر بیان کیا گیا ہے ”خلاصہ یہ ہے کہ دو یا تین کروڑ روپے کے لگ بھگ رقم آفا حسن عابدی کے ذریعے بھجوائے گئے“ صرف وہی جماعت جس نے تیس کروڑ روپے کی رقم تین ماہ میں وصول کی ہو،

تین کروڑ میں سے ایک کروڑ روپے کے فرق کے بارے میں ایسا لاپرواہانہ اور غیر محتاط رویہ اپنا سکتی ہے۔ لیکن ایک پارٹی جسے زیادہ سے زیادہ تین کروڑ روپوں میں سے ایک کروڑ رقم مل رہے ہوں وہی اس کی پر بہت سنجیدہ اور فکر مند ہو سکتی ہے۔

مسٹر افضل سعید بیان کرتا ہے کہ اسے یہ بتایا گیا کہ یہ رقم انتخابی مقاصد کے لئے ہے۔ دوسرے الفاظ میں قرطاس ایٹش کے مطابق مسٹر افضل سعید کو اس مقصد کا کوئی علم نہ تھا۔ جس کے تحت یہ رقم اسے دی گئی تھی۔ بس اسے تو یہی بتایا گیا کہ یہ رقم انتخابات کے لئے ہے لیکن وہ یقینی طور پر نہیں جانتا کہ واقعی یہ رقم اسی مقصد کے لئے تھی۔ اس بیان کے اس حصے پر کس طرح یقین کیا جاسکتا ہے جبکہ قرطاس ایٹش صفحہ 240 پر بتاتا ہے ”مسٹر دلاور حسن اور مسٹر ایس ایم یونس، دونوں نے اس امر سے انکار کیا ہے کہ ان کا تعلق پارٹی فنڈز سے تھا۔ ایسی صورت میں مسٹر افضل سعید خان نے دلاور حسن سے یہ کیوں کہا کہ وہ ایک پیکی تیار کریں۔ اس سوال کا کوئی تسلی بخش جواب نہیں ملتا۔“

صفحہ 241 پر قرطاس ایٹش پھر بیان کرتا ہے ”یہ اہم نکتہ قابل توجہ ہے کہ یہ تمام لین دین پارٹی فنڈز اور سرکاری فنڈز میں ہو رہا تھا اس طرح ایک دوسرے میں گڈمڈ ہو چکا تھا کہ ان دونوں کو میرے کرنے کے لئے کوئی واضح کلیہ کیجی نہیں جاسکتی تھی۔ مسٹر افضل سعید پارٹی کے امور اور پارٹی فنڈز میں مکمل طور پر شریک و ملوث تھے۔ ان کے ماتحت، جو اگرچہ کسی شمولیت اور شرکت سے انکار کرتے ہیں وہ بھی پارٹی کی ادائیگیوں کے لئے کھاتوں کا حساب رکھتے تھے۔“

”ان کے اپنے بیانات کے مطابق مسٹر دلاور حسن اور مسٹر ایس ایم یونس، سیکرٹری سرورس فنڈز، ویلفیئر فنڈ، ریلیف فنڈ، ریڈ اسے بھٹو ٹرسٹ فنڈ، پیپلز فاؤنڈیشن ٹرسٹ فنڈ اور پاکستان ریلیف فنڈ کا حساب کتاب رکھتے تھے۔“

اگرچہ آئنٹ سیکرٹری اور سیکشن افسر جو سیکرٹری مسٹر افضل سعید کے ماتحت تھے پارٹی فنڈز کا لین دین کرتے تھے اور قرطاس ایٹش کے مطابق مسٹر افضل سعید مکمل طور پر پارٹی کے امور اور پارٹی کے فنڈز میں شامل تھے تو یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ وہ یہ بھی نہ جانتا ہو کہ دو یا تین کروڑ روپے جو آئنٹ سیکشن کے لئے دئے گئے واقعی انتخابات کے لئے تھے یا نہیں؟ صاف نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ وہ جھوٹ بول رہا ہے۔ اگر قرطاس ایٹش میں یہ دیکھتے ہوئے کہ وہ پارٹی کے امور اور فنڈز میں پوری طرح شامل تھا اس پر یقین نہیں رکھتا تو پھر وہ یہ کیوں نہیں جانتا کہ دو یا تین کروڑ روپے جو انتخابات کے نام پر دئے گئے کیا واقعی انتخابات کے لئے تھے یا نہیں؟ تو پھر کوئی دوسرا کس طرح اس کی بات پر یقین کر سکتا ہے۔ جہاں تک حقیقت کا تعلق ہے اس کا پورا بیان جھوٹا ہے۔ یہ بیان اس سے زبردستی تشدد کے تحت حاصل کیا گیا 26 ستمبر 1977 کو جب اس نے

تعمینہ اس نے دو یا تین کروڑ روپے لگایا ہے (ج) ریاست کے سیکرٹ سروسز فنڈز کا پارٹی کے مقاصد کے لئے غیر قانونی استعمال -

صیغہ میں جو الزام لگایا گیا ہے اس کی واضح تردید کر چکا ہوں کہ الزام لگانے والوں کے چہرے پر سب پتے پھینک سکتا ہوں۔ جو انہوں نے جعل سازی سے کھیلنے کی کوشش کی لیکن اس موضوع کی نزاکت کے پیش نظر میں اس سے اجتناب کرتا ہوں۔ فوجی حکومت انتہائی ڈھٹائی کے ساتھ تعلقات کو بگاڑنے کی کوشش کر سکتی ہے لیکن میں ان کی اس منفی اور تباہ کن مثال کی پیروی نہیں کر سکتا۔ جس حد تک مناسب حدود میں ممکن ہو سکتا تھا میں اس کا انکشاف کر چکا ہوں۔ جہاں تک میرے ذاتی وقار کا تعلق ہے اس کے لئے میں نے اب تک جو کچھ بیان کیا ہے اس سے بھی آگے جاسکتا ہوں لیکن قوم کا مفاد مجھے اس سے روکتا ہے۔ (الف) جہاں تک اس شق کا تعلق ہے اس کے بارے میں پھر کہنے کی ضرورت نہیں کیونکہ یہ پارٹی کے جائز فنڈز تھے۔ (ج) کا تعلق ریاست کے خفیہ فنڈز سے ہے۔

یہ موضوع بھی انتہائی حساس اور نرم و نازک ہے۔ جتنا کہ شق ب میں اٹھایا گیا ہے۔ اس میں ان متعلقہ اخراجات کا ذکر ہوا ہے جو 1971 سے 1977 کے برسوں تک کئے گئے اور قرطاس انیش کے مطابق پندرہ دینے والی کل رقم 1.92 کروڑ روپے ہے، اگر مجھے سرکاری کاغذات اور دوسری دستاویزات اور ڈائریوں تک رسائی حاصل ہو سکے تو میں یہ ثابت کرنے میں کوئی دشواری محسوس نہ کروں گا کہ یہ رقم 1.92 کروڑ سے کم یا زیادہ جتنی بھی رقم ہے میں نے بطور صدر اور وزیر اعظم سائرس پانچ برسوں میں صحیح جگہ اور کاموں کے لئے استعمال کی تھی۔ یہاں یہ یاد رکھنا ضروری ہے کہ گورنر وفاقی وزراء اور صوبوں کے وزراء نے اعلیٰ نہ صرف پی پی پی کے رہنما تھے بلکہ حکومت کے اعلیٰ عہدوں پر بھی فائز تھے اس لیے چک زمین پر احتیاط سے قدم رکھتے ہوئے میں ایک ہی مثال دوں گا۔ جس سے میرے کہنے کی وضاحت ہو سکے گی۔

یہ مثال غوث بخش رینسائی کی ہے۔ یہ سچ ہے کہ غوث بخش رینسائی پاکستان پیپلز پارٹی بلوچستان کا صدر تھا۔ لیکن وہ بلوچستان کا سابق گورنر بھی تھا۔ اس کے علاوہ ایک سابق وفاقی وزیر بلوچستان کی صوبائی حکومت میں سینئر وزیر بھی تھا جب آسمانوں سے مارشل لاء کا عطیہ اترتا۔ میں نے رینسائی کی مثال اس لئے دی ہے کہ وہ موجودہ فوجی حکومت کے کیمپ میں شامل ہو چکا ہے۔ اور اب حفاظت کرنے والے بازوؤں میں محفوظ ہے۔ خدا سے خوف کھانے والی فوجی حکومت نے اس کے تمام ہرے کاموں کو فراموش کر دیا ہے۔ وہ اس طرح سے پاک اور تطہیر شدہ ہے جس طرح وہ لوگ جو مجھے اور پاکستان پیپلز پارٹی کو چھوڑ گئے ہیں۔ ان کا تحفظ اب مارشل لاء کی دھال سے کیا جاتا ہے گا۔

یہ ضمنی بیان دیا تو وہ حراست میں تھا اور اسے چارج شیٹ کیا جا چکا تھا۔ اس کے اصلی بیان میں جو اس نے 22 ستمبر 1977 کو ضمنی بیان سے چار دن پہلے دیا تھا۔ ایسے تانے بانے نہیں بنے تھے۔ اس پر مودودی اور میاں طفیل محمد کے ذریعے مزید اور اضافی دباؤ نہ ڈالا گیا تھا جن کی اپنی ذات داؤں پر لگی تھی اور وہ اس لئے میری تباہی کے درپے تھے۔

قرطاس انیش میں مسٹر افضل سعید کے تین بڑے بیانات شامل ہیں۔

(الف) چارج شیٹ کے جواب میں 22 ستمبر 1977 کا بیان۔ اور اس جواب میں پارٹی فنڈز کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ میرے بہترین علم کے مطابق قرطاس انیش میں اس کا پورا بیان شامل نہیں کیا گیا۔ مسٹر افضل سعید کو جو چارج شیٹ دی گئی تھی تو اس کا خلاصہ اس میں موجود ہے نہ ہی بطور ضمیمہ تاہم 22 ستمبر کو افضل سعید کے جواب کا ایک خلاصہ صفحہ 25 پر دیا گیا ہے۔ قرطاس انیش میں یہ چارج شیٹ ہیں دکھائی نہیں دیتی۔

(ب) 26 ستمبر 1977 کا ضمنی بیان جو بطور ضمیمہ A-225 دیا گیا اور صفحہ 225 پر درج ہے۔ ضمیمے یا قرطاس انیش میں ایسا کوئی اندراج موجود نہیں جس سے یہ نشانہ بنی ہوئی ہو کہ یہ ضمنی بیان کس کے سامنے، کس کے لئے دیا گیا تھا۔ بلکہ یہ ضمنی بیان اصلی بیان کے محض چار دن کے بعد دیا گیا۔ 22 ستمبر 1977 کا اصلی بیان اس ضمن میں خاموش ہے کہ چارج شیٹ کس نے کیا تھا؟ یقیناً یہ تصور صحیح ہو گا کہ مارشل لاء اتھارٹی نے ہی چارج شیٹ کیا ہو گا۔ دوسری ایجنسیاں جیسے ایف آئی اے کو آزادانہ انداز میں بطور تحقیقاتی ایجنسیاں کہا گیا ہے۔ لیکن مارشل لاء اتھارٹی نے چارج شیٹ کے جواب سے مطمئن نہ ہونے کے بعد مارشل لاء حکام نے افضل سعید کو مزید تنگ کیا اور توڑا مروڑا کہ وہ ایک ضمنی بیان بھی دے۔

(ج) ہاتھ سے لکھا ہوا ایک بیان جو انکوائری کمیٹی کو 10 اپریل 1978 کو دیا گیا بطور ضمیمہ A-152 شامل ہے۔ جس کے متعلق قرطاس انیش میں صفحہ 160 پر بیان کیا گیا ہے کہ یہ بیان انتہائیت کی مجموعی منصوبہ بندی روسیے امور مالیات پر کچھ روشنی ڈالتا ہے۔

اس نے یہ تمام بیانات اس وقت دیئے جب وہ مارشل لاء تحویل میں منظر بند تھا۔ ان بیانات کی بنیاد پر اور خود مسٹر افضل سعید کے اپنے یقین کے تحت کہ افضل سعید مکمل طور پر پارٹی کے امور اور فنڈز میں شامل تھا۔ قرطاس انیش صفحہ 225 پر ایک نتیجے پر پہنچتا ہے۔

”مسٹر افضل سعید جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا ہے نے فنڈز کے تین ذرائع کی نشاندہی کی (1) پارٹی کے قانونی اور جائز فنڈز جو کرنیت فیس اور واجبات اور انتخابی نشستوں کی زر ضمانت کے طور پر وصول کئے گئے (ب) ایک غیر ملکی سربراہ حکومت سے ملنے والے فنڈز جن کا

ریٹسانی کی مثال دینے کی ایک دوسری وجہ یہ ہے کہ فوجی تنظیم جاتی ہے کہ بلوچستان میں گزبر اور بغاوت کے دنوں میں ریٹسانی کو ایک خصوصی کام سونپا گیا تھا خضر خاں زرکزنی - نامور گوریلا کے ساتھ اس کے بہت اچھے تعلقات تھے - حکومت کی یہ خاص دلچسپی تھی کہ خضر خاں باوقار تشفیہ کے ساتھ پہاڑوں سے نیچے اتر آئے - اگر یہ کلیسیا حاصل ہو جاتی تو سروان میں امن کی بحالی ہو جاتی - اس حوالے سے ریٹسانی کو یہ پدایت دی گئی کہ وہ اپنے دوست خضر خاں کے ساتھ رابطہ قائم کرے اور اسے راغب کرے کہ وہ باوقار تشفیہ پر راضی ہو جائے - فوجی حکام کو یہ اچھی طرح علم ہے کہ ریٹسانی نے خضر خاں سے کئی بار ملاقاتیں کیں - اس کو بخشش کے لئے ریٹسانی کو حکومت کی پوری حمایت اور پشت پناہی حاصل تھی - مکمل قیامی اور تعاون کے باوجود ریٹسانی خضر خاں کو تشفیہ پر رضامند نہ کر سکا - مارشل لاء سے چند ماہ پہلے خضر خاں ایک مقالے میں مارا گیا - چیف آف آرمی سٹاف خوشی سے اچھل رہا تھا - بعد میں ہمیں معلوم ہوا کہ خضر خاں کی ہلاکت اس کے اپنے زرکزنی قبیلے کے افراد کی ایک سازش اور باہمی جھڑپ کا نتیجہ تھی - اس طرح سے ریٹسانی سیکرٹ سروس فنڈز کے اعداد و شمار میں غور کرتا ہے -

اگر اس موضوع کو چھیڑا گیا اور میں اپنے وقار اور شہرت کے تحفظ کے لئے ان اخراجات کی تفصیلات بتانے پر مجبور کیا گیا تو پاکستان کے قومی اور بین الاقوامی مفادات میں پھر دہراتا ہوں کہ ان مفادات کو ناقابل تلافی نقصان پہنچے گا قدیم زمانے اور مشرق وسطیٰ اور جدید ریاستوں کی تاریخ میں پہلی بار ایسا ہو رہا ہے کہ سرکاری سیکرٹ سروس فنڈز کے موضوع اور مسئلے کو اعلیٰ ترین سطح پر تحقیقات اور مقدمے کی صورت میں چھیڑا جا رہا ہے - اس کی مثال کسی قسم کی حکومت میں بھی نہیں ملتی - اپنی اعلیٰ اور مناسب وجوہات کی بنیاد پر خفیہ فنڈز چیف ایگزیکٹو کی صوابدہ پر ہوتے ہیں - وہ اس ضمن میں ایک عمومی سرٹیفکیٹ دیتا ہے - اور اس میں کسی قسم کی معلومات اور تفصیلات کو بیان نہیں کرتا - سیکرٹ سروسز کے فنڈز کے استعمال کے لئے اگر رازداری ختم کر دی جائے تو پھر سیکرٹ سروس فنڈز کے وجود کی کوئی ضرورت باقی نہیں رہتی -

اگر ہر آنے والی فوجی حکومت یا حکومت یہ فیصلہ کرنے میں ہٹھ جائے کہ اس کی پیشرو حکومت نے سیکرٹ فنڈز کا صحیح یا غلط استعمال کیا تھا تو پتہ ذرا کا بائس کھنسنے سے کم واقعہ نہیں ہوگا - ہمارے صوبائی وزراء نے اعلیٰ ہوتے تھے - فوجی حکومت کے مارشل لاء منسٹر سیکرٹ ہیں - سیکرٹ سروسز کی ضرورت ختم نہیں ہوتی یقیناً چیف مارشل لاء منسٹر سیکرٹ سروس کی ضرورتوں کے لئے اپنی ذاتی دولت خرچ نہیں کر رہا - وہ یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ یہ ایسی حیثیت برقرار رکھ سکتا ہے کہ حکومت پر غاصبانہ قبضے کے ایک برس بعد بھی اس نے سیکرٹ

سروسز فنڈز کو ہاتھ تک نہیں لگایا - ایسی مثال قائم کرتے ہوئے اس فوجی حکومت کے بعد آنے والی حکومت کو یہ حق حاصل ہو گا کہ وہ چھان بین کر سکے کہ اس نے اپنی انتظامی صوابدہ خفیہ فنڈز سے استفادہ کرتے ہوئے جائز طور پر استعمال کی تھی یا نہیں اس میں کچھ شک نہیں کہ یہ آدمی اور اس کی حکومت ایک ملیامیٹ کر دینے والی تباہی کے بیج بوریس ہیں -

مثال اور موازنے کے لئے دیکھیں تو رواں سال کے اعداد و شمار خود بولتے ہیں مجھ پر سرکاری خزانے کو ضایع کرنے کا الزام لگایا گیا آئے دیکھیے کہ کس طرح دیندار پخت کرنے والی مارشل لاء حکومت نے کسی بھی عائدہ دے داریوں کے بغیر چیف مارشل لاء منسٹر کے سیکرٹریٹ کا پیسے بے چگ سال میں بحث بنایا تھا -

(i) 6,32,500 روپے کی رقم ان ملازموں کی تنخواہ کے لئے رکھی گئی ہے جنہیں چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کے سیکرٹریٹ میں ملازمتیں دی گئی ہیں - میرے زمانے میں یہ رقم 5,67,500 روپے تھی -

(ii) کنٹریکٹ الاؤنس کے تحت 8,90,000 روپے کی رقم کا مطالبہ کیا گیا ہے - ایک سال پہلے اس رقم کے تحت 8,25,000 روپے کی رقم لی جاتی تھی -

(iii) میرے زمانے میں چار لاکھ روپوں کی رقم دوروں اور سفر کے لئے مختص کی گئی تھی - رواں سال میں اتنی ہی رقم اس کام کے لئے مختص کی گئی ہے جبکہ یہ ایک غیر نمائندہ ڈھانچہ ہے جس کا عوام کے ساتھ کوئی رابطہ نہیں -

(iv) سٹاف کی تنخواہوں کے لئے 6,13,300 روپے اس سال لئے گئے - جبکہ میرے عہد حکومت کی فضول خرچی میں یہ رقم 3,65,000 روپے تھی اور یہ ایک جمہوری دور حکومت تھا - اس غیر نمائندہ دور حکومت میں اس کے تحت اخراجات 5,96,500 کو چھوٹے ہیں

(v) سٹاف الاؤنسز کے لئے میرے سیکرٹریٹ کی طرف سے 3,90,000 روپے طلب کئے جاتے تھے - اس سال سٹاف الاؤنس کی ڈیمانڈ 6,98,300 روپے کی گئی ہے -

(vi) اس سال سیکورٹی کی جو کوشاں مارشل لاء منسٹر کے ساتھ چمکے گی 83,000 روپے کی رقم اٹھا جائے گی -

(vii) سیکرٹ سروسز کا بجٹ - سیکورٹی سہل کے علاوہ 10,00,000 روپے کا بنایا گیا ہے -

(viii) میں جے پرنس آف کائی کہا گیا ہے - اس نے اپنے دور حکومت کے آخری برس 89,16,000 روپے "خفیہ" کئے - اس سال چیف مارشل لاء منسٹر کے سیکرٹریٹ پر 1,06,48,000 روپے خرچ کئے جائیں گے - اور ان کے بہت سے

ساتھی مسلح افواج کی رقم سے اپنی تنخواہیں اور الاؤنس بھی وصول کر سگے۔

(ix) میرے برے دنوں میں انٹیلی جنس بیورو 3,56,78,000 روپے نکل جاتا تھا۔ اور موجودہ بڑگی اور نیکی کے دنوں میں 3,85,64,000 روپے انٹیلی جنس پر خرچ کئے جائیں گے یہ رقوم اور اعداد و شمار اپنی کہانی خود سناتے ہیں۔

قرطاس ایٹس میں مذکور پارٹی فنڈز کی تین حالت پر بحث کرتے ہوئے، جو کہ قرطاس ایٹس میں شامل ایک ضمنی بیان کی نقل کے برعکس ہے، میں ایک رضا کارانہ ضمنی بیان دینا چاہوں گا۔ میرا بیان یہ ہے کہ میری بیوی، منیم نصرت بھٹو کا قطعی طور پر پارٹی فنڈز کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے۔ قرطاس ایٹس میں مسٹر افضل سعید کا بیان صفحہ 160 پر نقل کرتے ہوئے حسد اور کینے سے منیم نصرت بھٹو کو اس میں ملوث کرنے کی کوشش کی گئی ہے جو ایس وقت پاکستان پیپلز پارٹی کی قائم مقام پیر مین ہیں۔ یہ جو مسٹر افضل سعید نے کہنے کے لئے بات بنائی ہے۔ جہاں تک میں جانتا ہوں انتخابات کے لئے فنانس کو سابق وزیراعظم پاکستان منیم نصرت بھٹو سنبھالتی تھیں۔ ”وہ جہاں تک میں جانتا ہوں یقیناً زیادہ نہیں ہے۔ اسے خود یقین نہیں ہے۔ لیکن قرطاس ایٹس کے صفحہ 163 پر اسٹیٹسمنٹ اور کیپٹن سیکرٹری مسٹر وقار احمد کو میری حکومت کا ایک اور ستون قرار دیا گیا ہے۔ جو اس معاملے میں پورا یقین رکھتا ہے۔ وہ کہتا ہے منیم بھٹو خواتین کے شعبے کی انچارج تھیں مسٹر افضل سعید حسابات کے انچارج تھے جب سابق وزیراعظم خود یہ کہتا ہے کہ منیم نصرت بھٹو کا انتخابات کے روپے پیسے سے کوئی تعلق نہیں تھا تو افضل سعید کا بیان اگر اسے جوں کا توں قبول کر لیا جاتا ہے تو پھر یہ بھی یقین کر لینا چاہیے کہ سابق وزیراعظم ہی انتخابات کے فنانس کو سنبھالتا تھا۔

اپنے غلط اور نقصان پہنچانے والے مقاصد کے تحت کتوں کی طرح سونگتے ہوئے قرطاس ایٹس کے صفحہ 161 پر مسٹر رفیع رضا کے ایک نوٹ مورخہ 9 اکتوبر 1976 کا حوالہ دیا گیا ہے۔ یہ ایک عویل نوٹ ہے، لگ بھگ آٹھ صفحات پر مشتمل جس میں الیکشن کمیشن کی دو میٹنگوں کی ابتدائی سفارشات کا خلاصہ پیش کیا گیا ہے۔ اس ابتدائی نوٹ میں وہ سفارشات جن کا تعلق بجٹ اور فنانس سے ہے کو صفحہ 161 پر یوں نقل کیا گیا ہے۔

”لیکن فنڈز منیم نصرت بھٹو کنٹرول کر سکیں گی۔ تاہم یہ مناسب نہ ہو گا کہ منیم صاحبہ کو ہر روز حساب کتاب کے لئے زحمت دی جائے بجٹ اور اخراجات پر مجموعی بنیادوں پر باقاعدگی سے ان کے ساتھ بات چیت ہوگی اور وہی انہیں طے کر سکیں گی۔ اس کے بعد یہ سفارش کرنے کا فیصلہ ہوا کہ الیکشن آفس کا انصرام منیم صاحبہ مسٹر افضل سعید کی وساطت سے کر سکیں گی جو حساب کتاب رکھیں گے۔ فنانس کا ایک شعبہ الیکشن آفس میں کھولا

جائے جو تفصیلی حسابات رکھے گا۔

ایک گدھ کی طرح قرطاس ایٹس اس تجویز کو اپنی گرفت میں لے کر صفحہ 236 پر بیان کرتا ہے۔

”فنڈز کا دوسرا بڑا ذریعہ وہ رقم تھی جو آغا حسن عابدی کے ذریعے آتی تھی۔ جیسے کہ مسٹر افضل سعید نے انکشاف کیا ہے۔ اس رقم کو منیم بھٹو خرچ کرتی تھیں اور بلاواسطہ اس کی تصدیق مسٹر رفیع رضا کے اس نوٹ (ضمیمہ 17) سے بھی ہوتی ہے جو 9 اکتوبر 1976 کو لکھا تھا۔ اس رقم کا حصہ صوبائی پارٹی فنڈز میں منتقل کر دیا جاتا تھا۔ صنعت کاروں اور کاروباری افراد سے بھی عطیات جمع کئے گئے۔“

قرطاس ایٹس کے مصنف نے مسٹر وقار احمد کے بیان کو یکسر توڑ مروڑ دیا ہے۔ جو حکومت کے ایک ستون تھے۔ اور اس کے برعکس مسٹر افضل سعید کے بیان کو معتبر ٹھہرایا ہے اور مسٹر رفیع رضا کے سفارشات نوٹ سے چھٹانک لگا کر یہ نتیجہ نکال دیا کہ منیم بھٹو ”فنڈز کے بڑے حصے کو خرچ کرتی تھیں۔“

قرطاس ایٹس کا مصنف شدید ہجیمان اور جوش میں مبتلا ہے۔ وہ ہر طرح کے حقیر اور معمولی جیلے بھانے کی تلاش میں ہے۔ ہوا میں تنکے کو پکڑنے کی کوشش کرتا ہے جس سے نہ صرف مجھے بلکہ میری بیوی اور میرے بچوں کو بھی پھانسی پر لٹکایا جاسکے۔ یہ میں چاہتا ہوں کہ میرے یہ الفاظ انہیں میں نے بڑی سنجیدگی اور پختہ توقع کے ساتھ کہا ہے، میرے آٹھ کروڑ عوام یاد رکھیں کہ وہ ”غیرت“ کے بغیر نہیں ہیں۔ میں نے پوری شدت سے اور بالکل درست طور پر آغا حسن عابدی کی شرکت کا انکار کیا ہے اور اسی طرح آغا حسن عابدی بھی اس کی تردید کر چکا ہے۔ میں یہ بھی ثابت کر چکا ہوں کہ مسٹر افضل سعید کے کسی بھی بیان پر یقین نہیں کیا جاسکتا۔ خاص طور پر ایک ایسا بیان جو گھوڑا لیا اور مبہم ہے اور اگر قرطاس ایٹس خود اپنے اس حتی نتیجہ تک پہنچا ہے کہ افضل سعید پارٹی فنڈز کا انچارج تھا تو پھر اس نتیجے کو مسٹر وقار احمد میری حکومت کے ایک ستون سے ملا کر دیکھنا ضروری ہے۔ کہ خود اس کے اپنے نتیجے میں کتنا تضاد ہے کہ افضل سعید فنڈز کا انچارج تھا۔ قرطاس ایٹس جھوٹ بولتے ہوئے رنکے ہاتھوں پکڑا گیا ہے۔

قرطاس ایٹس کے مصنفین کو جب تک یہ مشکوک تسکین اور مسرت ملتی رہے گی کہ وہ مجھے میری بیوی اور میرے بچوں کو نقصان اور تکلیف پہنچا رہے ہیں، انہیں کلمے جھوٹ اور اپنے ہی شدید تضادات کا پل کھینچنے پر غم نہیں آئے گی۔ وہ تمام لوگ جو سیاسی اور ذاتی طور پر میرے ساتھ عقیدت رکھتے ہیں۔ انہیں میرے یہ الفاظ اپنے دلوں پر نقش کر لینے چاہئیں رفیع رضا کا

نوٹ سفارشاتی تھا۔ اور اس کے جاریے میں میرا لکھا ہوا "ہاں" ایک تجرباتی اور عمومی منظوری تھی۔ اگر میں اس پر زیادہ غور کرتا تو میں اس میں کریم کر دیتا یا مسترد کر سکتا تھا اور خود مستقیم نصرت بختو بھی اس ذمے داری کو قبول کرنے سے انکار کر دیتیں۔ سنگم نصرت بختو اس میں شامل نہیں تھیں اور اس قریب قرطاس امتیاز اس کے 342 مضمیموں میں منصف مزاج اور معقول انسانوں کے لئے کوئی ایسی چیز نہیں ہے کہ انہیں استقامت کے رستے کے اس سرے سے پھنسنے میں لایا جاسکے۔

اگر میری پارٹی کے پاس یہ تمام فنڈز تھے تو میں نے وہ آخری خط 4 جولائی 1977 کو نہ لکھا ہوتا جو پارٹی فنڈز کے متعلق تھا "قرطاس امتیاز اپنے صفحہ 242 پر یہ کہتے ہوئے لکھتا ہے۔ "پارٹی کے فنڈز کے بارے میں مسٹر بختو کے آخری خط پر 4 جولائی 1977 کی تاریخ ہے۔ اسے ضمیمہ نمبر 272 میں ملاحظہ کیا جاسکتا ہے۔ یہ پنجاب پی پی پی کے صدر شیخ رفیق احمد کے نام ہے۔ یہ ایک سخت یاد دہانی ہے۔ جس میں کہا گیا ہے کہ اندراجاتی فیس کی بڑی رقمیں انہی تک واجب الادا ہیں۔ جنہیں پیٹر مین کے جیپ بینک اکاؤنٹ میں فوراً جمع کر دیا جائے۔ چونکہ انتخابات دوبارہ ہونے کے اندازے محسوس نئے جارہے ہیں اس لئے ان فنڈز کی ضرورت ہے۔ راؤ رشید نے نشانہ دہی کی ہے کہ ناچینے ریفرنڈم کے لئے ایک کروڑ روپے کی ضرورت ہوگی۔ دوبارہ انتخابات کے نئے بیسوں کی منتہی ضرورت ہوگی اس کا انہی اندازہ لگانا ممکن نہیں۔ تاہم یہ اندازہ لگانا غلط نہ ہو گا کہ اندراجاتی رقوم اس کے لئے کافی نہیں ہوں گی۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ پارٹی کے پاس فنڈز کی کمی تھی۔ اس معاملے کے ساتھ میری پریشانی بھی ثابت ہوتی ہے۔ اگر ایک فیاض غیر ملکی سربراہ حکومت ہمارے انتخابات کے اخراجات برداشت کر رہا تھا تو پھر میں 4 جولائی 1977 جیسے خط پارٹی لیڈروں کے نام نہ لکھتا کہ وہ پارٹی فنڈز جمع کر س۔ میں اس وقت مشرق وسطیٰ کے ملکوں کے دورے سے واپس آیا تھا۔ پی پی پی نے اسے مذاکرات کی تجدید نو کر دی تھی۔ میں تب بھی پارٹی فنڈز کے بارے میں فکر مند تھا۔ یہ کسی خوشحال یا ایسی پارٹی کا رد عمل نہیں ہو سکتا جو خوشحال ہو اور جسے ایک فیاض غیر ملکی سربراہ حکومت سرمایہ دے رہا ہو۔ قرطاس امتیاز میں متعدد مقامات پر راؤ رشید اور حفیظ پیرزادہ کا ذکر ہوا ہے کہ ریفرنڈم کے لئے ایک بہت بڑی رقم کی ضرورت ہوگی۔ ریفرنڈم کا انعقاد حکومت کرتی ہے۔ اس کے لئے فنڈز حکومت برداشت کرتی ہے۔ چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر اگر اسی مضحکہ خیز دہائی سوال لوکل باؤنڈ کے انتخابات پر ریفرنڈم کرتا ہے تو وہ سرکاری فنڈز کا غلط استعمال کرے گا۔ کسی ریفرنڈم کے لئے پارٹی فنڈز جمع کرنے کا سوال ہی

پیدا نہیں ہوتا خواہ یہ سوال کوئی شخص بھی اٹھائے۔ ریفرنڈم الیکشن نہیں ہوتا۔ جیسے کہ پاکستان بھارت کو یہ بتانا رہتا ہے کہ اسنے جموں اور کشمیر کے عوام کی امنگوں اور آرزوؤں کو جانتے کے لئے کہ وہ اپنی قسمت کا کیا فیصلہ کرتے ہیں۔ ایک ریفرنڈم کر لیا، الیکشن نہیں۔ اگر ایک چاندیو سردار اور اس کے مقام ورتے کو گھنایا جاسکتا ہے تو بھی میں یہ کہنے کی کوشش نہیں کروں گا کہ جب میں 1958 میں وفاقی وزیر بنا تو کوئی فقیر یا گداگر نہیں تھا۔ پاکستان کی ادائیگیوں میں کہنہ خسارے کی وجہ سے وزارت تجارت ہمیشہ سے سونے کی کان رہی تھی۔ میں صدر ایوب خان کے "سنہری دور" میں وفاقی وزیر تجارت بنا۔ وزارت تجارت سونے کی چند بڑی کانوں میں سے ایک تھی۔ صدر ایوب کے بیٹے راتوں رات لکھ پتی بن گئے تھے۔ میرا دوسرا بیٹا بھی مارشل لا کے ایک ماہ بعد پیدا ہوا تھا یہ لٹیرے نوابوں کا دور تھا۔ جب وزیر اور عہدے رہتے تھے۔ ایک اسلام آباد میں بطور وزیر مالیات اور دوسرا عالمی بینک واشنگٹن میں بطور لیگزٹیمو ڈائریکٹر۔ وسیع پیمانے پر منظم کرپشن کا ظہور پاکستان میں پہلے مارشل لا کے دوران ہوا۔ یہ سنہری دور۔ سرکاری سالوں کا دور تھا۔ میں فخر سے کہہ سکتا ہوں کہ میرا کردار ہر داغ دہنے سے بالاتر تھا۔ میں اس حکومت کے ان چند رہنماؤں میں سے ایک تھا۔ جن کے ہاتھ صاف تھے۔

مارشل لا کے نفاذ کے چند ماہ بعد، کراچی کے ایک استقبالیے میں میرے ساتھ گفتگو کرتے ہوئے ایک صنعت کار نے نیم مزاحیہ انداز میں کہا کہ مارشل لا بلیک مارکیٹنگ نہیں روک سکتا۔ میں نے اس سے پوچھا کیا وہ بلیک مارکیٹنگ کرتا ہے اس کا جواب تھا جناب سچی بات یہ ہے کہ جیسی بھی ایسا کرتا ہوں ورنہ میرا کاروبار چوٹ ہو جائے۔ یہ سنتے ہی میں نے وہیں اس وقت جیسا کہ وہ کہتے ہیں عین موقع پر اس کی گرفتاری کا حکم دیا۔ یہ خبر نیویارک ٹائمز میں شائع ہوئی، لیکن پاکستان میں اسے دبا دیا گیا۔ اس صنعت کار کو ایک گھنٹے کے اندر اس بنا پر ہار دیا گیا کہ جو شیلے اور گوجران وزیر تجارت کے اس اقدام سے ملک کا کاروباری طبقہ خوفزدہ ہو جائے گا اور ملک میں غمی سرمایہ کاری کی فضا خراب ہو جائے گی۔

اس کے بعد مجھے تیل، توانائی اور قدرتی ذرائع کا وزیر بنایا گیا جو ایک اور سونے کی کان تھی۔ میں نے اپنے اس دور وزارت کے زمانے میں پاکستان میں مغربی تیل کمپنیوں کی دم گھونٹنے والی اجارہ داری کو ختم کیا۔ میں نے تیل کی صنعتوں کے دو بہت طاقتور غیر ملکی نمائندوں کو اس لئے پاکستان سے محال جانے کا حکم دیا کہ وہ دونوں مالیاتی وزارتوں میں اعلیٰ افسروں کو بد عنوان اور رشوت خور بنا رہے تھے۔ اور خود انتہائی بد عنوانیوں کا ارتکاب کر رہے تھے۔ دسمبر 1960 اور مارچ 1961 میں میں نے سوویت یونین کے ساتھ تیل کے سمجھوتے

کئے۔ اس کے بعد مجھے وزیر صنعت بنادیا گیا جو سنہری دروازے کی سب سے بڑی سونے کی کان تھی میں نے سرکاری سیکٹر کا رخ کیا اور پی آئی ڈی سی پر توجہ دی۔ لیکن پاکستان کے بانیس دولت مند گھرانوں اور ان کے سرپرست وزیر خزانہ نہ مجھے اس وزارت سے چلتا کر دیا کیونکہ میں نے ان کی بدعنوانیوں کے بارے میں جو انوائری شروع کرائی تھی۔ اس سے انہیں تکلیف پہنچ رہی تھی۔

تیس تیس ملین روپے ایک پراسرار غیر ملکی سربراہ حکومت سے لینے کا فرضی الزام ان پیشکشوں کے مقابلے میں بہت معمولی حیثیت رکھتا ہے اگر اس کا موازنہ ان پیشکشوں سے کیا جائے جو میں نے پاکستان کے وزیر خارجہ کی حیثیت سے اکتوبر 1963 اور دسمبر 1965 میں بھارت سے ٹھکرادی تھیں۔ میں پی این اے کا کوئی سیاست دان نہ تھا کہ اپنے ملک کی خارجہ پالیسی پر سودا کر لیتا 1968 کے موسم گرما میں میں اور میری بیوی پیرس میں تھے۔ ہمیں ایک ضیافت میں مدعو کیا گیا۔ اس ضیافت میں ایک بے انتہا دولت مند پڑوسی ملک کی شہزادی بھی مدعو تھی۔ ضیافت شروع ہونے سے پہلے اس نے مجھے اپنی رہائش گاہ میں ملنے کے لئے کہا۔ ہم اس کی شاندار رہائش گاہ میں گئے اور پاکستان اور اپنے علاقے کی سیاست پر بے تکلفانہ گفتگو کرنے لگے۔ اس کے بعد ہم ضیافت میں شرکت کے لئے روانہ ہوئے لیکن یہ موضوع کار میں بھی چلتا رہا۔

شہزادی نے ایک ہیرے والا پینڈنٹ پہن رکھا تھا۔ یہ ہیرا چٹان کی طرح تھا جب کھانا ختم ہو گیا تو ہم کافی پیئنے کے لئے دوسرے کمرے میں گئے۔ میری بیوی اور میں ایک کونے میں شہزادی کے ساتھ بیٹھے تھے۔ اس کے ساتھ اس کی دو مصاحب خواتین تھیں۔ شہزادی نے اس موضوع پر بات جاری رکھی یہ بہت زندہ اور دلچسپ گفتگو بن گئی۔ اس کے خاتمے پر شہزادی کچھ سوچ بچار کرنے لگی۔ وہ اپنے پینڈنٹ کے ساتھ کیلتی ہوئی گہری سوچوں میں گم تھی۔ اچانک اس نے کہا، ”ذوالفقار“ اگر تم پاکستان کے صدر بن گئے تو یہ میں تمہیں دیدوں گی۔ اس نے اپنی انکلیاں یاد پر رکھیں ہم خوشدلی سے ہنسنے لگے اور بات ختم ہوئی۔

کئی سال بعد جب میں پاکستان کے صدر کی حیثیت سے ان کے عظیم ملک گیا تو شہزادی نے مجھے اور میری بیوی کو اپنے محل میں مدعو کیا۔ جب ہم تمہیدی رسوم کے بعد ٹھیک سے بیٹھ گئے تو شہزادی نے ایک منضوف پیمٹ پیش کیا اور کہا کہ میں اسے کھولوں۔ ایسا کرتے ہوئے میں نے وہی ہیرے کا پینڈنٹ دیکھا۔ شہزادی نے کہا ہم اپنا وعدہ نہیں توڑتے بڑے جتن اور دلائل کے بعد شہزادی نے میری دشواری کو سمجھ لیا۔ میں نے اسے مجبور کر دیا تھا کہ وہ اپنا بے انتہا قیمتی پینڈنٹ واپس لے لیں۔ میں نے اسے بتایا کہ اس کا یہ عندیہ

میرے لئے اس تحفے اور اس کا خیال اس پینڈنٹ سے زیادہ قیمتی ہے۔

1970 کے انتخابات کے دوران میں فلڈین پوٹل لاہوری مقیم تھا جب ایک غیر ملکی مجھے ملنے کے لئے آیا۔ تعارف اور رسمی تکلفات کے بعد اس شریف آدمی نے مجھے بتایا کہ اسے اس کے صدر نے انتخابات میں میری اعانت کی پیش کش کے ساتھ بھیجا ہے۔ میرا رد عمل کیا تھا؟ اس کے ٹھیک چار دنوں کے بعد لاہور کے کچھ وکیلوں نے انٹرنیشنل پوٹل میں مجھے استقبالیہ دیا۔ یہاں میں نے مشرق وسطیٰ کے قصبے کے لئے ایک راجر زیلمان قبول کرنے پر اس صدر پر زبردست حملے کئے میری اس تقریر کے ایک ہفتے یا اس کے کچھ بعد، اس ملک کا سفیر مجھے کراچی میں میری رہائش گاہ پر ملنے آیا۔ اس نے مجھے بتایا کہ صدر نے میری تقریر پڑھ لی ہے۔ اور اس نے اپنے سفیر سے یہ کہا ہے کہ وہ مجھے یہ بتا دے کہ میں نے اس کا ”دل توڑ دیا ہے“ میں نے سفیر سے کہا کہ وہ میرا یہ پیغام انتہائی احترام سے صدر تک پہنچا دے کہ ”اس نے میرا دل توڑا تھا“۔

ایسی ان گنت مثالیں ہیں۔ اس میں سب سے تازہ یہ کہ اکتوبر 1976 میں سعودی عرب کے جلال تآب شاہ خالد پاکستان کے دورے پر آئے۔ پرمیجیٹی نے مجھے ایک رولز رائیس کار دی اور یہ اصرار کیا کہ یہ ایک ذاتی تحفہ ہے۔ جو صرف میری ذات کے لئے ہے۔ بہر حال اس کار کو فی الفور سرکاری املاک میں رجسٹر کرایا گیا۔ میں نے شاہ خالد کا اس فیاضانہ تحفے پر دل سے شکریہ ادا کیا تھا۔ اگر غلام محمد شاہ لدن سوڈ کی کڈ لک اپنے لئے لے سکتا تھا تو میں بھی یہ رولز رائس اپنے لئے رکھ سکتا تھا۔ میں کوئی ولی نہیں ہوں۔ لیکن میں استا کنا بکار بھی نہیں ہوں جتنا کہ یہ فوجی ٹولہ مجھے بنا کر پیش کر رہا ہے۔ میں ایسے معاملات کو سامنے لانے میں کوئی مسرت محسوس نہیں کرتا۔ لیکن میں کیا کر سکتا ہوں؟ یہ فوجی حکومت اپنا توازن کو چکی ہے۔ میں اپنے نام کے دفاع کے لئے واضح اور برملا تھوڑی سی معلومات سامنے لانے پر مجبور کر دیا گیا ہوں۔

ان تمام برسوں میں بڑے رشک کے ساتھ میں نے اپنی نیک نامی کی حفاظت کی ہے مجھ میں کئی خاصیاں ہیں۔ میں غلطیوں کا پتلا ہوں۔ لیکن میری کوئی بھی غامی ہو۔ میں ایک بد عنوان اور کرپٹ آدمی نہیں ہوں۔ اس نامشکور انداز میں کسی کی تادرب کرنا بہت تکلیف دہ ہوتا ہے۔ یہ تو بوس استقام کا ایک سلسلہ ہے۔ مجھے اذیت دینے والوں نے پاکستان کے نام کی تذلیل کی ہے۔ تیس سے چونتیس سال تک کی خدمات میرے پس منظر میں کھڑی ہیں۔ وقت ہی یہ بتائے گا کہ میرا نام برصغیر کے مجرموں کے ساتھ لیا جائے گا یا ان ہیروز میں جن کی شہرت دنیا بھر میں پھیلتی ہے۔ میرے نام اور میرے وقار کے محافظ عوام ہیں اور یہ تاریخ کے دل میں دھڑکتا رہے گا۔

(۱۲)

پھانسی کی کوٹھڑی اور تاریخ

میرے خلاف مجاہدانہ اور مخالفانہ پروپیگنڈہ اس نازک اور مشکل وقت کے سنگم پر اس طرح ہو چھاؤ کر رہا ہے جیسے کسی خود کار پتھیر سے گولیاں برس رہی ہوں حتیٰ کہ ایک عام آدمی بھی یہ بخوبی جانتا ہے کہ اس خاص وقت میں میرے خلاف جھوٹ کے پل کیوں باندھے جا رہے ہیں۔ یہ سلسلہ ایک برس سے بھی زائد عرصے سے جاری ہے اور پوری دنیا میں اس جیسے غلیظ پروپیگنڈے کی مثال نہیں ملتی۔ اس میں کسی قسم کا کوئی شبہ نہیں کہ شہرت کا یہ آہر اس پر دم کورٹ میں میرے مقدمے کی سماعت کے دوران اپنے عروج پر پہنچ رہا ہے۔

18 مارچ 1978 سے میں نے چوبیس گھنٹوں میں سے بائیس یا تین گھنٹے ایک جس زدہ، دم گھونٹنے والی موت کی کوٹھڑی میں بسر کئے ہیں۔ میں نے طویل موسم گرما کی حدیث اور گرمی اور برسات میں اس کی گھٹن اور بدبو کو برداشت کیا ہے روشنی کا انتظام ناقص ہے۔ میری بینائی بدتر ہو چکی ہے۔ میری صحت کا شیرازہ بکھر چکا ہے۔ لگ بھگ ایک برس سے میں قید تنہائی کی اذیت برداشت کر رہا ہوں لیکن میرا حوصلہ بلند ہے۔ میں لکڑی کا تپا ہوا نہیں ہوں کہ جو آسانی سے جل سکتی ہے محض اور صرف اپنی قوت ارادی کے بل بوتے پر جبکہ حالات انتہائی ابتر صورت اختیار کر چکے ہیں میں نے یہ تحریر لکھی ہے۔ اب جتنے بھی قرطاس ایض شائع کئے جائیں میں عوامی رائے کے سامنے اپنے آپ کا دفاع نہیں کروں گا۔ کیونکہ میری خدمات جو ہمارے عوام کے نصب العین اور آرزوؤں پر مبنی ہیں۔ عوام کے سامنے آئینہ کی طرح رکھی ہیں میرا نام جنگی قیدیوں کی واپسی مسئلہ کشمیر، اسلامی سربراہی کانفرنس سیکورٹی کونسل پروتاریہ کے کار کے ساتھ ہم معنی و متضاد ہو چکا ہے۔ عام حالات میں جھوٹ کے پلندے پر مشتمل گھنٹاؤں کی دستاویز کا جواب دینے کی بھی زحمت نہ کرتا۔ لیکن حالات معمولی نوعیت کے نہیں ہیں۔ اس میں اصول شامل ہے۔ جواب دینے کے حق کا اصول اس حق کا اصول کہ جھوٹ کا مقابلہ صداقت سے کیا جائے۔

کہا جاتا ہے کہ بد تمدن شر سے بھی کچھ نیکی نکل آتی ہے۔ پری کی اس دستاویز سے جو اچھائی برآمد ہو سکتی ہے۔ وہ یہ ہے کہ جو بچے بہا کفیوژن اس پبلٹی کے ذریعے پھیلا جا رہا ہے۔ اس میں سے حق اور صداقت چھن کر باہر آجائے، اور ایک مقدمے پر جو اثرات ہونے ہیں وہ ہمیشہ کے لئے ختم ہو جائیں۔ جب میں نے مقدمہ قتل کے حوالے سے اس امر پر احتجاج کیا کہ کھلی اور عام سماعت میری صفائی میں ہونی چاہئے تھی تو میں ججوں کے سامنے پبلٹی اور انصاف کا فرق واضح نہیں کر سکا تھا۔ میں مقدمے کی کھلی سماعت کا مطالبہ کر رہا تھا۔ کیونکہ انصاف کا تصور کھلی اور عام سماعت کے ساتھ جڑا ہوا ہے کھلی اور عام سماعت کے لئے سیاسی اور قانونی جدوجہد کو بیکداس میں بطور خاص سزائے موت بھی شامل ہو، شہری حروف میں لکھا گیا ہے۔ حضرت موسیٰ نے ظلم کے خلاف خروج کے زمانے میں اپنے پیروکاروں سے اس کی تبلیغ کی تھی۔ یہی پیغام ہمیں حضرت عیسیٰ کے پہاڑی والے وعظ میں ملتا ہے خدا کے آخری پیغمبر بھی انصاف کھلی مسجد میں کیا کرتے تھے اور اس میں کسی پابندی کی شرط کو ملحوظ نہ رکھتے تھے۔ رومی غلام سپارٹکس نے اپنی جان انصاف کے لئے دیدی افلاطون ارطو اور مقراط نے کھلے اور عام انصاف کا فلسفہ پیش کیا ہے۔

یورپ اور برطانیہ کی تاریخ کھلی اور عام سماعت کے مقدموں سے بھری پڑی ہے کامن لا میں مقدمے کی کھلی سماعت کو انصاف کا لازمی جزو اور حصہ قرار دیا گیا ہے۔ امریکی عوام نے شجاعانہ جدوجہد کے بعد کھلی عام سماعت کے حق کو تسلیم کر دیا۔ اور اسے امریکی دستور کی چھٹی ترمیم کا جزو لائیفک بنوایا۔ یہ قول کہ ”صرف انصاف ہی نہ کیا جائے بلکہ انصاف اس طرح کیا جائے کہ دیکھا بھی جاسکے“ قانون کا ایک ناگزیر اور بنیادی غیر متبدل حصہ ہے۔ مقدمہ قتل کی سماعت کے دوران ایک جج نے یہ تندوتیز قسم کا ریمارک دیا ”تم تم پر مقدمہ چلا رہے ہیں۔ عوام پر نہیں“ اس درخشاں ریمارک پر لاہور ہائی کورٹ کے چیف جسٹس نے یوں اضافہ کیا لیکن یہ پبلٹی چاہتا ہے، کیا ستم ظریفی ہے۔ میں نے لاہور میں مقدمے کی سماعت کے دوران کہا تھا

”یہ حقیقت فراموش کر دیجئے کہ میں پاکستان کا صدر اور وزیراعظم رہا ہوں۔ فراموش کر دیجئے کہ میں ملک کی سب سے بڑی سیاسی جماعت کا رہنما ہوں۔ یہ سب کچھ بھلا دیجئے لیکن یہ کہ میں اس ملک کا ایک شہری ہوں اور میں ایک مقدمہ قتل کا سامنا کر رہا ہوں۔ حتیٰ کہ ایک عام شہری اور میں اپنے آپ کو ایسا ہی سمجھتا ہوں کہ بھی انصاف سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔“

مقدمے کی سماعت سننے والے ججوں کی نازک مزاجی اور حساسیت اور ان کے مفروضے ان کے نزدیک میری زندگی سے زیادہ اہمیت رکھتے تھے۔ اگر کسی مقدمہ قتل کی خفیہ اور بندہ کرے میں سماعت کی جاتی ہے تو پھر کسی مقدمے کی کھلی سماعت کرنے کی کوئی ضرورت نہیں رہ جاتی۔ پھر کسی کو شہادت قلم بند کرانے کی ضرورت رہتی ہے نہ کسی کے قلم اور فیصلے کی اگر اس عل کو جاری رکھا گیا تو پھر قانون اپنے وقار اور عظمت سے محروم ہو کر ظلم کا قانون بن جائے گا۔ اس کا مطلب یہ ہو گا کہ قتل کی قانون سازی کی جاری ہے۔

اس کے باوجود اس بند عدالت کی خفیہ سماعت میں بھی مجھے یہ اجازت نہ دی گئی میں اپنی صفائی پیش کر سکوں۔ کوٹ لکھنوت میں مجھے یہ زبانی اطلاع دی گئی کہ پروسکیوشن کے بعد عدالت کو خطاب کرنے کی میری درخواست مسترد کر دی گئی ہے۔ میں ایک پیش رو وکیل نہیں تھا۔ 9 جنوری 1978 سے وکلاء نے میرا دفاع پیش نہیں کیا تھا۔ اپنی طویل علالت اور عدم حاضری کی وجہ سے میں نے استغاثے کی شہادتیں نہیں سنی تھیں۔ تین ماہ تک جو کھلی سماعت ہوئی اس میں عدالت نے میری اہانت اور تحقیر کی۔ استغاثے کے کیس کو زبردست پبلٹی حاصل ہوئی۔ اس کے بعد استغاثے نے مقدمے کو خفیہ بنادیا۔ ہر چیز مکمل طور پر میرے خلاف کر دی گئی۔ لیکن ان تمام ہولناک دشواریوں کے باوجود جب میں نے بند اور خفیہ عدالت میں اپنی زندگی کے دفاع کے لئے خطاب کی درخواست دی تو مجھے اس کی اجازت نہ دی گئی کیونکہ میں چاہتا تھا کہ میں ایک مبتدی کی حیثیت سے جواب دینے سے پہلے استغاثے کو سنوں کسی طرح کے قانونی نوٹس، قانونی کتابوں اور قانونی رولنگ کے بغیر جواب دینا چاہتا تھا۔

یہ معقول درخواست، گھر درے اور موجود انصاف کے لئے یہ درخواست ٹھکرا دی گئی۔ غیر جانبدارانہ انصاف کسے کہتے ہیں؟ مقدمے کی سماعت کرنے والی عدالت، اپنا فیصلہ سنا دیتی ہے۔ جس میں موت کی سزا دی گئی ہے، اگر اس نے اس شخص کو جسے غیر قانونی طور پر بڑا ملایم قرار دیا ہو، اس کی صفائی ہی نہ سنی ہو تو اسے کس طرح غیر جانبدارانہ انصاف کہا جاسکتا ہے؟ اس حد تک جا کر مجھے مجرمانہ انصاف کا نشانہ بنایا گیا۔ دنیا میں اسے کہاں تک ناقابل برداشت اور اذیت ناک تصور کیا گیا ہے کہ ایک فرد جس پر قتل کا الزام ہو اسے ایک مبتدی کی طرح اس کی بے گناہی پر باوجود کسی تیار اور قانونی مشیر کے خطاب کرنے کی اجازت نہ دی گئی ہو۔ میری یہ درخواست کہ خفیہ سماعت میں ہی مجھے سنا جائے اس بنیاد پر ٹھکرا دی گئی کہ اس سے میں پبلٹی حاصل کر سکتا تھا۔

یہ غلط ہے کہ میں نے مقدمے کے سننے والے شیخ کے ساتھ تعاون کی کوشش نہیں کی۔ جبکہ میری زندگی سے کم کوئی چیز داؤں پر نہ لگی تھی۔ میں اتنی سوچہ بوجھ تو رکھتا ہوں کہ ان کے

لہٰذا اسے کو اس کی اہمیت اور حصے کے مطابق ریڈیو اور ٹی وی پر وقت الاٹ کیا جائے۔ اگر میں غلطی پر نہیں ہوں تو مجھے یاد ہے کہ سپریم کورٹ کے ایک جج ان دنوں لاہور ہائی کورٹ کے اس بیج میں شامل تھے۔ جس کے سامنے اس امتیازی پالیسی کے خلاف درخواست کی سماعت ہوئی تھی اور انہوں نے اس امتیازی پالیسی کے خلاف حکم صادر کیا تھا۔ میں نے اس وقت بھی اس پر کوئی شکایت نہیں کی تھی اور نہ ہی اب کر رہا ہوں۔ میں تو ایک اصول پر دلالت کر رہا ہوں اگر یہ مساوات کا ایک حصہ اور اصول ہے کہ سیاسی مخالفوں کو ووٹ حاصل کرنے کے لئے اپنا نقطہ نظر پبلک کے سامنے پیش کرنے کا حق دیا جائے تو پھر یہ بھی مساوات ہی کا جوہر ہے کہ ملک کی سب سے بڑی اور سب سے طاقتور سیاسی پارٹی کے قائد اور پاکستان کے سابق صدر اور وزیراعظم کے خلاف مقدمہ قتل کی سماعت کھلی عدالت میں ہو تاکہ وہ مناسب کوریج حاصل کر سکے۔

ووٹوں سے بھی کہیں زیادہ بڑی چیز داؤں پر لگی ہے۔ میری زندگی سے بھی بڑی چیز داؤں پر ہے۔ اس میں کوئی غلط فہمی نہ ہونی چاہیے کہ پاکستان کا مستقبل داؤں پر لگا ہوا ہے۔ جب میرے کونسل نے یہ شکایت کی کہ صفائی کے کیس کو یکسر اور مکمل طور پر ریڈیو اور ٹیلی ویژن سے بلیک آؤٹ کر دیا گیا ہے تو انہیں کسی بھی جھجھک کے بغیر ملادریغ یہ کہا گیا کہ ریڈیو اور ٹی وی پر اس کی پبلسٹی نہیں ہوگی۔ یوں اس معاملے کو اختتام تک پہنچا دیا گیا۔ خدا کے نام پر لوگوں کو صفائی کے کیس کے بارے میں ریڈیو اور ٹی وی کو اجازت نہ دی جائے کہ عوام کچھ بھی سن سکیں۔ لیکن مہربانی سے ارزاو ترم اسے پبلسٹی کا نام تو نہ دے۔ کیا یہ ہے کہ میں سزاؤں اور پھانسیوں کی تشہیر چاہتا ہوں۔ کیا میں پبلسٹی چاہتا ہوں میں صرف اور صرف انصاف چاہتا ہوں میں جو چاہتا ہوں وہ تو پاکستان کے عوام کے لئے ہے کہ وہ بھی یہ نتیجہ نکال سکیں کہ وہ رہنما جسے دوسروں نے گروہ اقتدار میں لائے اسے اپنا صدر اور وزیراعظم بنایا قاتل ہے یا اسے اس جرم میں پھنسا دیا گیا ہے۔

یہ تجویز بہت سادہ ہے۔ میں یہ تسلیم کرنے سے انکار کرتا ہوں کہ اسے سمجھنے میں کوئی وقت پیش آئی یا اس میں پوری صفائی اور وضاحت موجود نہیں اور اس میں کوئی ابہام ہے۔ یہ نام نہاد قریاس ایضاً جسے اس وقت زمین پر پھینکا گیا ہے اس وقت آیا ہے جب سزائے موت کے خلاف میری اپیل کی سماعت درمیان میں ہے۔ اسے دنیا بھر میں شہرت مل چکی ہے۔ اسے بڑی شدت کے ساتھ تفصیل سے ریڈیو اور ٹی وی پر نشر کیا گیا ہے۔ شراکیز اور جھوٹ پر مبنی ادارے شائع ہو چکے ہیں۔ غیر ملکی صحافیوں سے درخواست کی گئی ہے کہ وہ اس کی تشہیر کریں۔ پاکستانی سفیر دوسرے ملکوں کے ممتاز افراد کو استقبائے دے رہے ہیں تاکہ ان میں یہ دستاویز تقسیم کی جائے۔ عالمی پیمانے پر یہ ایک بہت بڑا تماشہ ہو رہا ہے گردار کشی پر

ساتھ تعاون کروں جو مجھے یہ بتانے والے ہوں گے کہ مجھے اس وقت تک پھانسی پر لٹکایا جائے گا جب تک میں مر نہیں جاتا۔ اصل میں ٹرانس لینٹج یہ چاہتا تھا کہ میں ان کے سامنے گڑگڑاؤں۔ سچی بات ہے کہ میں نے انہیں بتایا کہ میں ان کے سامنے جھکوں گا نہ رہنگوں گا۔ کیونکہ ایک مسلمان صرف اپنے خالق کے سامنے جھکتا ہے۔ لیکن بیج بالخصوص چیف جسٹس ہمیشہ رعوت اور تکبر سے میری تذلیل کرتا تھا۔ اور اس کے عین برعکس چیف جسٹس جرم کا اعتراف کرنے والے شریک ملزموں کے ساتھ نرمی اور شفقت سے پیش آتے تھے۔ وہ متنبہ ہو کر انہیں دیکھتے۔ میری قیمت پر وہ ان کے کھردرے مزاج سے لطف اندوز ہوتے۔ وہ ان کے ساتھ پدرانہ انداز میں تحمل کا سلوک کرتے جہاں وہ یہ محسوس کرتے کہ وہ انگریزی میں سوال کا مطلب نہیں سمجھ رہے تو سوال اردو یا پنجابی میں ترجمہ کر دیتے۔ دھمکیاں، غصہ اور آواز سے صرف میرے لئے مخصوص تھے مجھے ”شٹ اپ“ اٹھ کر کھڑے ہو جاؤ اور جب تک اس کے ہوش و حواس بحال نہیں ہوتے یہاں سے لے جاؤ۔ جیسے احکامات سے نوازا جاتا۔ ایسے حالات میں ٹکاون کی بات کرنا ایسے ہی ہے جیسے یہ کہا جائے ویوں جیسے تحمل کا مطالبہ کیا جائے۔

ایسا بھی نہیں ہے کہ مقدمے کی سماعت کرنے والی عدالت بنیادی اصولوں قواعد اور عوامل سے نااہل تھی۔ نہ ہی یہ کہا جاسکتا ہے کہ وہ پبلسٹی اور مقدمے کی کھلی سماعت کے فرق سے ناواقف تھی۔ بلکہ قریاس ایضاً کے مصنفین پوری طرح سے پبلسٹی کی اہمیت سے واقف ہیں۔ قریاس ایضاً کے صفحہ 145 پر میری حکومت کے خلاف ایک کالی کورجسٹر کیا گیا ہے۔ کہ ریڈیو اور ٹی وی پر پٹی لہن اسے کا وقت مخصوص کرنے میں امتیازی سلوک روا رکھا گیا تھا۔ اس میں بتایا گیا کہ جہاں 24 جنوری 1977 کو میری پریس کانفرنس کو ریڈیو اور ٹی وی نے بھرپور کوریج دی۔ وہاں پاکستان قومی محاذ یا کسی بھی دوسری مخالف پارٹی کو یہ سہولتیں فراہم نہ کی گئیں۔ ریڈیو اور ٹیلی ویژن نے بڑے اختصاص سے ان کے منشور کو صرف خبروں میں کوریج دی۔ اور جوں جوں انتخابی مہم زور پکڑتی گئی تو ان میں اس امتیازی برتاؤ میں بھی شدت پیدا ہو گئی۔ مسٹر بھٹو کی ہر انتخابی تقریر کو پوری تصویر اور آواز کے ساتھ پیش کیا گیا۔ حزب اختلاف کے کسی رہنما کو سمعی کوریج نہ دی گئی ان کی تقریروں کو بڑے اختصاص سے صرف خبروں میں سنایا گیا۔ بصری لحاظ سے انہیں چند اڑتے ہوئے لمحوں میں دکھایا گیا۔ لیکن جہوم کو دکھانے میں ٹیلی ویژن نے کیمرا ٹرک سے کام لیا پٹی پٹی کے جہوم کو بڑھا چڑھا کر اور حزب اختلاف کے جہوم کو کم سے کم تر کر کے دکھایا گیا۔

انتخابی مہم کے دوران پٹی لہن اسے نے اس سپینڈ امتیازی پالیسی کے خلاف ایک رٹ درخواست لاہور ہائی کورٹ میں دائر کی۔ میرا خیال ہے کہ لاہور ہائی کورٹ نے یہ حکم دیا تھا کہ پٹی

مشتعل یہ بلیو پرنٹ چار زبانوں میں جن میں عربی بھی شامل ہے، ترجمہ کیا گیا ہے۔

میں حیران ہوں کہ عربی زبان کیوں؟ انتخابات کے متعلق موضوع و مواد کا عرب ریاستوں سے کیا تعلق بنتا ہے؟ عرب ملکوں میں عظام حکومت یا تو بادشاہت ہے یا ایک پارٹی کی حکومت۔ لبنان میں پارلیمانی جمہوریت ہے۔ اس وقت اس بد قسمت ملک کے عوام کے لئے اپنا ملک متحد رکھنا نامکن ہو رہا ہے۔ اس وقت جب کہ ان کے سروں پر گولیاں اڑ رہی ہیں۔ میں نہیں سمجھتا فوج کے ذریعے حکومت کا جبری تختہ الٹنے کے اس نئے سے کوئی دلچسپی ہو سکتی ہے کہ کویت اور بحرین اپنی پارٹیوں کو معطل یا منسوخ کر چکے ہیں قرطاس ایضاً کا موضوع اور مواد عرب دنیا کی بادشاہتوں یا ایک پارٹی کی حکومتوں اور پاکستان کی فوجی حکومت کے مابین کسی بھی شراکت اور ساجھے کی چیز نہیں بنتا۔ اس کے ساتھ ان کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ یا اس کا یہ مطلب ہو سکتا ہے کہ ان ملکوں کے برادر فوجی افسروں کو لاکڑا جائے کہ وہ اچھے کھڑے ہوں اور عرب حکومتوں میں بھی فوجی حکومتوں کی لعنت پھیلانی جائے۔

فوجی بغاوت کے ذریعہ بارہ گھنٹوں کے اندر ان ملکوں کی جائز حکومتوں کا تختہ الٹنے کے لئے ایک قرطاس ایضاً ان ملکوں کے ان فوجی افسروں کے لئے مفید اور کارآمد ثابت ہو سکتا ہے۔ جو اپنی حکومتوں کا تختہ الٹنے کا ارمان دلوں میں لیے بیٹھے ہیں۔ اس قرطاس ایضاً کی عرب حکومتوں سے کیا نسبت بنتی ہے؟ اس میں کون سا پیغام ہے جو انہیں پہنچانا مقصود ہے؟ یہ کہ ذوالفقار علی بھٹو نے مبینہ طور پر پاکستان کے انتخابات میں دھاندلی کی اگر میں کوئی عرب بادشاہ یا عرب شیخ یا ایک عرب انقلابی قومی رہنما ہوتا، جہاں کا یہ نظام نہ ہوتا اور جہاں بالغ رائے دہی پر پارلیمانی انتخابات کا نظام ہی نہ ہوتا تو میں کہتا تو پھر کیا؟ وہ لوگ جو پاکستان میں فوجی بغاوت کے ذریعے حکومت کا تختہ الٹنا ایک بہترین کام سمجھتے ہیں وہ اس بغاوت اور فوجی جبری بغاوتوں کو دوسرے اور ہمسایہ ملکوں میں پھیلانے کی کوشش کریں اس کے علاوہ تو قرطاس ایضاً کے عربی ترجمے کے بارے میں کوئی وضاحتی منطق نہیں ملتی کہ فوج کے ذریعے حکومتوں کا تختہ الٹنے کا جواز فراہم کیا جائے۔

سبق جو سیکھا جاسکتا ہے

کچھ متفرق نکات بھی ایسے ہیں جن کا قرطاس ایضاً پر بات کرنے سے پہلے ذکر ضروری ہے۔ قرطاس ایضاً کے کئی حصوں میں اس بات پر بڑا اصرار کیا گیا ہے کہ میں نے انتخابات کے لئے تیار معینہ تاریخ سے بہت پہلے شروع کر دی تھی۔ اس سلسلے کی ایک مثال

سے اس بات کی وضاحت ہو سکتی ہے صفحہ ۵۴ پر۔۔۔ قبل از وقت پلاننگ کی سرخی کے تحت قرطاس ایضاً بیان کرتا ہے ”ایسی دستاویزی شہادت موجود ہے جو یہ ثابت کرتی ہے کہ اوپر جو عنوان لکھا ہے وہ درست ہے۔ اس کے سرے ۱۹۷۴ سے جاملتے ہیں، جس پر ہینرل پارٹی کی صاحب بصیرت اور ہوشیار قیادت کو در حقیقت خراج تحسین پیش کرنا پڑتا ہے۔ یقیناً وہ سیاست کو بہت سنجیدگی سے لیتے تھے اپنے سیاسی مقاصد کو حاصل کرنے کے لئے انہوں نے جائز اور اکثر ناجائز اور غیر قانونی ذرائع سے بہت ہی محنت کی اس سلسلے میں جو پہلا دھماکہ کیا گیا وہ پاکستان ہینرل پارٹی سندھ کے صدر سید قائم علی شاہ نے اس طرح کیا کہ انتخابی حلقوں کی حد بندیوں میں اپنی مرضی اور سہولت کے مطابق تبدیلیاں کرنے لگے۔ ۱۲ جون ۱۹۷۴ کو انہوں نے ایک خط (ضمیمہ ۲۵) وزیر اعظم چتر میں پاکستان ہینرل پارٹی کو لکھا اور یہ نشان دہی کی کہ انتخابی حلقہ بندیوں کی نئی حد بندیوں کے تعین کے لئے بل پاس ہو گیا ہے۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ اگر ”وہ بل جو انتخابی حلقوں کی نئی حد بندیوں کے تعین کے لئے تھا، پاس ہو گیا تھا“ تو اس کے بعد کچھ ہوا وہ مینڈیٹری تھا۔ اس میں قبل از وقت پلاننگ کا تو کوئی اشارہ نہیں ملتا۔ دوسری بات یہ کہ انتخابات کے لئے ایک طے شدہ وقت پارلیمانی سسٹم کا ایجنڈی تھیمس ہوتا ہے۔ صرف صدارتی انتخابات میں ہی صدر کے عہدے کی معیاد کے تحت پہلے سے وقت کا تعین ہو چکا ہوتا ہے۔ جبکہ پارلیمانی نظام میں یہ واضح فرق موجود ہے اور اس میں پابندی اس امر کی ہوتی ہے کہ انتخابات کے لئے جو وقت مقرر ہے اس کے بعد انتخابات نہ ہوں، اس دوران میں ایک سے زیادہ بار انتخابات منعقد کئے جاسکتے ہیں۔

پارلیمانی نظام کا ایک فائدہ یا نقصان یہ ہوتا ہے کہ کسی وقت بھی انتخابات کرائے جاسکتے ہیں۔ حکومت، مخالف جماعتوں کو حیرت میں ڈال کر، وقت سے پہلے پارلیمینٹ ٹوڑ کر انتخابات کروا سکتی ہے۔ یہ استحقاق پارلیمانی نظام کا ایک حصہ ہوتا ہے۔ اس کے برعکس صدارتی نظام کا فائدہ یا نقصان اس میں ہوتا ہے کہ صدر کے عہدے کی معیاد کے مطابق آئین ضمانت دیتا ہے کہ تعین کئے ہوئے وقت پر ہی انتخابات ہوں گے۔ جبکہ پارلیمانی نظام میں مدت کے خاتمے کے اندر اندر تین یا چار بار انتخابات ہو سکتے ہیں۔ مارچ ۱۹۷۷ کے انتخابات ایک سال پہلے منعقد ہوئے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلامی سربراہی کانفرنس کے بعد میں نے سنجیدگی سے عام انتخابات کے بارے میں سوچنا شروع کر دیا تھا۔ میں تمام اسمبلیاں ختم کر کے، اسلامی سربراہی کانفرنس کے بعد انتخابات کرائے کے بارے میں سنجیدہ تھا۔ اس حوالے سے میں بلوچستان میں سیاسی صورت حال کی پیچیدگی کے بارے میں بھی کوئی قدم اٹھانے کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ لیکن ”عقلمندی پر مبنی اجتماعی مندر، رائج اور غالب رہا۔ پارلیمانی نظام کے

جب مسلح افواج کلینیک ایک فوجی ٹولہ اپنے مفادات کے لئے استعمال کر رہا ہو تو ایسے وقت میں خانہ جنگی کا تصور ہی محال ہے۔ خانہ جنگی کے لئے حکومت معروضی حالات کے مطابق، حکومت تشدد اور خونریزی کرنے والے ٹولوں کو منظم کرتی ہے۔ لیکن ایسا بھی اپوزیشن کر سکتی ہے اور یہ اپوزیشن نے ۱۹۷۷ء میں کیا،

جب کسی خانہ جنگی کے لئے معروضی حالات پختہ ہو جاتے ہیں تو پھر کوئی فوجی بغاوت بھی واقعہ کو روک نہیں سکتی۔ خانہ جنگی کے لئے حالات کو پختہ کرنے کا تیز ترین طریقہ فوجی حکومت ہے۔ معروضی حقیقت کا اظہار کرتے ہوئے میں یہ کہوں گا کہ آج پاکستان، ۱۹۷۷ء کے موسم بہار کے بدترین ایام کے مقابلے میں خانہ جنگی کے کہیں زیادہ قریب ہے۔ میرے ایک خصوصی معاون کے جنگجو بیانات کو سامنے رکھ کر مگر مجھے کے آئسوہانے والی ایک درخواست سپریم کورٹ میں پیش کی گئی۔ جس میں کہا گیا تھا کہ خانہ جنگی ہونے ہی والی تھی اگر چیف آف آرمی سٹاف صحیح سمت تیز اور فوری قدم نہ اٹھاتا۔ میرے اسی خصوصی معاون نے سپریم کورٹ میں میری اس اپیل کے ساتھ ایک بیان حلفی داخل کروایا۔ جس میں حلفاً یہ بیان کیا کہ چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر نے اسے میرے خلاف گواہی دینے کے لئے غلط طور پر استعمال کرنے کی کوشش کی۔ وہ جنرل جس نے فوجی بغاوت سے حکومت کا تختہ الٹا اور چیف آف آرمی سٹاف کے منہ میں اقتدار کا لالی پاپ دیا اس نے خانہ جنگی برپا کرنے والے ۱۹۷۸ء کو تین گھنٹے سے زیادہ عرصے تک ملاقات کی۔

قرطاس ایض کے نسخہ ۳۹۸ پر بیان کیا گیا ہے کہ میری حکومت اور پارٹی نے خانہ جنگی کی تیاری کے لئے میسرز ڈوسل اینڈ کمپنی کراچی سے ہتھیار خریدے۔ میسرز ڈوسل اینڈ کمپنی کے مالک کو میری حکومت نے کئی مواقع پر جیل میں ڈالا تھا۔ اس حقیقت کی تصدیق نیپ پر سپریم کورٹ کے ریفرنس یا سرکاری ریکارڈ سے کی جاسکتی ہے۔ اس فرم اور اس کے مالک کے خلاف سخت ترمیم کا ردائیاں کرنے کے بعد یہ ممکن ہی نہیں ہو سکتا تھا کہ ہم پورے پاکستان میں سے صرف اس کا انتخاب کرتے اور اس سے وہ ناجائز اور غیر قانونی طور پر ہتھیار خریدتے جن کی ضرورت متوقع خانہ جنگی میں پڑنے والی تھی۔ ان دستاویزات کے تضادات اور جھوٹ لرزاں اور بے بنیاد ہیں۔

تقسیم جب ایسے نقطے پر پہنچتی ہے کہ جہاں سے واپسی ممکن نہ ہو تو اس کی مثال سپین سے دی جاسکتی ہے۔ چودہ مہینوں کے سپین اس نقطے تک پہنچ چکا ہے۔ سپین کے فوجی ٹولے کو بہت کچھ یاد رکھنا چاہئے، بطور خاص وہ واقعات جو جنوبی بحیرہ روم میں رونما ہوئے ہیں یونان سماجی اور اقتصادی لحاظ سے پاکستان سے ٹھیک یا خیر ہے۔ یونان میں فی کس آمدنی بارہ سو ڈالر

بارے میں قرطاس ایض نے جس اصول کے تحت یہ کہا ہے کہ میں انتخابات کی تیاری انتخابات کی تاریخ سے بہت پہلے کرنے لگا تھا، اس سے قرطاس ایض کی انتہائی پست جہالت کا ثبوت ملتا ہے کہ اسے پارلیمانی جمہوریت کے بارے میں کچھ بھی معلوم نہیں۔ اس طرح کی بے سروپا باتیں کرنے سے قرطاس ایض کی جمہوریت شناسی کا پھول گل جاتا ہے۔ انہیں کچھ معلوم نہیں کہ پارلیمانی جمہوریت کیا ہوتی ہے۔ اس کا یہ مطلب بھی نکلتا ہے کہ میں طے شدہ مدت کے ایک سال بعد انتخابات کروانا تو مجھ پر یہ الزام نہ لگایا جاتا کہ میں مزید ایک سال اقتدار میں رہا ہوں۔ بلکہ یہ کہا جاتا کہ میں اس فاضل برس میں انتخابات کی تیاری کرتا رہا تھا۔

یہ انتہائی تاریک اور غلط ترین الزام ہے کہ انتخابات کے بعد میری حکومت خانہ جنگی کرانے کی تیاری کر رہی تھی۔ یہ انتہائی شریکستانہ اقدام حکومت کا فوجی بغاوت سے جبری تختہ الٹنے کے بعد لگایا گیا تھا۔ منظم نصرت بھٹو نے سپریم کورٹ میں آئینی درخواست دی تو سپریم کورٹ میں بھی یہ بات کہی گئی۔ یہی جھوٹا الزام پھر قرطاس ایض میں دہرایا گیا ہے۔ میں نے اپنے بیان حلفی میں یہ ثابت کیا تھا کہ خانہ جنگی کی ضرب بعد میں سوچے سمجھے منصوبے کے مطابق لگائی گئی۔ انتہائی تختہ جہالت اور لاعلمی کے ساتھ انہوں نے کہا کہ تضادم اور تقطیع کا عمل ہو چکا تھا۔ وہ یہ نہیں جانتے کہ اجتماع ضدین کا عمل تیز اور نمایاں ہوتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ عوام کی فتح قریب آچکی ہے۔ اور پھر یہی وہ وقت ہوتا ہے جب اپنے ذاتی مفادات کو زندہ رکھنے کے لئے فوجی بغاوت کے انجن کو عوام کے خلاف استعمال کیا جاتا ہے۔ وہ بھیرے کا آواز لگا کر حملہ کرنے کے لئے وقت حاصل کرتے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ پی این اے نے بھیریا آیا کی پیچ ماری اور جارحیت کا ارتکاب کرنے لگی۔ پی این اے نے بھاری مقدار میں اسلحہ اور ہتھیار خریدے۔ چھتوں کے اوپر اذانیں دے کر جہاد کرو، پی این اے نے ہر طرح کا محاصرہ کیا۔ ہرنال کے لئے ہر بار پی این اے نے کہا، ہر طرح کے مفادمتنی تفسیوں کو پی این اے نے مسترد کیا۔ حتیٰ کہ یہ پی این اے ہی تھی جو متفقہ طور پر پوری جزیات سمیت منظور شدہ قصف سے مکر گئی۔

میری حکومت نے خانہ جنگی کے لئے تنظیم نہیں کی۔ مزید برآں، جیسا کہ میں سپریم کورٹ میں منظم نصرت بھٹو کی درخواست میں اپنے بیان حلفی میں واضح کر چکا ہوں، خانہ جنگی کے اپنے عناصر ترکیبی اور سابقات ہوتے ہیں۔ حکومت کی طرف سے محض سیٹی بجا کر خانہ جنگی نہیں کرائی جاسکتی۔ اجتماعی شعور اور ضمیر پہلے ترقی کی ایک خاص تسلیم شدہ سطح تک پہنچتا ہے۔ افواج دو حصوں میں بٹ جاتی ہیں۔ ایک حصہ استحصال کرنے والوں کے ساتھ ہوتا ہے اور دوسرا ان کے ساتھ جن کا استحصال ہو رہا ہو۔ پھر کہیں جا کر خانہ جنگی وقوع پذیر ہوتی ہے۔

ہے، بیکہ پاکستان میں فی کس آمدنی ۱۸۴ ڈالر ہے۔ یونان یورپی تہذیب کی ماں ہے۔ وہاں کے عوام کا سیاسی شعور ہمارے مقابلے میں بہت بلند ہے۔ اس کے باوجود یونان میں سیاسی سچویشن کئی برسوں سے غیر مستحکم ہے ۱۹۶۵ء میں یہاں کے فوجی کرنلوں نے بغاوت کے ذریعے حکومت پر صورت حال سے فائدہ اٹھاتے ہوئے قبضہ کر لیا۔ اس ”عزم“ کے ساتھ کہ وہ باہمی تصادم کے عمل کو روک کر سیاسی استحکام پیدا کر سکیں گے۔ سات برسوں میں ان کرنلوں نے یونان کا وہ خطرہ کر دیا کہ نہ صرف اپنے ملک بلکہ قبرص کو بھی تباہی کے کنارے پر لے آئے ہیں۔ ترکی کے ساتھ وہ جنگ کرنے پر تیلے ہوئے ہیں، یونانی قوم کو بالآخر قبرص میں مقیم اپنے رہنما کانٹنشینین کا ملکیاس کو واپس بلوانا پڑا کہ وہ یونان کو متحد و متحدہ بنا سکیں۔

ارجنٹائن میں برسوں سے سیاست کے ساتھ فٹ بال کھیلنے ہوئے پولر اکریشن کے مسئلہ کو حل کئے بغیر، فوجی حکمران ٹولے کے ایک رکن جنرل ہارنڈ کاٹی نے حال ہی میں کہا ہے ”جو مسائل آگے درپیش ہیں انہیں فوجی حکمرانوں کے ساتھ محض چند شہری معاونوں کے ذریعے حل نہیں کیا جاسکتا“ یہ الفاظ بیونس آئرس میں کہے گئے تھے۔ لیکن اس سے اسلام آباد کے بارے میں بھی گھنٹی بجنے لگی۔ جنرل ہارنڈ کاٹی نے اجتماعی سول شراکت پر مبنی ایک ملکی حکومت پر بھی زور دیا۔

اٹلی جو تہذیب کا ایک اور اہم مرکز ہے، گہرے اور سنجیدہ اقتصادی اور سیاسی مسائل کے ٹکڑے میں بکڑا ہوا ہے۔ وہاں پولر اکریشن ایک عجیب خطرناک سطح تک جا چکی ہے۔ یہ قبول کرتے ہوئے کہ موجودہ نظام ناکام ہو چکا ہے اور بحران عام طرز اندمال کی گرفت سے ماورا ہو چکا ہے ریڈ بریگیڈ اطالوی ریاست کے موجودہ ڈھانچے کو ملیامیت کرنے کا عزم کر چکا ہے۔ اور اس کی جگہ ایک نیا غیر طبقاتی ڈھانچہ قائم کرنا چاہتا ہے۔ وہ اس نتیجے پر پہنچ چکے ہیں کہ موجودہ ریاستی ڈھانچے کو توڑنے کا یقینی اور فوری طریقہ یہ ہے کہ فوج کو ترغیب دی جائے کہ وہ اقتدار پر قبضہ کر لے۔ ان کا عقیدہ ہے کہ جو بھی فوج ریاست پر قبضہ کرے گی جو آئین پر استوار ہے اور اس کے تحت ادارے کام کرتے ہیں، وہ دھڑام سے گر جائیں گے، مزید براں ان کا خیال ہے کہ ایک بار جب حکومت کے یہ ستون گر سکیں تو یہ استحالی ریاست بھی ان ستونوں کے ساتھ دھیر ہو جائے گی۔ ریڈ بریگیڈ اقتدار پر فوج کے قبضے کو اٹلی کے لئے مسئلے کا حل گردانتی ہے۔ اسی قسم کا حل، ہم پاکستان میں دیکھ رہے ہیں۔

اٹلی کے فوجی زعماء اس لڑاں صورت حال سے آگاہ ہیں، یہ فوجی زعماء بہت زیادہ تعلیم یافتہ اور اطالوی قوم کی تاریخ سے اچھی طرح آشنا ہیں، اٹلی کے یہ فوجی زعماء فراموش نہیں کر سکتے کہ اطالوی قوم کو متحد کرنے کی آخری فوجی فتح کے بعد، گیری بالڈی اپنی بیوی آنا کے ساتھ

پہاڑوں میں غائب ہو گیا تھا تاکہ نئی قوم کے استحکام کا فریضہ پابوڈمنٹ کے تجربہ کار اور ماہر سیاست دان کوئٹ کا مینی ڈی کاویہ انجام دے سکے۔ ایک سو سال پہلے اٹلی کے اتحاد نو کا فریضہ۔ ایک سیاسی فریضہ تھا تو اٹلی کی مسلح افواج ۱۹۷۸ء میں اٹلی کی سیاست میں فوجی مداخلت کر کے تیزی سے ریڈ بریگیڈ کی دعوت قبول نہیں کر رہے ہیں۔

روسی انقلاب کے بعد، لبین کو بڑی جفاکشی سے ایسی کوششیں کرنی پڑیں کہ جن سے پارٹی کی سیاسی برتری فوج پر مستحکم ہو سکے، مثالیں کو بھی اس ضرورت کا بھرپور احساس تھا۔ لبین اور مثالین دونوں بڑی شدت سے یہ سمجھتے تھے کہ اگر پارٹی کی برتری پر فوج فائق رہی تو روسی ریاست شدید ترین خطروں میں گھری رہے گی۔ یا دوسرے لفظوں میں فوج پارٹی کے کنٹرول اور ریاست کی سمت پر غالب آجائیگی۔ روسی انقلاب سے لے کر اب تک، روسی ریاست کا یہ نمایاں پہلو رہا ہے کہ پارٹی فوج سے برتر ہے، اور یہی اصول مستقبل میں بھی برقرار رہے گا۔ ایک ترقی اور طاقت کا ذریعہ ہے۔ دوسرا تصادم اور ابتری کا طریقہ ہے۔ ۱۹۵۷ء کے اواخر میں، دوسری جنگ عظیم کے عظیم ترین برنیوں میں سے ایک اور برلن کے قلع اور سوویت یونین کے وزیر دفاع مارشل زوخوف کو اس لیے عہدے سے نکال دیا گیا کہ وہ یونان پارٹ، رجحانات کا مظاہرہ کر رہے تھے۔

انقلاب کی صبح سے اب تک، اسی اصول کو عوامی جمہوریہ چین نے برقرار اور اپنائے رکھا ہے۔ یہ چین اور اس کے عوام کے لئے بہتر اور مفید ہے۔ اگرچہ چین میں فوجی پارٹی اگر سیاسی قیادت پر کنٹرول حاصل کر لیتی تو چین پھر سے اپنے جنگی آقاؤں کے دور میں واپس چلا جاتا، چین کے ۸۰۰ ملین عوام کو مارشل لا آرڈر نمبر ۱۲ کے تحت متحد نہیں رکھا جاسکتا۔ چین کے ۸۰۰ ملین عوام اس لئے ترقی کرتے ہوئے طاقتور نہیں بن رہے کہ انہیں سرعام کوڑے مارے جاتے ہیں، چین اور چین کے عوام بن اٹلی اور باوقار بلندیوں تک پہنچے ہیں۔ اس کی وجہ چینی قیادت اور سیاسی تحریک ہے، یہ سیاسی عنصر ہی ہے جو ۸۰۰ ملین چینیوں کو متحد رہنے اور اور رضا کارانہ قربانیوں کے لئے وجدانی تحریک بخشتا ہے۔ جب چین کے وزیر دفاع مارشل لین پیافو نے اپنے آپریشن فیر پلے جس کا نام ”آؤٹ لائن آف پروجیکٹ ۱۷۵“ کا سازشی منصوبہ تیار کیا چیئر مین ماؤزے تنگ کو قتل کر کے چین پر فوجی برتری قائم کر دے تو وزیر اعظم چولین لائی نے براہ راست افواج کی کمان سنبھال لی اور مارشل لین پیافو کی سازش کو کھلنے میں کلیدی کردار ادا کیا، وزیر اعظم چولین لائی کی بروقت کارروائی جو سیاسی حقوق اور سیاسی قیادت برقرار رکھنے اور پارٹی کی برتری کے لئے تھی اس نے چین کو تباہی سے بچالیا،

ہمارے جرنیلوں کو ترکی کی تاریخ سے پوری طرح ناواقف ہونے کے باوجود ترکی کی مثال

ترک کر کے اسے آپ کو مکمل طور پر سیاست کے لئے وقف کرنے کے لئے تیار کیا، اتاترک نے اسے وزیر اعظم اور ہینرلیزری پیلمن پارٹی کا قائد بنایا، انہوں نے اکانومسٹ اور مینجر جلال بیارکی ہمت افغانی کی کہ وہ ڈیموکریٹ پارٹی کے صدر بنیں۔

تاریخی اسباب و وجوہات اور اپنی عظیم اور قابل فخر خدمات کے حوالے سے، فوجی روایت ترکی کے سماجی سیاسی تالے بانے میں مضبوطی اور گہرائی سے کھل مل گئیں۔ اگر اتاترک زیادہ عرصہ زندہ رہتے، یا ان کی صحت بہتر ہوتی تو وہ فوجی اثر و رسوخ اور اثرات کو ترکی کی سیاست سے باہر نکال پھینکتے۔

جب ان کا انتقال ہوا تو اتاترک اپنے پیچھے ایسی جمہوریت چھوڑ گئے جو ابھی عطفوان شباب میں تھی۔ جمہوریت کے نوجوان پودے نے کئی نشیب و فراز دیئے، کئی دہائیوں کی حکمرانی کے بعد ری پیلمن پارٹی کو ۱۹۵۰ میں ڈیموکریٹ پارٹی نے شکست دیدی، جلال بیار، ترکی کے صدر اور عدنان میندریس وزیر اعظم بنے، تب جنرلوں نے ۱۹۶۰ میں بغاوت کے ذریعے وار کیا۔ ان کا دعوی تھا کہ ترکی خانہ جنگی کے دہانے پر پہنچ چکا تھا اور اسے روکنے کے لئے انہوں نے مداخلت کی ہے، پاسیدہ نامی جزیرے میں ڈیموکریٹ پارٹی کے لیڈروں کو نظر بند کر دیا گیا۔ اس کے بعد رسوائی زمانہ پاسیدہ مقدمے کی کارروائی شروع ہوئی، وزیر اعظم عدنان میندریس، وزیر خارجہ زور کو اور وزیر مالیات کریمکان کو سزائے موت دیدی گئی۔

اس افسوسناک فیصلے کے اعلان کے فوراً بعد صدر ایوب نے مجھے اپنا خصوصی ایلی ناکر اشقرہ بھیجا کہ میں فوجی حکمران ٹوٹے کو قائل کروں کہ وہ اس فیصلے پر عمل نہ کریں۔ میں صدر جنرل گرسل جے انقرہ میں ملا، وزیر خارجہ سلیم ساپر موجود تھے اور ترجمانی کر رہے تھے۔ یہ گفتگو بہت اچھی رہی، جنرل گرسل نے مجھے بتایا کہ ان سزاؤں پر عمل کرنے سے ترکی کے مسائل حل ہو جائیں گے۔ اصرار سے، لیکن اب کے ساتھ میں نے اپنی آواز اٹھا کر انہیں بتایا ”مسٹر پریزیڈنٹ سر، ان سزاؤں کے ساتھ ترکی کے مسائل شروع ہو جائیں گے“ جب میں ترکی کے صدر کے دفتر سے نکل چکا تو وزیر خارجہ جو میرے ساتھ تھے انہوں نے کہا ”آپ پر اللہ کی برکت ہو“ آج ترکی کو جس تکلیف وہ اور شدید پورلرائزیشن کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے اس کی جڑیں ان سزاؤں میں ہیں۔ جو غلط مشوروں کا نتیجہ تھیں۔

ترکی کی مسلح افواج نے دیکھ لیا ہے کہ پولرائزیشن کا ظاہر ہونا ایک سیاسی مظہر ہے۔ کسی سینیٹیمسز کا بننا اور توازن۔ سیاسی ارتقاء کا ایک پہلو ہوتا ہے، کسی طرح کی بھی براہ راست یا استفادہ کرنے والی مداخلت، جو سیاست سے نہیں بلکہ باہر سے آئے گی، صورت حال کو مزید ابتر کر دے گی۔ ہر ملک کی سیاسی لڑائی اور بے چینی کا اپنا ایک تجربہ رکھتا ہے برطانیہ میں

دینے کا بڑا شوق ہے، قسطنطنیہ کی فتح سے لے کر چند مستثنیات کے علاوہ، ترکی کی مسلح افواج کبھی ناکام ہوئی ہیں نہ انہیں شکست ہوئی ہے، برطانوی ایسٹرن سے پہلے، ترکی کی مسلح افواج اور عسکری رہنماؤں نے دنیا میں سب سے بڑی ایسٹرن قائم کی، سلجوقیوں کے دور سے لے کر عثمانیوں تک، فوجی فتوحات کی صدیوں پر مشتمل تاریخ ہے، ایک فوجی فتح دوسری فوجی فتح کا سبب بنتی رہی، بلاشبہ اس میں مستثنیات بھی تھیں، لیکن ان میں سے کسی بھی شکست کی وجہ سے ترکی کی مسلح افواج یا اس کی عسکری قیادت کی بے عملی نہیں ہوئی۔ بعض لڑائیوں میں پوری فوج کا صفایا ہو گیا اور انہوں نے اپنے پیچھے ایک بھی جنگی قیدی نہ چھوڑا۔

جنرل مصطفی کووی آنا کے دروازوں پر جو شکست ہوئی وہ فوجی شکست نہیں تھی۔ گینی پولی کی لڑائی میں ترکی کی مسلح افواج نے ایسی بہادری کا مظاہرہ کیا کہ نتیجے میں کچھ بھی نہ رہا، پہلی جنگ عظیم میں برطانیہ کو جوتباہ کن شکست دزدہ واپس پر ہوئی اسے چرچل مرستے دم تک فراموش نہ کر سکا، مغربی طاقتوں کی ڈپلومیٹک سازشوں کے نتیجے میں ترکی یورپ کا درہمچار بن گیا۔ کمزور اور انحطاط پذیر سلطانوں نے غیر ملکوں کے ساتھ مراعات اور اطاعت کے جو معاہدے کیے ان کی وجہ سے جب الوطن طاقتوں میں نفرت کی لہر ابھری جس نے یلگ ترکی تحریک کو جنم دیا، بنیادی طور پر یہ تحریک سیاسی اصلاحات کی تحریک تھی۔ اور ترکی کی تاریخ اور سیاست کی روایات اور کردار سے پھوٹی تھی۔

سیاسی اور عسکری شخصیتیں اور ان کے مقاصد غیر ممیز اور اٹوٹ تھے۔ یلگ ترکس سپاہیوں اور سیاست دانوں کا مرکب تھے۔ مصطفی کمال پاشا، انور پاشا، عصمت پاشا، رؤف پاشا اور طلعت پاشا جیسے لوگ پانچ صدیوں سے زائد عرصے سے سپاہی اور سیاست دان چلے آ رہے تھے۔ کیونکہ ترکی ہمیشہ برسرِ پیکار رہتا تھا۔ جرمنی کا حلیف ہونے کے ناطے ترکی نے جرمنی کے ساتھ پہلی جنگ عظیم میں شکست کھائی۔ لیکن مصطفی کمال پاشا کی قوت آفرین قیادت نے ترکی کی شکست کو فتح میں تبدیل کر دیا۔ اپنی شجاعانہ قیادت میں اتاترک نے شکست خوردہ اور پارہ پارہ ترک قوم کو جرات دلا کر یونانیوں کو زبردست شکستیں دیں، جس کی فرانس اور برطانیہ مدد کر رہے تھے۔ ترکی کی سرزمین سے غیر ملکوں کو ہٹانے کے بعد، عسکری قوم کے عظیم ترین ہیرو نے اپنی فوجی وردی اتار دی۔ اتاترک نے ترکی کو ایک پارلیمنٹ اور ایک دستور دیا، اس نے ترکی کو جدید بنایا، عورتوں کو آزادی دی، اتاترک نے ایک پارٹی کی حکومت بنائی اور ان ابتدائی ایام میں اس نے ترکی کے لئے مخلوط معاشیات کا حکم دیا۔

کچھ وقت گزرنے کے بعد اپنے ملک میں جمہوریت کو طاقتور بنانے کے لئے ایوزیشن بنانے کی حوصلہ افزائی کی، عصمت پاشا جو انوکھی لڑائی کے ہیرو تھے، انہیں اپنا فوجی کیرئیر

ولمان کی صورت حال مسلسل بہتر ہو رہی ہے۔ اگرچہ پی لین اس کے، پاس ابھی اتنی معقول صلاحیت اور استعداد ہے کہ وہ امن و امان کا ایک نیا بحران، مذاکرات ناکام ہونے کی صورت میں پیدا کر سکتا ہے، وقت کا فاصلہ تیزی سے ان کی اس استعداد اور صلاحیت کو کم کر دے گا۔ اسلئے جس حد تک ممکن ہو، زیادہ سے زیادہ وقت مذاکرات پر لگایا جائے۔ مستقبل قریب میں دوبارہ انتخابات کرانا، ہر نقطہ نظر سے تباہ کن ثابت ہو گا۔

”ہر نقطہ نظر“ میں قومی نقطہ نظر، کسی بھی دوسرے نقطہ نظر سے زیادہ شامل ہے، اندازاً ۴ جولائی کی رات کے ایک بجکر بیس منٹ پر ۵ جولائی ۱۹۷۷ کی صبح۔ کھانے کے بعد، جب سازشی اپنا وار کر چکے تھے۔ مسٹر حفیظ پیرزادہ نے مجھے کہا ”مبارک ہو، سر، بحران ختم ہو گیا ہے“ میں نے ان سے پوچھا کہ وہ یہ بات کیسے کہہ رہے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ ایوزیشن کی بھاپ نکل چکی ہے۔ میں نے قبضہ لگایا اور مسٹر ممتاز علی بھٹو سے کہا کہ وہ پیرزادہ کی اس اذیت ناک رجائیت کو کچھ صاف کریں۔ اس کا جواب دیتے ہوئے انہوں نے کہا کہ ایسا کرنے کے لئے پیرزادہ کو اس وقت سکھر بیراج لے جانا ہو گا جب وہاں اونچا سیلاب آیا ہو۔ اور ہم تینوں ہنسے لگے۔ تیس گھنٹوں کے اندر ہم نے ایک دوسرا قبضہ سنا۔ وقت آنے پر، یہ بتائے گا کہ آخری قبضہ کون لگائے گا؟

ٹریڈ یونین حکومت سے برتر تھی تصور کیا جا رہا ہے کہ اس فوج نے ان سے ٹھننے سے کئے گئے کبھی اقتدار پر قبضہ نہیں کیا، ۱۹۳۱ میں جب برطانیہ کام ہڑتال کی وجہ سے مغلوب ہو کر روکھا تھا تب بھی مسلح افواج نے اقتدار پر قبضہ نہیں کیا۔ ۱۹۳۰ اور ۱۹۳۲ کی عظیم ڈیمویشن کے نتیجے میں امریکی حکومت تنقیر ساگر چکی تھی۔ لیکن امریکی افواج نے سیاسی اقتدار پر قبضہ نہیں کیا۔ اگر پاکستان میں فوجی بغاوت کے ذریعے اقتدار پر قبضہ کرنے کی مثال کو فوجی مداخلت کا جواز بنا لیا جائے تو پھر پوری دنیا میں فوج اقتدار پر قبضہ کر لے گی۔ مجھے قطعی طور پر یہ یقین ہے کہ اگر اٹالوی فوج کا چیف آف آرمی سٹاف روم ٹی وی ویشن پر ۵ جولائی ۱۹۷۷ کو نمودار ہو کر محمد نامہ جید سے پوچھا کہ قبایسات پڑھنے کے بعد، اٹلی کے عوام کو یہ بتانا کہ وہ مداخلت کرنے پر مجبور ہو گیا تو میں معروضی سچائی کے ساتھ کہوں گا کہ اس کے الفاظ میں زیادہ سچائی اور وزن ہو گا۔ لیکن ایسا نہ ہوا ہے اور یہ سچائی ہو گا کیونکہ اس طرح سے اٹلی اور اس کا اتحاد تباہ ہو جائے گا۔

مسلح افواج کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ بحران کو شہ دے کر، حوصلہ افزائی کریں کہ اس طرح اقتدار پر قبضہ کر لیں، جہاں کہیں بھی ایسا ہوا ہے بحران بدتر اور شدید ہوا اور حل نہیں ہو سکا۔ یہ دوبارہ ظاہر ہو کر بڑی بدی بن جاتا ہے۔ اگر یہ سچ ہے کہ چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر نے ۱۱ دسمبر ۱۹۷۸ کو راولپنڈی میں پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے کہا ہے کہ سیاسی مسائل سیاسی ذرائع سے ہی حل ہوتے ہیں تو اسے اس میں ان الفاظ کا بھی اضافہ کرنا چاہئے تھا ”سیاسیات کے ذریعے نہیں بلکہ سیاست دانوں کے ذریعے“ پہلی جنگ عظیم کے زمانے میں فرانس کے وزیر اعظم کلیمینسو نے ایک متجربہ بات کی تھی۔ یہ ایک ایسی رائے ہے جسے پاکستان کے جرنیلوں کو بھی اچھی طرح یاد رکھنا چاہیے۔ کلیمینسو نے کہا تھا، ”جنگ ایک منجیدہ کام ہے جو فوج کے لئے نئے پھوڑ دینا چاہئے“ یہ متجربہ رائے یقیناً اس وقت زیادہ مستند ہے جب امن کا دور ہو، اس سارے مسئلے کی سچائی یہ ہے کہ، تمام تر داخلی اور بیرونی سازشوں اور منصوبوں کے باوجود، اس نتیجے سے مفر نہیں ہے کہ سخت ترین آزمائش کا دن گزرنے کے بعد، میں نے صورت حال پر قابو پایا تھا، حتیٰ کہ اس حقیقت کو اب ایوزیشن بھی تسلیم کرنے پر مجبور ہو گئی ہے۔ حفاظتی تحویل سے رہائی پانے کے بعد، پی لین اس کے رہنما نواز زادہ نصر اللہ خان نے تسلیم کیا کہ ۴ جولائی ۱۹۷۷ کو ساڑھے دس بجے ایک معاہدہ طے پایا تھا۔ میں نے اپنے تمام اعتراضات واپس لے لئے تھے۔ اس معاہدے پر آنے والے تابع تقہیر دن کو دستخط ہوئے تھے۔

قرطاس امتیض صفحہ ۳۹۱ پر راولپنڈی کے نوٹ مورخہ ۲۹ مئی ۱۹۷۷ کا حوالہ دیتا ہے ”امن

(۱۳)

وقت ختم ہو چکا ہے

اس خاص موقع پر اس قسط میں ایضاً اور اس کے بعد آنے والے قسط میں ایضاً کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ ماحول کو اس حد تک بہبود دیا جائے کہ اس کی وجہ سے لکڑی لگی دیواروں میں بھی چھید کر بدبو محسوس نہ ہو۔ یہ کامل ترین نمونے کا حسد و عناد ہے۔

اس کا مقصد یہ ہے کہ ہر شخص خواہ ایک سے بے بس و عاجز ترین کلرک ہے یا طاقتور عدالت، اس کی رائے کو اس طرح سیر سے خلاف بدلا جائے کہ وہ محض ایک رائے پر اتفاق کر دے۔ مقصد صرف مجھے رسوا کرنا ہے۔ اس مقصد اور توجہ کا اندازہ لگاتے ہوئے، اسی کے اغراض و مقاصد کے بارے میں محتاط انداز میں یہ کہا جاسکتا ہے ایسی بے پردہ اور قابلِ شرمین کو شمش کسی بھی لیڈر کو ہراساں کرنے کے لئے نہیں کی جاسکتی۔

میرے خلاف یہ مہم پندرہ جولائی ۱۹۷۷ء سے ۲۸ اگست ۱۹۷۸ء تک برہنہ چلی جا رہی ہے، تاہم یہ اپنے عروج کو اس وقت پہنچے گی جب میری ایٹیکل کا فیصلہ ہونے والا ہو گا۔ سپریم کورٹ کی عدالتی سماعت و کارروائی کے ساتھ ساتھ قوم پر جموں کے ایک اور پلندے کے ساتھ سواری کر لی گئی ہے۔ جھوٹ کا یہ پلندہ ۲۸ اگست ۱۹۷۸ء کو جاری کیا گیا۔ قومی حکومت کے اس نئے ٹکٹ میں بڑے کو کھیلے شور و غوغا کا تعلق میری حکومت کے ذرائع اطلاعات و ابلاغ کے غلط استعمال سے بتایا گیا ہے۔ بہر حال اس طرح سے اس حکومت نے ایک بار پھر اپنے آپ کو جگا کر دیا ہے اس حکومت کی طاقت یہ ہے کہ، یہ زہر آلود بھالے رائے علم کی شکل میں مخصوص وقتوں کے بعد بڑی احتیاط سے چن کر، برسائے گئے ہیں۔ لیکن اس کی طاقت یہ ہے کہ یہ اپنے نشانوں کو نہیں مٹا سکے۔ وہ سٹینکر جس پر ۲۸ اگست ۱۹۷۸ء لکھا گیا ہے، انہیں بڑی آسانی سے دیکھا جاسکتا ہے کہ ان کے نیچے اپریل ۱۹۷۸ء کے الفاظ شائع ہیں یوں اصل تاریخ اشاعت کو اس سٹینکر سے چھپانے کی کوشش کی گئی تھی۔ لیکن اسے پھر پہلے صفحے پر دہرایا گیا ہے۔ اور اس کے آخری صفحے کے نیچے پر مٹر کی طرف سے جو نوٹیفیکیشن ہے اس پر تاریخ ۷۸-۳-۲۵ ہے۔ جس سے یہ

نشانہ دہی ہوتی ہے کہ چھپائی کی ڈیز لائن مارچ کا آخر تھا۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس میں کچھ شک نہیں رہ جاتا کہ اس طرح جو اعتراف خود بخود ہوا ہے، اس سے عوام اور سپریم کورٹ دونوں کو میرے خلاف تعصب اور عناد پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

مزید برآں، لعنت ملاست کی آبشار کی یہ دوسری قسط اس وقت سامنے لائی گئی ہے جبکہ مستنقوں اور صحافیوں کو دستوں کی صورت میں گرفتار کیا جا رہا ہے۔ نامور اور ممتاز مستنقوں کو دھکیلا دی جا رہی ہیں کہ انہیں الٹا لٹکا دیا جائے گا۔ مارشل لا ریگولیشن کے پردے میں پرنٹنگ پریس ہتھیائے جا رہے ہیں۔ وہ اخبارات جو ہماری پارٹی سے تعلق رکھتے تھے انہیں وقفوں میں بند کر دیا گیا ہے اور اس حکومت نے انہیں غصہ کر لیا ہے۔ سرکاری کنٹرول میں ٹیلی ویژن اور ریڈیو کے شعبوں میں، ملازموں کو سمری ملٹری عدالتوں نے سخت سزائیں دی ہیں۔ جب میں کوٹ لکھپت جیل لاہور میں تھا تو وہ صحافیوں سے بھری پڑی تھی، اب میں ڈسٹرکٹ جیل راولپنڈی میں ہوں اور میں دیکھتا ہوں کہ یہ جیل بھی صحافیوں اور ٹیلی ویژن کے ملازموں سے بھری ہوئی ہے۔

دنیا میں کہیں بھی صحافیوں کو کوڑے نہیں مارے جاتے۔ اس فوجی حکومت کو طرہ امتیاز حاصل ہے کہ یہ صحافیوں کو کوڑے لگا کر انعام دیتی ہے۔ فوجی حکومت کو یہ استحقاق قطعاً حاصل نہیں کہ وہ میری حکومت کے خلاف ذرائع ابلاغ کو غلط استعمال کرنے کے متعلق قرطاس ایض پیش کر سکے۔ اس فوجی حکومت نے صحافت کے معزز پیشے کی توہین اور بے عزتی کی ہے۔ یہ صحافیوں کی ہیڈنگ پر اسی طرح سوار ہو گئی ہے جیسے کبھی منگول گھوڑے پر سوار ہوتے تھے۔ وہ صحافیوں پر سوار انہیں چابک مارنے کے لئے اسی طرح دوڑنے کے لئے کہہ رہے ہیں جس طرح منگول اپنے گھوڑوں کو تیز بھگانے کے لئے چابک مارتے تھے۔ یہ دوسرا قرطاس ایض اگر اسے ذرائع اطلاعات و ابلاغ اور صحافیوں کے بارے میں کچھ بھی کہہ سکتا ہے تو اس کا نام ”جانوروں پر رحم کیجئے“ رکھنا چاہئے۔ اس حکومت کے اپنے تراشے ہوئے جو پڑ پڑس کے علاوہ، اس حکومت نے جو سلوک روا رکھا ہے وہ اس میم صاحب کے سلوک سے بھی بدتر ہے، جو وہ برطانوی راج کے دنوں میں اپنے پالتوؤں سے کرتی تھی

اس ایک طرف، غلیظ پرفیمنڈس، تعصب اور عناد کے اس شرمناک مظاہرے کا موازنہ ان کے ان تضادات سے کرنا چاہئے کہ جب میری بند کمرے میں بھی اپنے مقدمہ قتل میں صفائی پیش کرنے کی درخواست مسترد کر دی تھی اور بیماری سے علاج کے لئے مجھے ہسپتال منتقل کرنے کی درخواست بھی ٹھکرا دی گئی تھی میں پھانسی کی کوٹھی میں ہوں۔ میری بیوی کا سر اس حکومت نے بڑی بہادری سے ۶ دسمبر ۱۹۷۷ء کو قذافی سٹیڈیم میں پھاڑ دیا جس پر لاہور ہائی

کورٹ کے چیف جسٹس نے اگلے دن کہا تھا ”اگر تم پریشان ہو تو مجھے اس کی کوئی پرواہ نہیں“ میری اس بیوی کو گیارہ ماہ تک نظر بندی میں رکھا گیا، اس کی نظر بندی کو سندھ ہائی کورٹ نے غیر مؤثر قرار دیا تھا۔ فوجی حکومت اس کی رہائی سے بہت پریشان ہوئی۔ میرا کزن ممتاز علی بھٹو جیل میں ہے۔ پی پی پی کے بیشتر رہنما اور کارکن یا تو نظر بند ہیں یا بیسوں میں ہیں۔

ایسے حالات و واقعات میں، یہ امکان کہاں رہ جاتا ہے کہ آلودگی کو پاک کیا جاسکے؟ اپنے اس جواب دعویٰ کا بیشتر حصہ میں نے کاغذ کو اپنے گھٹنے پر رکھ کر لکھا ہے۔ کئی بار ٹھکن سے میری آنکھیں دھندلا گئیں اور سر جھرانے لگا۔ ایک بے بصیرت، کور چشم اور عناد رکھنے والا شخص یہ دلیل دے سکتا ہے کہ آخر قرطاس ایض کے بارے میں یہ جو سارے نکات اٹھائے گئے ہیں ان کا حاصل کیا ہے؟ اس کا جزوی جواب تو قرطاس ایض میں نہیں ملے گا لیکن وہ مقصد جو قرطاس ایض پر فائق دکھائی دیتا ہے اس میں اس کا جواب موجود ہے۔ یہ اسکا انتہائی جامع جواب ہے۔

اس جواب دعویٰ میں جتنے امور پر بحث کی گئی ہے اس کا براہ راست اور تفصیلی تعلق قرطاس ایض سے ہے، جس میں سے پی پی پی نے اس کے اس رویے کو خارج کر دیا گیا ہے جس کا مظاہرہ پی پی پی نے مارچ ۱۹۷۷ء کے انتخابات میں کیا تھا۔ یہ تمام امور مارشل لا کے نفاذ سے جنم لیتے ہیں۔ ان میں کوئی بھی ایسا نہیں جو غیر متعلقہ اور جداگانہ ہو۔ نہ ہی کسی ایک کو دوسرے کے بغیر مناسب انداز میں سمجھا ہی جاسکتا ہے۔ قرطاس ایض میں جس طرح جھوٹ کو حراش خراش کر پیش کیا گیا ہے، اس کے برعکس میں نے سب امور کو حقائق کے ساتھ پیش کیا ہے اور کسی بھی غلط بیانی سے کام نہیں لیا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو میرا یہ جواب ان سیاسی تصورات سے تہی ہوتا اور یہ تحریر اپنے مصنف کے شایان شان نہ ہوتی۔ مارشل لا کے نفاذ کے بعد برصغیر میں رونما ہونے والی تبدیلیاں، افغانستان اور پاکستان کے مابین تعلقات کی نوعیت، نیو کلیر ہراسہ بینک پلانٹ کا مستقبل، جانبداری اور غیر جانبداری، یہ تمام ایسے موضوعات ہیں جن کا پاکستان کی تقدیر کے ساتھ بہت گہرا تعلق ہے۔ موجودہ صورت حال کی متوازن تصویر پیش کرنے کے ذریعے کسی بھی مجبوری اور قید سے ماوراء، یہ قادی کے ساتھ زیادتی ہوگی کہ اس کی بھوک کی تحدید کر دی جاتی۔

قرطاس ایض کے مرتبین کو اپنے انکشاف گرائمر کے علم پر ناز ہے۔ اور اس کے تعارف میں انہوں نے دوسروں کی غلطیوں کی وضاحت پیش کی ہے۔ کوئینیز انکشاف میں میرا علم شاید استاتر ترقی یافتہ نہیں ہے جتنا کہ قرطاس ایض کے کئی مرتبین کا۔ حتیٰ کہ اگر ایسا ہوتا بھی تو میں انکشاف گرائمر کی غلطیوں پر معذرت نہ کرتا۔ میں تو سیاسی گرائمر کی غلطیوں پر معذرت کرتا۔ اگر کوئی خیال واضح طور پر یا مؤثر انداز میں پیش نہیں کیا جاسکا، اگر سیاسی تجزیہ میں کوئی نقص ہے

اگر منطق میں کوئی خامی ہے تو میں معذرت کروں گا لیکن قاری کو یہ بھی یاد دلاؤں گا کہ میں لگ بھگ ایک سال قید تہائی اور چار مہینوں کے زائد عرصے سے پھانسی کی کوٹھی میں پڑا ہوں۔ میرے خلاف کارروائی کا آغاز ۵ جولائی ۱۹۷۷ء سے اور اس کے بعد شروع ہو گیا۔ اگر فوجی بغاوت نہ ہوتی ہوتی تو سنگم نصرت بھٹو سپریم کورٹ میں مارشل لا نافذ کو چیلنج کرنے کے لئے آئینی درخواست دائر نہ کرتیں، میں گرفتار ہی نہ کیا جاتا۔ میرے خلاف فوجی مقدمات درج نہ کئے جاتے۔ مجھے مارشل لا کے ریکولیشن نمبر ۱۲ کے تحت نظر بند نہ کیا جاتا۔ لاہور میں مقدمے کی سماعت کی عدالت معرض وجود میں نہ آتی، یہ اپنے آپ ہی خود کو پند عدالت میں تبدیل نہ کرتی۔ میں موت کی کوٹھی میں نہ ہوتا۔ اور موت کی سزا کے خلاف سپریم کورٹ میں اپیل بھی نہ کی جاتی۔

اس درد اور تکلیف کو کشادہ کرنے اور پھیلانے کا مقصد یہ دکھانا ہے کہ مارشل لا کے آغاز سے لے کر، سپریم کورٹ نے اسے جو استحکام دیا، تک کے ہر واقعے اور معاملے کا تعلق جہاں تک بھی ہو سکتا ہے میری ذات کے ساتھ بنتا ہے ایک کیس کو دوسرے کیس سے علیحدہ کرنا ممکن نہیں کہ مختلف فیصلے سنائے جائیں اور مختلف سزائیں دی جائیں۔ اور نہ ہی ایک کیس میں اس عناد اور بغض کی کمی بیشی کو بھی دوسرے کیس سے جدا کیا جاسکتا ہے۔ ایک سابق صدر اور وزیر اعظم کے خلاف ان الزامات کی سماعت کے لئے جو بظاہر جوڈیشل ٹریبونل تشکیل دیا گیا ہے اس کے سربراہ لاہور ہائی کورٹ کے مسٹر جسٹس شفیع الرحمن یوں لگے۔ اس سپیشل ٹریبونل کی کارروائی ۱۰ مارچ ۱۹۷۸ء کو کوٹ لکھپت جیل لاہور میں شروع ہوئی۔

مسٹر جسٹس شفیع الرحمن کی سربراہی میں اس سپیشل ٹریبونل میں اس فوجی حکومت نے مجھ پر جو فوجی الزامات عائد کئے۔ ان فوجی الزامات میں سے ایک کا براہ راست تعلق اس قرطاس امین سے ہے جسے اس فوجی حکومت نے شائع کیا ہے۔ دوسرے الفاظ میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ فوجی حکمرانوں نے ایک سپیشل ٹریبونل اس لئے قائم کیا کہ یہ معلوم کر سکے کہ کیا میں نے وہ جرم کیا ہے جو ایک ۱۰۴۴ صفحات کی دستاویز جس میں ۳۴۴ ضمیمہ جات بھی شامل ہیں اس حکومت نے شائع کیا، جس کا واحد مقصد یہ ثابت کرنا ہے کہ میں اس الزام میں قطعی طور پر مجرم ہوں، جو مجھ پر اس سپیشل ٹریبونل میں عائد کیا گیا، جس کے سربراہ مسٹر جسٹس شفیع الرحمن ہیں۔ اب فیصلہ کرنے کے لئے باقی کیا رہ گیا ہے؟ فوجی حکمرانوں نے اپنا فیصلہ اس ٹریبونل کو دیدیا ہے جسے انہوں نے قائم کیا تھا۔

ہماری انٹیلیجنس میں ایک معمولی سا عنصر ان لوگوں کا بھی شامل ہے جو بال کی کھال اتارنے کے ماہر ہوتے ہیں، اگر بال کی کھال اتارنے والے دلائل کے ذریعے یہ کہتے ہیں کہ اس

قرطاس امین اور سپیشل ٹریبونل یا سپریم کورٹ کی اپیل میں کوئی واسطہ یا تعلق نہیں ہے، تو پھر بال کی کھال نہ اتارنے والے دانشوروں کی سبے پناہ اکثریت اس بات کو فوجی حکومت کے تعصب اور عناد سے بھی گہرا قرار دے گی۔ ان میں ایک قطعی ربط ہے اور ان میں ٹھوس باہمی تعلق پایا جاتا ہے۔ تمام عذاب اور ہراسنایاں تمام فوجی اور دیوانی الزامات اور مقدمات کا سراغ جا کر مارشل لامیں مل جاتا ہے۔ قرطاس امین کا مقصد بھی سپریم کورٹ کے فیصلے پر اثر انداز ہونا ہے۔ اس میں فیصلے کی غلط شرع ترجمانی اور تشریح کی گئی ہے Oletadicta اس میں Ratio Dissiddnda بن کر ظاہر ہوتا ہے۔ /

اپنی اس کوشش میں کہ ماحول کو پوری طرح زہریلا بنایا جائے، قرطاس امین نے یہ کوشش کی ہے کہ عوام کو اور بطور خاص ان لوگوں کو، جن کا تعلق میری قسمت سے ہے، اس وقت میرے خلاف متعصب اور پُر عناد بنا دیا جائے۔ قرطاس امین حسد اور عناد سے شراپور ہے۔ میں پہلے ہی یہ ذکر کر چکا ہوں کہ الیکشن کمیشن کے سیکرٹری مسٹر اے۔ زید فاروقی کے ذریعے قرطاس امین نے میرے خلاف ناراضگی اور نفرت کو پھیلانے کی کوشش کی ہے۔ چیف الیکشن کمیشن نے اس سلسلے میں کوئی گواہی نہیں دی کہ میں نے مبینہ طور پر انہیں فیملی فون پر قائد اعظم اور علامہ اقبال کی تشبیہ روکنے کے لئے کیا کہا تھا۔ نہ ہی انہوں نے یہ بات اب کہی ہے اور نہ ہی انہوں نے یہ بات پہلے کہی تھی۔ لیکن، مسٹر اے زید فاروقی جو مسٹر ابن اسے فاروقی کے بھانجے اور جو بڑے سلطانی وعدہ معاف گواہ مسعود محمود کے بہنوئی ہیں، انہوں نے ان رسوا اور بد نام حتمی بیانات میں سے ایک ضمنی بیان میں کہا ہے کہ چیف الیکشن کمیشن نے انہیں ٹیلی فون پر بتایا تھا کہ میں نے چیف الیکشن کمیشن کو ٹیلی فون پر کہا تھا "کیا آپ ہماری پبلسٹی کو تباہ کرنا چاہتے ہیں؟ آپ قائد اعظم اور اقبال کا حوالہ کیوں دیتے پٹے جارہے ہیں؟"

قرطاس امین کا یہ سفید جھوٹ کسی برف کو نہیں کاٹ سکے گا۔ یہ واقعات ۵ جولائی ۱۹۷۷ء کو اور غلام محمد ہوتے تھے۔ جب میری حکومت نے قائد اعظم اور علامہ اقبال کے جشن صد سالہ کا اہتمام کیا تو اپوزیشن کے رہنماؤں نے مجھ پر اقبال پر رویہ ضائع کرنے کا الزام لگایا تھا۔ ان شاندار صد سالہ جشنوں اور تقریبات پر مجھ پر الزامات عائد کئے اور قائد اعظم اور علامہ اقبال کی جو پبلسٹی کی گئی تھی اس پر شدید تنقید کی گئی۔ انہوں نے بائیں پاکستان کی تذلیل کی اور پوری صفائی سے ان پر حملے کرتے رہے، آج کے دن تک، وہ لوگ مارشل لا کی روشنیوں میں ہیں، قائد اعظم کے مقبرے یا ان کی قبر پر فاتح خوانی کے لئے نہیں گئے۔ انہوں نے قائد اعظم کو اپنا قائد تسلیم کرنے سے انکار کر دیا ہے۔ ۱۰ دسمبر ۱۹۷۹ء کو میں نے قائد اعظم کے صد سالہ جشن پر پارلیمنٹ سے خطاب کیا تھا۔ اپنی اس تقریر میں میں نے قائد اعظم کی مخالفت اور تنقید کا جو

مودودی اور اس کی جماعت اسلامی کے لیے تھی، تفصیلی تجزیہ کیا تھا۔ قائد اعظم کی تصویر کو مخاطب کرتے ہوئے میں نے کہا تھا،

”جب آپ شوکت اسلام اور مسلمانوں کے فخر و افتخار کی جدوجہد کر رہے تھے تو انہوں نے آپ کو سب سے زیادہ برا بھلا کہا اور بدنام کیا جو اس خطے میں اسلام کی تقدیر اور مسلمانوں کے دعویدار بننے تھے میں جانتا ہوں کہ آج وہ آپ کا احترام کرتے ہیں۔ میں جانتا ہوں کہ آج وہ اخبارات میں ایسے مراسلے شائع کر رہے ہیں، جن میں آپ کے کردار اور شخصیت کی شہنائی ہوئی ہے۔ لیکن آپ کی زندگی میں، جب آپ جدوجہد کے میدان میں تھے، جیسا کہ آپ نے ایک بار لاہور میں کہا تھا جب آپ اپنے خون کو پانی بنا رہے تھے۔ تب انہوں نے کیا کہا تھا؟ ان مولاناؤں، اور مولویوں نے جن کا آپ نے عوام میں ذکر کیا، اس وقت کیا کر رہے تھے؟ کیا آپ کے ایمان پر حملہ کرنے میں انہوں نے کوئی ہچکچاہٹ محسوس کی؟ آپ اسلام پر اپنے ایمان کی نمائش نہیں کرتے تھے۔ یہ ایمان آپ کے دل کی ہر اینٹوں میں تھا۔ ان میں سے ایک ہر زبان شخص نے آپ کو کافرا عظمیٰ کا نام دیا تھا۔“

میرا خیال ہے کہ اس اہم تقریر کو قومی اسمبلی کے آرکائیوز سے نکال دیا گیا ہو گا۔ کچھ سچی ہو، محب وطن یہ کبھی فراموش نہیں کر سکتے کہ مودودی اور جماعت اسلامی نے قائد اعظم کی شدید مخالفت کی تھی۔

(ا) وہ لوگ جو آغاز سے اسلام کا علم نہیں رکھتے، جو اپنے آپ کو اس لئے مسلمانوں کی قیادت کا مجاز سمجھتے ہیں کہ وہ مذہبی سیاست یا مغربی طرز کی تنظیم کے خصوصی ماہر ہیں اور وہ اپنی قوم کی محبت میں بچیے ہوئے ہیں، تو اس طرح اپنا اظہار کرتے ہوئے وہ اسلام کے بارے میں اپنی قطعی لاعلمی ثابت کرتے ہیں اور غیر اسلامی ذہنیت رکھتے ہیں۔

(ب) وہ جو کہ لفظ ”مسلم“ سے دھوکہ کھا کر اپنے آپ کو بطور مسلم تنظیم کرتے ہیں، وہ جاہلیت کی راہ اختیار کرتے ہیں، اور یہ سمجھتے ہیں کہ اس قسم کی تنظیم اسلامی نقطہ نظر سے مفید اور کارآمد ہوگی، ان کی حماقت پر ماتم کرنا چاہیے۔

(ج) کہنے افسوس کی بات ہے کہ لیگ کے قائد اعظم سے لے کر، لیگ کے پیروکاروں تک، ان میں کوئی ایک بھی ایسا نہیں جن کا ذہن اسلامی ہو، جو اسلام کو سمجھتا ہو اور اسلامی طرز فکر رکھتا ہو اور معاملات و امور کو اسلامی نقطہ نظر سے دیکھ سکتا ہو۔

(د) ایک مسلمان کی حیثیت سے، مجھے مسلمانوں کی ریاست قائم کرنے یا ہندوستان کے جن علاقوں میں مسلمانوں کی اکثریت ہے ان کی حکومت بنانی چاہئے، اس سے مجھے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔

مجھے یاد ہے کہ میں نے قائد اعظم کے جشن صد سالہ پر پارلیمنٹ میں کہا تھا ”ہم جانتے ہیں کہ وہ ہمیں کافر“ کہتے ہیں۔ ایسا کہتے ہوئے دراصل وہ اس جنگ کو جاری رکھنے ہوئے ہیں جو انہوں نے قائد اعظم کی زندگی میں شروع کی تھی“ اس تقریر کے ایک سال سے کچھ زیادہ عرصے کے بعد لاہور ہائی کورٹ نے اپنے فیصلے میں مجھے نام نہاد مسلمان، بنا دیا۔ اس وقت جبکہ میں اس انتہائی عفونت زدہ موت کی کوٹری میں بیٹھا ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ اس تاریخی دن، پارلیمنٹ میں میرے الفاظ کہنے سے چھ ماہ بعد قائد اعظم پر حملہ کرنے کی کون جرات کر سکتا ہے؟ یہ تو بغاوت ہوگی۔ اسی لئے اب اس حملے کا رخ ان کی طرف کر دیا گیا ہے جو پاکستان کی سربراہی کر رہے ہیں۔ ہاں اگر آپ قائد پر حملہ نہیں کر سکتے تو آپ اب بھی ان کے وارثوں پر حملہ کر سکتے ہیں“

لکشمیر اور محمود الرحمن کمیشن کے بارے میں جو مسخ شدہ اور بے بنیاد حوالہ قرطاس ایض کے صفحہ ۱۰۷ پر دیا گیا ہے، اس کا پہلے بھی جواب دے چکا ہوں۔ یہاں میں یہ ذکر کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ جو من مانی توڑ پھوڑ لکھی گئی ہے اس کا مقصد عوام کو میرے خلاف برگشتہ کرنا اور مسلح افواج میں غلط فہمیاں پیدا کرنا ہے۔

موجودہ سچویشن کے حوالے سے، اس جنگ کا پلان، جو فوجی حکمرانوں کے ماڈل پلان پر استوار ہے، اور جو پاکستان کی فتح کا پلان ہے۔ اس کے تحت مقصد یہ ہے کہ لوگوں کو غلط اور گمراہ کن پروپیگنڈہ سے منہ پھریا جائے۔ بطور خاص عدلیہ کو متعصب بنانے کی کوشش کسی شخص کی محتاج نہیں ہے۔ قائد اعظم اور علامہ اقبال کے بارے میں وحشیانہ بھڑک چھلا کر عدلیہ کو ناراض کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ایک بار پھر جلد حاضر و موجود رہنے والے سیکرٹری الیکشن کمیشن مسٹر اے زیڈ فاروقی کی خدمات حاصل کی گئیں کہ وہ یہ کہیں کہ انہیں حیات محمد ثمن نے یہ کہا تھا کہ وہ ججوں کے بارے میں پریشان نہ ہوں، کیونکہ وہ تو چھوٹی چھوٹی مراعات کے لئے حکومت کے پاس آتے ہیں، ان کا انتظام کر لیا جائے گا، یوں لگتا ہے کہ جیسے یہ دلچسپ اور حیران کن دھوکہ دہی جو صفحہ ۳۳ پر دی گئی، کافی نہیں سمجھی گئی اور اس یقین کے لئے کہ یہ لہانت اصل گمراہ کن پہنچ جائے قرطاس ایض نے اسے اپنے طریقے سے صفحہ ۴۲ پر پھر دہرایا ہے۔ میں یہ قطعی طور پر واضح کر چکا ہوں کہ مسٹر ثمن ایسی احمقانہ بات نہیں کر سکتے اور عدلیہ کی ایسی لہانت نہیں کر سکتے، اسے لوگ تو اتنے محتاط ہوتے ہیں کہ وہ کسی سب انسپٹر کو یا ایک پنواری یا تحصیلدار کو بھی ناراض نہیں کر سکتے، اس بہتان کا اطلاق ثمن جیسے آدمی پر نہیں ہو سکتا۔

سپریم کورٹ میں منظم ہتھرت بھڑکی آئینی درخواست کی سماعت اور فیصلے کے بارے میں قرطاس ایض میں لکھی حوالے دئے گئے ہیں۔ اگرچہ یہ حوالے اہم اور خاص اہمیت کے حامل ہیں۔ جہاں تک میں ان میں سے زیادہ اہم حوالوں کو جمع کر سکا ہوں، وہ

محمود کا یہ بیان کہ انتخابات میں فیڈرل سیکورٹی فورس کو صرف یہ ذمے داری سونپی گئی تھی کہ وہ متوقع امیدواروں کے بارے میں معلومات حاصل کرے، اس کی تصدیق قرطاس ایٹس نے صفحہ ۲۰۵ پر کی ہے۔

”سرکاری ریکارڈ سے بھی یہ حقیقت، ثابت ہوتی ہے کہ آپریشن وکٹری، کے تحت پی پی پی کے متوقع امیدواروں کے بارے میں ایسا مواد جمع کیا گیا تھا تاکہ ان کو انتخابات میں پارٹی کی ٹکٹ دینے کے لئے ان کی موزونیت کا اندازہ لگایا جاسکے۔“

تین ماہ کی پرجوش انتخابی مہم کے درمیان، ایوزیشن کے کسی ایک جلسے یا جلوس میں کوئی ہنگامہ آرائی ہوئی نہ انہیں منتشر کیا گیا۔ انتہائی شدید دباؤ سے بوجھل انتخابی مہم کے دوران ایوزیشن نے ایسا کوئی الزام عائد نہ کیا، انتخابی مہم کے آخری دن پہلے خاتمے پر ایوزیشن کے بعض رہنماؤں نے استظلمات پر اپنے اطمینان کا اظہار کیا۔ ان میں سے کسی نے بھی ایسی شکایت نہیں کی کہ ان کے جلسے یا جلوس کو درہم برہم کرنے یا توڑنے کی کوشش کی گئی ہو۔ پورے قرطاس ایٹس میں ایسی کوئی بات عقل کی گئی، نہ حوالہ دیا گیا، جن کا تعلق مسٹر اس کے بروہی کی ان معروضات سے ہو۔ جو انہوں نے ۱۰ اکتوبر ۱۹۷۷ کو فیڈرل سیکورٹی فورس کے کردار کے بارے میں سپریم کورٹ کے سامنے پیش کیں۔ قرطاس ایٹس اور ان ریکارڈس کے درمیان قطعی طور پر کوئی تعلق یا واسطہ نہیں ہے۔ قرطاس ایٹس اور ان ریکارڈس کے ساتھ واحد تعلق - میری ایپل سے بنتا ہے۔

قصوری کا قتل

ایف ایس ایف کے متعلق ”کرزہ خیز تفصیلات، میاں محمد عباس کا کردار سلسلہ ڈیویژنل سکواڈز، ہم چلانے والوں کے سکواڈ کا واسطہ انتخابات سے ہے نہ انتخابات میں ایسی کوئی شکایت کی گئی۔ ان کا تعلق میرے مقدمے اور سپریم کورٹ میں میری ایپل میں اہمیت رکھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جس کے سبب مسٹر اس کے بروہی کے یہ خصوصی اور پیسلے ریکارڈس، قرطاس ایٹس کے موضوع سے کوئی ربط نہ رکھنے کے باوجود قرطاس ایٹس میں ان کی ہیٹونہ کاری کی گئی۔ ان ریکارڈس کے متعلق سپریم کورٹ نے کوئی نتیجہ نہیں نکالا تھا۔ لیکن یہ کسی مبتدی کے لئے واضح نہیں ہو سکے، مقصد یہ ہے کہ ایپل کی سماعت کے دوران استغاثہ کو طاقتور اور مؤثر بنانے کے لئے زیادہ سے زیادہ سہارا دیا جائے۔ اور باتوں کے علاوہ، ایف ایس ایف کا مبینہ کردار، میاں محمد عباس اور ایف ایس ایف کے دوسرے سرکاری اور اہم ملازموں کے قصوری

کے والد کے قتل میں شریک کیا جائے۔ اگر مسٹر اس کے بروہی ایف ایف کے ٹھیک نشاندہ بازوں کے بارے میں صحیح کہتے ہیں اور اگر استغاثہ کی یہ بات سچی مان لی جائے کہ یہ قتل ایف ایف ایف کا کام تھا تو پھر فورس کو ایسے ٹھیک نشاندہ بازوں، کو برقی نہیں کرنا چاہئے تھا جو ایسا بھدا اور بے نیلگم کام کرتے ہوں۔

قرطاس ایٹس کے صفحہ ۳۳۸ اور ۳۳۹ پر انتخابات کے بارے میں سپریم کورٹ کی آراء کو اس انداز سے یہ تاثر پیدا کرنے کے لئے پیش کیا گیا ہے کہ سپریم کورٹ کا فیصلہ قرطاس ایٹس کا ہم خیال ہے۔ سپریم کورٹ کی یہ رائے عدلیہ کی تحقیقات و نتائج کے لئے کہ اس ضمن میں بے اطمینانی صحیح تھی بہتر تھی سرکاری ریکارڈ طلب نہیں کیا گیا۔ کو صفحہ ۳۳۹ پر درج کیا گیا ہے، لیکن یہ ایسے ہی ہے جیسے سچ شدہ حقیقتوں، آدمی سچائیوں اور جعلی جھوٹ کے سمندر میں پانی کا ایک قطرہ ہو۔“

عام حالات میں، میں سپریم کورٹ سے درخواست کر سکتا تھا کہ اس قرطاس ایٹس پر پابندی کا حکم صادر کیا جائے۔ کیونکہ یہ مسٹر شفیق الرحمن کے خصوصی ٹریبونل کے انصاف کی راہ کو پہلے سے متاثر کرتا تھا اور سپریم کورٹ میں میری ایپل کے خلاف شدید تعصب اور عناد پیدا کرتا ہے۔ عام حالات میں، میں ایسی تمام سرکاری دستاویزات کے لئے پابندی لگانے کی درخواست کر سکتا تھا جو قرطاس ایٹس کے مزید مقاصد کی برآوری کے لئے ابھی جاری کی جانے والی ہیں اور ان پر اس وقت تک پابندی لگادی جائے جب تک سپیشل ٹریبونل اور سپریم کورٹ اپنے فاضلانہ فیصلے صادر نہیں کرتے۔ عام حالات میں، میں یہ درخواست بھی کر سکتا تھا کہ اس حکومت کے اس یکطرفہ معاندانہ اور جھوٹے پروپیگنڈے کا جواب دینے کے لئے مجھے ضروری اور مناسب سہولتیں فراہم کی جائیں۔

پاکستان کے شہری اور اس کے سابق صدر اور وزیر اعظم کی حیثیت سے یہ میرا ناقابل استغاثہ حق ہے کیونکہ جس طریقے سے اس فوجی حکومت نے مجھے روا اور بدنام کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس سے نہ صرف اس ملک کے سب سے بڑے انتخابی عہدے کو ہی بلکہ ملک کو بھی ناقابل بیان نقصان پہنچا ہے۔ چونکہ عدلیہ کے طریق عمل میں جواب کا حق عدلیہ کا ایک لازمی حصہ ہے، اور چونکہ اس قرطاس ایٹس کے ذریعے سپریم کورٹ میں میری ایپل کے اوپر ہیٹونہ سایہ کر دیا گیا ہے، اسی لئے پاکستان کے عوام کا یہ حق ہے کہ وہ میرے دفاع تک کسی بھی رکاوٹ کے بغیر رسائی حاصل کر سکیں۔ ہر کسی کی ایک رعایت کی حیثیت سے نہیں بلکہ اپنے وقار کے دفاع اور اپنی بے گناہی کو ثابت کرنے کے حق کے طور پر۔ حق کو نہ کم کیا جاسکتا ہے نہ اس کا راستہ روکا جاسکتا ہے۔ اسی لئے ۲۸ اگست ۱۹۷۸ کو جاری کئے جانے والے پروپیگنڈے کے اس

مالیٹولیا کو بھی ذہن میں رکھنا چاہئے۔ سیکم نصرت بھٹو کی ریت درخواست کی سماعت کے دوران مدعا علیہ کے وکیل نے سپریم کورٹ کی اجازت حاصل کر کے پچھلے تمام مواد پریس کے لئے جاری کر دیا تھا۔ یہ قتل کے خلاف ایک ایسیل ہے جس پر میری جان واؤں پر لگی ہوئی ہے۔ یہ ثابت کرنے کے لئے کہ یہ ایک شاہکار ہے قرطاس امین کا خاتمہ ایک اقتتالیہ پر کیا گیا ہے۔ اس نے مجھے تاریخ سکھانے کی گستاخی کی ہے۔ اس دستاویز کے مرتبین نے پولین کا حوالہ دے کر تاریخ کی توہین کی ہے۔ جس طرح ۲۸ مارچ ۱۹۷۷ کو میری قومی اسمبلی کی تقریر کو یہ مصنفین اس کے اس نکتے کو سمجھنے میں ناکام رہے اور میری تقریر کو غلط رنگ دیا، اسی طرح پولین کے ریمارک کے بارے میں یہ فلسفیانہ ریمارک اس قابل رحم مخلوق پر ضائع ہو گیا۔ بہر حال اگر وہ پولین کے ریمارک کی لفظی تشریح کرنا چاہتے ہیں کہ پولین کا یہ ریمارک کہ تاریخ ایک فرضی حکایت ہے تو اس لحاظ سے یہ قرطاس امین تمام قصوں کہانیوں سے زیادہ کمزور و لاغر ہے۔ یہ کہیں زیادہ مناسب و موثر ہوتا اگر قرطاس امین کارل مارکس کا حوالہ دیتا۔ جس نے کہا تھا کہ تاریخ انسانوں کی پشت کے عقب میں لکھی گئی ہے۔ قرطاس امین میری پشت کے پیچھے جاری کیا گیا ہے یہ کسی اور طرح سامنے آہی نہیں سکتا تھا۔

قوموں کا عروج و زوال سورج کے طلوع اور غروب کی طرح ہوتا ہے کلچر اور تمدن کے ذریعے بعض قومیں اپنے آپ کو عظیم بناتی ہیں، فوجی بغاوتوں اور سازشوں سے دوسری قومیں تاریخ کا ملبہ بن جاتی ہیں۔ ۱۹۷۷ میں میں نے سپریم کورٹ کے سامنے بیان کیا تھا کہ اگر ۱۹۷۳ کا آئین کم سے کم مدت سے ماوراء یا معطل کیا جاتا ہے تو پھر اس کی معطلی کا قانونی فنکشن ناقابل قبول ہو جائے گا۔ ۱۹۷۳ کے آئین کی تفسیر سے عدلیہ کے لئے دو نتائج واقعات نہیں گئے۔

(ا) اس کا مطلب یہ ہو گا کہ ہم واپس انڈین انڈی پیمنڈینس ایکٹ کے تحت ۱۹۴۷ پر واپس چلے جائیں گے جسے برطانوی پارلیمنٹ نے منظور کیا تھا۔

(ب) اس کا یہ مطلب بھی ہو گا کہ انڈین پیمنڈینس ایکٹ ۱۹۴۷ کی بحالی کے بعد اختیار کا وہ توازن، جو صوبوں نے رضا کارانہ فیڈریشن کے لئے چھوڑ دیا تھا وہ ان صوبوں کو واپس چلا جائے گا۔

میں نے سپریم کورٹ کو بتایا تھا کہ یہ فوجی حکومت ایسے راہ انتخاب کھول رہی ہے جنہیں کبھی کھولنا نہیں چاہئے تھا۔ اور وہ راہ انتخاب بند کر رہی ہے جنہیں کبھی بند نہیں ہونا چاہئے۔ حالات کو ابتر بنانے کے لئے، جو نقصان ہوا اس کی مذمت کرتے ہوئے، نہ صرف یہ کہ آئین کو سپریم کورٹ کے نظریہ ضرورت کی تشریح کے تحت بھی، غیر ضروری

اور لمبے عرصے سے سرد خانے میں ڈال دیا گیا ہے بلکہ رائے دہندگان کے بنیادی حقوق کی شکلوں کو بھی، ایک آدمی اپنی من مانی مرضی سے ترسیم کر رہا ہے۔

آئین کا جائز استعمال کیا جاتا ہے یا پھر آئین ہی نہیں ہوتا۔ یہ کوئی میزبوش نہیں ہوتا کہ جب جی میں آیا اٹھا لیا جب چاہا میز پر بچھا دیا۔ یہ کوئی تصویر بھی نہیں ہے کہ اسے محفوظ کر لیا جائے اور جب چاہیں باہر نکال لیں، آئین ریاست ہوتا ہے اگر آئین کو موقوف و معطل نہیں کیا گیا تو پھر ایسی کوئی گنجائش، قانونی گنجائش سرے سے موجود نہیں ہے کہ خود مختاری کے تنازعے کو پھر سے زندہ کیا جائے۔

جب ہم نے پارلیمنٹ میں دستور کی شکلوں کے مطابق آئینی ترامیم کیں تو بنیادیں اس نے یہ کہا کہ یہ ”ترمیمیں یک سمتی ہیں اور انہوں نے دستور کو بے ضابطہ بنادیا ہے“ جبکہ تمام ترمیمیں دستور کی شکلوں کی سخت پابندی کے مطابق کی گئی تھیں۔ اس کے باوجود بنیادیں اس کے لئے وہ قابل قبول نہ تھیں۔ اگر اس موقف میں ذرہ بھر بھی صداقت تھی تو پھر یہی لوگ آج یہ کیسے کہہ رہے ہیں کہ فوجی بغاوت کے باوجود یہ دستور قابل عمل ہے نظریہ ضرورت کو بھی نظر انداز کر کے دستور کا یہ تعطل اور ایک فرد واحد کا آئین کی بنیادی شکلوں میں اپنی مرضی کی ترمیمیں کرنا کہاں تک جائز و درست ہے؟ موجودہ مارشل لا دستور کے باہر ہے۔ یہ تو ڈیوک آف ولنگٹن کا مارشل لا ہے اسے یہی نام دیا جاسکتا ہے اس کا آئین کے ساتھ کوئی واسطہ نہیں ہے۔ یہ دستور کی شکلوں سے نہیں آیا ہے واقعات اس فوجی حکومت کو ایک خطرناک اور سفاک راستے کی طرف دھکیل رہے ہیں۔ یہ معاملہ سرنگ کے خاتمے پر بھی ختم نہ ہو گا۔ اس کے بعد ایک اور سرنگ ہے آج کے بعد ایک کل ہے اور آپ جیسا بونین گے ویسا ہی کاٹیں گے۔ دوسرے لفظوں میں پاکستان کو کلچر اور کروی فصل کاٹنا ہوگی

۲۴ ستمبر ۱۹۷۸ کو سعودی عرب سے اپنی واپسی کے بعد جنرل ضیاء الحق نے اعلان کیا کہ نیروں میں جو ملکینیاٹھاکی سہ فیہن کے موقع پر ان کی ”اچھی دوستانہ اور مفید بات چیت“ ”بہت تجربہ کار سیاست دان“ بھارت کے وزیر اعظم کے ساتھ انتہائی خوشگوار ماحول میں ہوئی۔ ایک سوال کے جواب میں جنرل نے کہا ”بھارت اور پاکستان دونوں ملکوں کے گزشتہ تیس برسوں کے باہمی تعلقات میں عدم اعتمادی وجہ سے بہت سی غلط فہمیاں پیدا ہوئیں۔ ضرورت اس بات کی تھی کہ بھارت کے متعلق شک و شبہات دور کئے جائیں۔ ایک سینئر صحافی دار کی حیثیت سے بھارت کو ان شبہات کے خاتمے کے لئے ابتدا کرنی چاہئے“ حکومتوں کی مساوی خود مختاری کے تصور میں کسی ”سینئر پارٹنر“ کے لئے کوئی گنجائش نہیں ہکتی“، لیکن بھارت کس طرح ایک حصے دار یا شریک ہو سکتا ہے؟ اگر ہم کسی بھی شکل میں حصے

دار میں تو پھر پاکستان کی علت غائی ہی ختم ہو جاتی ہے۔ کیونکہ قائد اعظم کا بنیادی موضوع و مقصد ہی یہ تھا کہ چونکہ ہم ہندوستان میں شریک و حصے دار بن کر نہیں رہ سکتے۔ اس لئے اس کا نام البدل پاکستان ہے۔ بھارت نہ صرف سینیٹر حصے دار بلکہ حصے دار ہی نہیں ہے۔ بڑا چھوٹا یا برابر کسی حیثیت میں بھی حصے دار نہیں۔ یہ شراکت کہاں ہے؟ کسی کٹ یا کسی نوعیت کی شراکت حصے دار کی کیسے ہو سکتی ہے۔ کیا پاکستان شراکت و حصے دار کی کا کوئی خفیہ معاہدہ کر چکا ہے یا بھارت کے ساتھ کفایت پذیریشن کر لی ہے۔ کیا اس فوجی حکومت نے دھوکہ دہی کے کوئی ایسا معاہدہ کر لیا ہے جس کے نتیجے میں پاک بھارت تعلقات میں ساجھے دار کی پیدا ہو گئی ہے۔ کیا یہی وجہ ہے کہ جنرل بیسٹ بھارت کی خوشامد کرتا ہے اور اس کے رہنما کی طرح قصیدہ خوانی کی شکل میں کرتا رہتا ہے؟

پاکستان کے مطالبے کے برتر محرکات میں سے ایک ایک محرک یہ تھا کہ مسلم انڈیا پر ہندو انڈیا کی برتری اور بڑائی کے واسطے کو ختم کر کے ایک مسلم ریاست تخلیق کی جائے جو دوسری ریاست کے مقابلے میں مساوی اور خود مختار ہو۔ ”بڑے حصے دار“ کا تصور اور مفروضہ تو صرف اور صرف تراش خراش کے تعلقات کی دنیا میں ہوتا ہے، کیا اسی لئے انتہائی تجربہ کار سیاست دانوں کو ایک بار مفت و وزیر اعظم کا مقام دیا گیا ہے۔ سکون و اطمینان کا یہ احساس تلخ اور سر پرستانہ انداز سے خارج ہوتا ہے لیکن یہی احساس برتری اور بڑے پن کے ساتھ دلایا جائے تو پھر ایک دوسری ہی قسم کی ذہنیت کا مظاہرہ ہوتا ہے۔

جنرل ضیاء الحق کے اس رہنمائی کی سنگینی ان کے بعد کے الفاظ میں پائی جاتی ہے۔ مسٹر ماراجی ڈیسائی بھارت کے وزیر اعظم نے پاکستان کے چیف مارشل لائیڈ منسٹر کو بتایا کہ ”ایک مضبوط اور مستحکم پاکستان بھارت کے مفاد میں ہے“ یہ وہ بات ہے جو جنرل ضیاء الحق نے بتائی ہے کہ اُسے مسٹر ڈیسائی نے کہی تھی۔ جنرل نے بات کو بڑھاتے ہوئے کہا کہ بھارتی وزیر اعظم نے اسے کہا کہ ”نہ صرف حکومت بلکہ بھارت کے عوام بھی پاکستان کے ساتھ تعلقات کو معمول پر لانے میں گہری دلچسپی رکھتے ہیں اور وہ کسی طرح بھی نہیں چاہتے کہ پاکستان کی ترقی کی راہ میں کوئی رکاوٹ پیدا ہو“ جنرل ضیاء الحق نے بھارتی وزیر اعظم کے الفاظ بتائے ہیں اور یہ الفاظ اہمیت رکھتے ہیں۔ بلاشبہ یہ الفاظ جو بھارتی وزیر اعظم نے کہے ہیں بہت اہم ہیں۔ لیکن یہ الفاظ انہی کے لئے خوش آئند اور حوصلہ افزا ہو سکتے ہیں، جو ایک بار بھی ڈسے نہیں گئے، کہ دوسری بار شرمسار ہوں۔

اس واسطے سے یہ ضروری ہو گیا ہے کہ سابق صدر رپرڈ نکسن کی یادداشتوں سے بھارتی وزیر اعظم کے ساتھ وائٹ ہاؤس میں ان کی ۹ نومبر ۱۹۷۱ کی ملاقات کا حوالہ دیا جائے۔ آراین کے

نام سے حال ہی میں شائع ہونے والی ان یادداشتوں کے صفحہ ۵۲۵ پر بیان کیا گیا ہے۔

”مسٹر کاندھی نے جس طرح میں ویت نام میں جنگ ختم کر رہا تھا اور جس بہادری سے چین کے ساتھ تعلقات کا آغاز کیا تھا میری بہت تعریف کی ہم نے پاکستان کی مضطرب صورت حال پر بات چیت کی اور میں نے اس پر زور دیا کہ یہ بات کتنی اہم تھی کہ بھارت نے اس سلسلے میں کوئی کارروائی نہ کی جس سے اس بے چینی میں اضافہ ہو سکتا تھا۔ اُس نے بڑے خلوص سے مجھے یقین دلایا کہ بھارت نے کبھی پاکستان دشمن رویہ اختیار نہیں کیا۔“ بھارت نے کبھی پاکستان کی تباہی یا اس کی مستقل معذوری کی خواہش نہیں کی“ اس نے کہا تھا۔ بھارت تو یہ چاہتا ہے کہ وہاں استحکام کی بجلی ہو۔ ہم ہر قیمت پر وہاں جو بحران ہے اُسے ختم کرنا چاہتے ہیں“ بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ جس وقت ہم باہمی گفتگو کر رہے تھے، مسٹر کاندھی اچھی طرح جانتی تھی کہ اس کے جرنیل اور مشیر اس وقت مشرقی پاکستان میں جبری مداخلت کا منصوبہ بنا رہے تھے۔ اور اس کے ساتھ ساتھ مغربی پاکستان پر حملے کے منصوبے بھی بن رہے تھے۔“

اس سے پہلے بھارت کے ایک دوسرے وزیر اعظم نے بڑے خلوص سے یہ کہا تھا کہ بھارت نے جموں اور کشمیر میں رائے شماری کا جو وعدہ کشمیر کے عوام سے کیا ہے وہ پوری دنیا کے ساتھ بھی وعدہ ہے، اسی وزیر اعظم نے جب وائٹ ہاؤس میں آنجنابی صدر جان کینیڈی سے ملاقات کے وقت اعلان کیا تھا ”آمن ہمارے لئے ایک جذبہ اور امنگ ہے“ چند دنوں کے بعد بھارتی افواج پورے جذبے کے ساتھ گوا کی طرف پیش قدمی کر رہی تھیں۔ اور پھر اسی وزیر اعظم نے بڑے جوش و خروش اور شدت سے اعلان کیا تھا کہ بھارت اور چین ”بھائی بھائی“ ہیں۔ اور بھارت چین کے ساتھ کبھی لڑائی نہ کرے گا، کچھ برسوں کے بعد، اس نے اپنے جرنیلوں کو حکم دیا کہ وہ چینیسوں کو نیفا اور لداخ سے باہر ہینک دیں۔ قائد اعظم کی وفات کے ایک دن بعد بھارتی افواج حیدر آباد میں داخل ہو گئیں۔ اس سے پہلے جو ناگڑھ، منکرول اور مناور پر قبضہ کر چکی تھیں۔

افسوسناک تشریحات اور ٹوٹے ہوئے وعدوں کا یہ ایک سو گوارہ کارڈ ہے۔ یہ عظیم پیمانے پر منافقت اور دھوکہ دہی کو سامنے لاتا ہے۔ بھارت نے بھارت مانا اور اللہ بھارت کا جو نعرہ لگایا تھا، وہ ابھی تک اسی صورت میں موجود اور قائم ہے۔ کئی برسوں کی مدت میں بھارت نے پاکستان کو معذور اور ٹوٹنے میں کئی اہم کامیابیاں حاصل کی ہیں۔ پاکستان کی تباہی اور برابری کا عمل بھارت نے بڑی تیزی سے اسی دن شروع کر دیا تھا جب پاکستان معرض وجود میں آیا تھا۔ جب تک کاندھی نے مرزا برت نہ کر لیا بھارت نے پاکستان کے اٹلے منتقل کرنے سے

انکار کر دیا، جب پاکستان نے اپنی کرسی کی قیمت کم کرنے کا نوڈ مختارانہ فیصلہ کیا تو بھارت نے اچانک کسی اطلاع کے بغیر پاکستانی معیشت کو تباہ کرنے کے لئے تمام تجارتی تعلقات ختم کر دیئے۔ بھارت نے پاکستان کے خلاف جس خوفناک جارحیت کا مظاہرہ کیا، اس سے قطع نظر، بھارت کے نظام حیدر آباد نے جو فتنہ ز پاکستان منتقل کرنے تھے اس سلسلے میں کسی ”مروت“ کا اظہار نہ کیا۔ نہ ہی انڈیا آفس لندن کی کتابوں کی تحقیق میں ہی اس مروت کا اظہار ہوا۔ دریائے سندھ کے پانی کے بارے میں معاہدہ ہوا اس میں بھی بھارت نے ایک قطرہ پانی کے لئے بھی مروت اور خوش خلقی، کاثبت نہ دیا۔ بلاشبہ بھارت کے اس وزیر اعظم کے الفاظ استہیابی اہم ہیں جتنے کہ اس سے پہلے کے دو معزز پیدشرو وزراء اعظم کے تھے۔

جنرل ضیا کو یہ مشورہ دینا بہت صاحب ہو گا کہ جو کام کرنے سے فرشتے بھی کتراتے ہیں وہ ان کاموں میں عجلت کا مظاہرہ نہ کریں۔ اس نے جو خوفناک غلطیاں کی ہیں ان کا تحفظ خود علیہ نے فراہم کر دیا ہے لیکن آئندہ کے لئے اسے ایسی ناکامیوں سے روکنا ضروری ہے۔ چونکہ وہ سیاست دان نہیں ہے، اس لئے ایک تجربہ کار سیاست دان کو تو ایک طرف رکھیں، اس نے ایک ہی جھٹکے میں وہ سب کچھ گنوا دیا، جو میں نے افغانستان سے حاصل کیا تھا۔ اس کے علاوہ ملک میں بلوچستان اور صوبہ سرحد میں جو مثبت صورت حال میں نے مستحکم کی تھی، اسے بھی گنوا دیا۔ اس کی ان دو مہیب طاقتوں کی پاکستان کو ناقابل تلافی قیمت ادا کرنی پڑے گی۔ گھنیا قسم کے حربے اختیار کرتے ہوئے جنرل اور اس کے حاشیہ نشینوں نے فرضی ”تفہیہ شقوں“ کا ہر ویسٹ گنڈہ کر کے کشمیر کے مسئلے کو بھی بہت مجروح کر دیا ہے۔ قتل و غارتگری کا یہ وحشیانہ مقصد تھا میں محض یہ دعویٰ نہیں کر جاؤں کہ میں نوے ہزار جنگی قیدیوں کو واپس لایا اور پانچ ہزار مربع میل سے زائد علاقہ بھی واپس لیا بلکہ حقیقت یہ ہے کہ میں نے یہ سب کچھ واپس لے کر دکھا دیا۔ میرا سخت ترہن دشمن بھی میری اس کامیابی سے انکار نہیں کر سکتا، اس سے بھی زیادہ یہ کہ میں نے مجیب الرحمن کو جنگی مقدمے چلانے سے روکا۔ میں جموں اور کشمیر کے حق خود اختیاری کے موقف پر مضبوطی سے ڈھار ہا میں نے شہنشاہ ایران کو روکا کہ وہ بھارت کو دفاعی مورچے تعمیر کرنے کے نام پر راجستھان نہر کے لئے قرضہ نہ دے۔ جی ایچ کیو کے اعتراض کی بنا پر میں نے سال ڈیم کے معاہدے کی تکمیل نہ ہونے دی۔ فرانس کے صدر سے جنرل نے ایک لیون حاصل کیا ہے۔ اگر وہ بھارت جاتا ہے تو جنرل کو وہاں بھارتی وزیر اعظم سے ایک چیکو ملے گا۔

اب یہ وقت آگیا ہے کہ جنرل نے پاکستان میں جو بحران پیدا کیا ہے، اس کے گہرے کنوئیں کے اندر دیکھیں۔ مجھے اجازت دیجئے کہ میں اس بات کو کھرے انداز میں واضح کر سکوں، خود غرضانہ روئے اور طرز عمل بجنہی انتقام نے یہ سارے بحران جنم دئے ہیں۔ آج پاکستان جن

بحرانوں کا سامنا کر رہا ہے یہ ۱۹۷۱ کے بحرانوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ خوفناک اور تباہ کن ہیں۔ معروضی طور پر بات کرتے ہوئے کہوں گا کہ اس وقت حقیقی سیاست اور سیاست کے مطلق، پانچ پڑوسی ملکوں کا گہرا واسطہ بنتا ہے۔ اگر پاکستان عدم استحکام اور گڑبڑ کا اس طرح مستقبل میں شکار رہا تو یہ تصور بھی بہت خطرناک ہے کہ ان پانچ ہمسایہ ملکوں میں سے کوئی ایک پاکستان کو اس صورت حال میں مبتلا دیکھ کر، ہڑپ کر جائے گا۔ یہ انتہائی قسم کی رجاہیت پسندی ہوگی کہ یہ پانچوں ملک تارک الدنیا بن کر دوسری طرف دیکھنے لگیں گے۔ ان میں سے ہر ایک کی فوجی حکمت عملی اور جغرافیائی سیاسی مفادات کا پاکستان سے تعلق ہے، کوئی ملک بھی اسے نظر انداز نہیں کر سکتا، چار اسیارام ملک ویت نام سے زیادہ تباہ کن میدان جنگ بن سکتا ہے۔

۱۷۷۷ء میں اورنگ زیب کی وفات کے بعد وہ عظیم مملکت جس کی بنیاد، باہر نے رکھی تھی، ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہونے لگی، غیر ملکی حملہ آور اس دولت مند مملکت کی دولت پر قبضہ کرنے کے لئے کسی سیز کی طرح یلغار کرنے لگے۔ سابقہ گورنروں، معزول سرداروں اور قسمت کے سپاہیوں نے آزاد ریاستیں قائم کر لیں، اگر اس قسم کی تباہی پنجگیز خان کے وارثوں پر آسکتی ہے تو تاریخ اپنے آپ کو ان کے مقابلے میں کمتر آدمیوں پر بھی اپنے آپ کو دہرا سکتی ہے، پکرا دینے والی بجٹیں، زندہ یا مردہ گھوڑوں کے بارے میں بے کار اور بے معنی ہونچکی ہیں۔ وقت کا گرج چکا ہے۔ ایک بڑے انتشار اور تباہی کو روکنے کا عظیم چیلنج سامنے آچکا ہے زبان درازی، گالیاں اور طاقت کا مظاہرہ، تباہ کن جوابی پیدواری عمل ہو گا، وقت سیاسی استحکام کی پیچ و پکار کر رہا ہے۔ بصیرت اور جائز اجماع کا تقاضا کر رہا ہے۔ فوری تقاضا اور ضرورت یہ ہے کہ مساوات پر مشتمل ایک جامع سیاسی معاہدہ طے کیا جائے، اب وہ لمحہ آچکا ہے کہ پر سکون اور مخلصانہ حاکمیت، کسی حسد و عناد کے بغیر، اپنے بھائیوں میں ہو جائے۔

ضروری ہے کہ مارشل لائی لعنت اور کالک کا یہ کسی تاثیر کے بغیر ختم کر دیا جائے، ایک چمنی سے آگ لگا کر اختیار حاصل کرنے سے اور زیادہ دحواس ہو گا۔ بے بصیرت اور دانش سے کور سے ہونے اور طالع آزمایک بلوچ رہنما پر اپنے آتشیں الفاظ کی بوچھاڑ کر رہے ہیں، میں اس پر بے حد متفکر ہوں، بلاشبہ میں نہ صرف اس آواز سے پریشان ہوں بلکہ اس کے پیچھے جو آوازیں ہیں ان سے بھی سہما ہوا ہوں، لیکن یہ نہیں کہہ رہا کہ ان میں کوئی غیر ملک کا ترجمان اور نمائندہ ہے۔ یہ قطعی طور پر ممکن ہے کہ ہر حدوں کے باہر کے خیالات و تصورات اور سرحدوں کے اندر کے خیالات و تصورات میں ہم آہنگی پیدا ہو جائے۔ اس طرح سے ہی کوئی بین الاقوامی آئیڈیالوجی جنم لیتی ہے اور اس کی وجہ سے ہی جدوجہد زیادہ مؤثر اور طاقتور ہو جاتی ہے، میں نے

جون ۱۹۷۷ء میں پاکستان کی قومی اسمبلی میں یہ کہا تھا کہ اگر پاکستان کو غیر مستحکم کیا گیا تو ایک عجیب عموودی اور افقی پولرائزیشن جنم لے گی۔ افقی پولرائزیشن سے میری مراد صوبائی عصبیت تھی اور عموودی پولرائزیشن سے میری مراد طبقاتی عصبیت تھی۔ اور یہی کچھ وقوع پذیر ہو چکا ہے۔

عظیم ترین کامیابی

جب مجیب الرحمن بولا تو اس نے لاہور میں اپنی سکیم رنجی پیش کی یہ اعلان کرنے کے لئے وہ ڈھاکہ سے لاہور اس وقت تک نہیں آسکتا تھا جب تک دو غیر ملکی طاقتوں کے پروں پر نہ اُڑتا۔ مجیب الرحمن کو گرفتار کر لیا گیا۔ پی این اے کے ساتھی ڈھاکہ میں حکومت کے ساتھ مل گئے، اس کے باوجود سقوط ڈھاکہ ہوا۔ یہ طریق عمل ۱۹۷۱-۱۹۷۰ کے ڈھاکے کے مطابق اب بھی ظہور پذیر ہے۔ یہی عوام دشمن، رکاوٹیں پیدا کرنے والوں کے ساتھ مل گئے ہیں، یہی چیخندوں والوں کا گروہ، یہی غور و فکر کے ”منابع“ اب ”جوڑ توڑ“ کر رہے ہیں۔ اپنے آثار و نشانات اور مشابہت کی بنا پر یہ سکیم بہت شاندار ہے لیکن اس وقت یہ زیادہ خطرناک ہو گئی ہے، عقلمند لوگ ماضی کی غلطیوں اور ماضی سے سبق سیکھتے ہیں۔

لاہور پلان کے دو حصے تھے۔ پہلے حصے پر عمل درآمد ہو گیا میں نے دوسرے حصے کے عمل درآمد کو روک دیا، یہ دفن ہو چکا تھا، لیکن ۵ جولائی ۱۹۷۷ء کی فوجی بغاوت نے اسے زندہ کر دیا، بھوتوں اور آسمیوں کے پیچھے بھاگتا کار ضیاع ہے۔ معالج کو چاہئے کہ وہ پہلے اپنے زخموں کا علاج کرے۔ ۱۹۷۳ کے آئین کو اولوالعزمانہ حب الوطنی کے ساتھ اس کی غیر ترمیمی پاکیزگی کے ساتھ بحال کیا جائے، مکمل اور وسیع تر اجماع سے تقویت رکھنے رہنماؤں کے ساتھ مفاہمت کے دروازے کھولے جائیں، یہی ایک واحد راستہ باقی رہ گیا ہے کہ اس منتشر اور محصور ملک کو بچایا جاسکے جسے بنانے کے لئے لاکھوں انسان خون میں نہا گئے تھے۔

جب میں اس وقت اس موت کی تنگ کو ٹھنڈی کی چار دیواری کے اندر بیٹھا ہوں تو میرا ذہن میرے زندگی کے پردے پر پھیلی ہوئی عوامی خدمات کی جھلکیاں پیش کرتا ہے، میرا ذہن دیکھ رہا ہے کہ کس تیزی سے شاندار سیاسی پیدائش ہوئی تھی۔ انسان انقلاب اور اصلاحات کی طرف بڑھ رہا ہے۔ اپنی اس قید تنہائی میں میں بعض اوقات سوچتا ہوں کہ میں نے ماضی میں دو بار زندگی گزاری ہے وہ مناظر جو میری یادوں کے پردے پر آتے ہیں بہت ہی خوبصورت اور متنوع ہیں۔ میں کئی یادگار لمحوں کو تازہ کرتا ہوں، ملک کی تقسیم، جوانی میں باغیانہ موٹر رزمیاتی جدوجہد، پاک بھارت جنگیں، سیکورٹی کونسل، عظیم انسانوں کے ساتھ ذہانت کی لڑائیاں، اگر مجھے

اپنے ماضی کے اس پورے موزیک سے مجھے اپنی انتہائی اہم اور یادگار کامیابی کے واقعہ کا انتخاب کرنا پڑے تو میں ۱۹۶۵ء کی جنگ میں اپنی کنٹری بیوشن کا حوالہ نہیں دوں گا، نہ ہی اس دو طرفہ مساوی سطح پر خارجہ پالیسی کا آغاز، جو میں نے اپنی قوم کی شان و شوکت کے لئے وضع کی، میں اس وقت کا ذکر بھی نہیں کروں کا جب ۱۹۷۱ء میں میں نے اپنے پارہ پارہ وطن کے ٹکڑے جن کر اسے متحد کیا، نہ ہی شملہ معاہدے کا ذکر کروں گا۔ میں شاید اس خون اور پسینے کا بھی ذکر نہیں کروں گا جو میں نے مساوات اور انصاف پر مبنی ایک معاشرے کے قیام کے لئے بہایا نہ ہی اپنی اُن ان تھک کوششوں کا ذکر کروں گا جو میں نے ان انسانوں کی روحوں کو اطمینان اور چہرے پر مسکراہٹ لانے کے لئے کیں کہ جو انسان موتبخو ڈارو کی تعمیر کے وقت سے تلخ آنسو بہاتے چلے آ رہے تھے۔

موجودہ حالات اور تبدیلیوں کی روشنی میں، جو میری واحد اور سب سے اہم کامیابی، جس کے بارے میں میرا یقین ہے کہ وہ میری پبلک لائف کی تصویر میں سب سے نمایاں رہے گی، ایک معاہدہ ہے جو میں نے گیارہ برسوں کی ان تھک محنت اور مذاکرات اور مفاہمت کے بعد جون ۱۹۷۶ء میں اختتام تک پہنچایا تھا۔ یہ میری سب سے بڑی کامیابی ہے۔ اور اپنے ملک اور عوام کی بقا کے لئے سب سے بڑی عطا ہے۔

۵ جنوری ۱۹۶۸ء کو اپنی اکیس سالگرہ پر مجھے لاڑکانہ سے دو تھکے سٹل۔ ان میں ایک پانچ جلدوں پر مشتمل نیولین یونائیٹڈ کی وہ قیمتی سراخ عمری تھی جو سلون نے لکھی تھی۔ دوسرا تھک ایک سستا پمفلٹ تھا نیولین سے میں نے اقتدار کی سیاست سیکھی اور اس پمفلٹ سے میں نے افلاس کی سیاست سمجھی۔ مؤخر الذکر کا اختتام ان الفاظ پر ہوتا تھا ”دنیا بھر کے محنت کشو متحد ہو جاؤ۔ تمہارے پاس گنوائے کے لئے سوائے زنجیروں کے کچھ بھی نہیں۔ تمہیں پوری دنیا فتح کرنی ہے۔“ بہر حال اس فوجی حکمران ٹولے کے جذبات کے پیش نظر میں بات اس انقلابی نوٹ پر ختم نہیں کروں گا۔ میں اپنی بات جو اہل عمل نہرو کے ان الفاظ پر ختم کروں گا۔ جہاں ان کی کتاب ”سکوری آف انڈیا“ کا اختتام ہوتا ہے۔ یہ آخری کتاب تھی جو انہوں نے آزاد اور جمہوری ہندوستان کی لمان سنبھالنے سے پہلے پبل میں لکھی۔ نہرو نے کتاب کا خاتمہ اوسٹرو سکی کی کتاب ”لوہا کیے پھلتا ہے“ کا ایک حوالہ ہے۔ اس میں کہا گیا ہے۔

”انسان کی سب سے پیاری متاع اس کی زندگی ہے۔ اور چونکہ یہ اُسے صرف ایک بار زندہ رہنے کے لئے دی جاتی ہے۔ اس لئے اسے اس طرح زندہ رہنا چاہئے کہ کبھی اسے اپنے برے اور بزدلانہ ماضی پر غم نہ ہو تاکہ بلامقصد اذیت برداشت کر کے زندہ رہنے کی بجائے مرتے ہوئے یہ کہہ سکے ”میں نے اپنی ساری زندگی اور طاقت دنیا کے اولیں نصب

العین۔ بنی نوع انسان کی آزادی کے لئے وقف کی تھی۔“

ذرائع ابلاغ کس غلط استعمال پر جاری کئے جانے والے اس نام نہاد قرطاس امتض نے انصاف کی راہوں میں انتہائی گھناؤنی مداخلت کی ہے، مارچ/اپریل ۱۹۷۸ء میں شائع ہونے والے اس قرطاس امتض میں اگست ۱۹۷۸ء اور اس کے ایک ماہ بعد کے واقعات بھی جمع کر دیے گئے ہیں۔ بیکہ لغتوں کا پہلا راک شروع ہوا تھا۔

ایک ایسا موضوع جو ذرائع ابلاغ سے تعلق رکھتا ہو اسے حکومت کے گوداموں میں چار طویل مہینوں تک دفن نہیں کیا جاسکتا۔ یہ بے ہودہ فکشن اسی منہارا اور خوبی کا حامل ہے جو اس کے مرتب کی شان کے شایان ہے۔ اس میں بھی ویسے ہی صدائوں کو سنا اور آدھی سچائیوں کو پیش کیا گیا ہے۔ اس میں وہی جھوٹ اور گمراہیاں بھری گئی ہیں۔ اس دستاویز میں وہی یک طرفہ انداز نمایاں اور برتر دکھائی دیتا ہے۔ دستاویز کو توڑا مروڑا گیا ہے۔ اس میں یہ نشانہ بھی دیکھی جاتی ہے کہ کس طرح حقائق کو بدلا اور پگھلا گیا ہے۔ بعض امور میں، صفحات حذف کر کے میرے اور سبٹل نوٹس کو تبدیل کرنے کے لئے دوبارہ ٹائپ کئے گئے ہیں۔ مثال کے طور پر، کسی صحافی یا مصنف کو جماعت اسلامی اور وفاق کے مصطفیٰ صادق سے زیادہ میری سرپرستی حاصل نہیں ہوئی۔ یہ سرپرستی جو اسے ملی آزادانہ اور فیاضانہ تھی۔ وہ مودودی کا کٹر حامی اور جماعت اسلامی کے فلسفے اور اخلاقیات کا کٹر پیروکار ہے۔ اس کا نام سرفہرست آنا چاہئے۔ مجلس شوریٰ کا ایک رکن، جو جماعت اسلامی کی اخلاقیات کا انتہائی وفادار تھا، اسے بھی خدمات کے عوض مناسب سرپرستی ملی۔

آخر پی لین اسے کے یہ صحافی اور پی لین اسے کے ان جرائد کو کیوں حذف کر دیا گیا؟ کیا یہ اس فوجی حکومت اور پی پی پی کا مشترکہ فرض ہے کہ جسمیں پی لین اسے کے صحافیوں کی کوریجشن اور روپے پیسے کے لالچ کو قرطاس امتض میں پیش نہ کیا جائے؟ قرطاس امتض کی نئی جلد پر بھی ایسے ہی تعصب اور عناد کا اطلاق ہوتا ہے۔

مسٹر حامد محمود نے مجھ سے جو واحد اجازت حاصل کی وہ پاک بھارت تعلقات پر لکھنے کی تھی۔ میں نے انہیں بتایا کہ وہ ایک عجیب طرح کی درخواست کر رہے ہیں، کیونکہ پاکستان میں کسی موضوع پر اتنا نہیں لکھا گیا جتنا کہ پاک بھارت تعلقات پر، اس نے کہا کہ ان کے پاس بعض نادر اور نئے خیالات ہیں۔ میں نے اپنے کندھے اچکاتے ہوئے کہا تھا کہ خواہ وہ آئیڈیاز متے ہیں یا پرانے وہ اس کے خیالات ہیں میرے اور میری حکومت کے نہیں، اس لئے مجھ سے اجازت لینے کی کوئی ضرورت نہیں۔ جب میں نے وہ مضمون پڑھا تو اس نے جن نظریات کا اظہار کیا تھا، ان پر حیران ہوا۔ میں نے اپنے ایک رفیق سے کہا کہ میں نہیں جانتا تھا کہ جی معین الدین کی طرح یہ

شخص بھی دل سے ایک یونینسٹ ہے۔

ان دنوں بہت سی ممتاز اور نامور شخصیتوں کو اس طرح گرایا اور ذلیل کیا جا رہا تھا کہ وہ مجھے بھارت کے ساتھ ہمارے تعلقات کے بارے میں عجیب و غریب مشورے دیتے تھے۔ ان میں سے ایک ایک اخبار کا تراشہ لے کر آیا، جس میں وہ بیان تھا جو انہوں نے پاکستان کے خلاف ۱۹۴۵ء میں دیا تھا۔ اس بیان کا لب لباب یہ تھا کہ پاکستان کا قیام قابل عمل نہیں ہے اور اگر یہ بن گیا تو پھر بیس یا تیس برسوں میں یہ ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گا۔ وہ اپنی اس بصیرت اور دانش پر ناز کر رہا تھا۔ پنجاب کے ایک سابق وزیر اعلیٰ سر خضر حیات ٹوانہ نے مجھے بتایا کہ وقت نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ وہ درست تھا اور ”سر پھرے“ غلط تھے۔ سندھ کے ایک سابق وزیر اعلیٰ کے ایک بھائی اور موجودہ حکومت کے ایک حال میں بیٹے والے مشیر، مولانا بخش سومرو نے مجھے کہا کہ پاکستان استغیر فطری تھا کہ خدا بھی اسے چلانے کے قابل نہیں، مفتی محمود نے کہا کہ خدا کا شکر ہے کہ تخلیق پاکستان میں ان کے ہاتھ لٹھرے ہوئے نہیں ہیں۔ مودودی اس فوجی حکمران ٹولے کا پوپ، چار یا پانچ قومیتوں کے نظریے کا مصنف ہے، اس نے اپنی کتاب سیاسی کشمکش میں لکھا کہ قیام پاکستان سے پاکستان کے صوبوں میں قومیتوں کے مطالبے میں شدت پیدا ہو جائے گی۔

جماعت اسلامی نے یہ کتابچہ غائب کر دیا ہے اور اب گردش میں نہیں ۱۹۷۰ء میں جب میں کراچی ضلع بار میں کراچی کے وفد سے خطاب کرتے کیا تو معراج محمد خان نے یہ مجھے دکھایا تھا۔ یہ ایک انکشافات سے بھری ہوئی دستاویز ہے۔ پاکستان کے دو ٹوٹ ہونے کے بعد، محمد اکبر خان گنتی نے کھلے عام بھارت کے ساتھ کینفیڈریشن کا مطالبہ کر دیا، اسی کے بیان پر مناسب بین الاقوامی توجہ دی گئی۔ ایسے ماحول اور ایسے حالات میں جن کا ذکر ہوا ہے کیا مجھ سے یہ توقع ہو سکتی ہے کہ میں نے حامد محمود سے کہا ہو کہ وہ اپنے منتشر اور بے ربط نظریات کو مزید بے ربطی سے لکھیں؟ قرطاس امتض جلد اول میں کہا گیا ہے کہ میں نے مسٹر رفیع رضا سے یہ کہا تھا میرے پاس حامد محمود جیسے لوگوں سے ملنے کے لئے وقت نہیں ہے وہ خود ایسے لوگوں سے ملیں۔ قرطاس امتض جلد دوم میں یہ نشانہ بھی کرنے کی کوشش کرتی ہے کہ حامد محمود میرے استراقب تھا کہ میں نے بہت لوگوں کو چھوڑ کر اسے منتخب کیا کہ وہ ”ہمارے اور عظیم بھارت“ کے ساتھ کینفیڈریشن کے نظریے کو پھیلائیں۔ مصور اپنی کینوس کے لئے رنگ انتخاب کرتا ہے شکاری اپنے شکار کے لئے میدان چنتا ہے۔ اس فوجی حکومت نے مجھے سمار کرنے کے لئے کسے چنا؟ اس نے واضح تضادات اور شدید اور کھردرے تضادات کا انتخاب کیا ہے۔

الطاف گوہر اور اس کے بھائی کے بارے میں بہت کچھ کہا گیا ہے، قرطاس امتض کے

مرتبین سے زیادہ یہ دونوں بھائی جانتے ہیں کہ میں نے ۱۹۵۸ سے ۱۹۶۶ تک ان کے ساتھ کیسا سلوک کیا اور اس کے بدلے میں انہوں نے ۱۹۶۶ سے ۱۹۷۰ تک مجھے کیا دیا۔ وہ سب کچھ جو لکھا گیا، اس کے ساتھ میں نے اس کے بھائی کو ۱۹۷۰ میں ملائیشیا میں سفیر بنایا اور الطاف کوہر کو ”روٹی پلائٹس“ کے لئے ٹھیکے دئے۔ اس نے انتہائی خوشامد انداز میں اظہار تشکر کیا ہارون خاندان کے ساتھ میری وابستگی اور تعلق نیا نہیں ہے۔ سر عبداللہ ہارون اس وقت سندھ یونیورسٹی پارٹی کے وائس پریذیڈنٹ تھے جب میرے والد اس کے صدر تھے۔ اس سے پہلے جب میرے والد سندھ محمدن ایسوسی ایشن کے صدر تھے تب عبداللہ ہارون اس کے نائب صدر میں سے تھے۔ پان امریکن اٹارنٹز کے مسٹر ڈین بہت اچھی طرح جانتے ہیں کہ اگر میں اپنی طرف سے مناسب کوشش نہ کرتا تو یوسف ہارون کو انٹر کونٹینینٹل ہوائی کمپنی شراکت دہی حاصل نہ ہوتی۔ کراچی میں ایک ملاقات کے دوران صدر ایوب نے مسٹر ڈین کو میری موجودگی میں کہا تھا کہ اگر ہارون فیملی کا کوئی بھی عمل دخل ہو گا تو میں انٹر کونٹینینٹل ہوائی کمپنی کی اجازت ہی نہیں دوں گا جب ڈین اٹھ کر چلا گیا تو میں نے صدر ایوب خان کو قائل کیا کہ وہ اپنا ذہن بدل دیں اور یوسف ہارون کو شراکت کرنے دیں۔ وزیر تجارت کی حیثیت سے اس پروپوزیشن کے ساتھ میرا تعلق بنتا تھا اور میں نے بڑی مضبوطی سے قانونی طور پر ہارون کے خلاف جو امتیاز برتا جا رہا تھا، اسے ختم کر دیا، دوسرے ہی دن جب مسٹر ڈین کو اطلاع دی گئی کہ انٹر کونٹینینٹل ہوائی کمپنی کے بارے میں ہارون کی شراکت پر جو اعتراض کیا گیا تھا وہ ختم کر دیا گیا ہے تو وہ بے حد حیران ہوئے۔ وزیر صنعت کی حیثیت سے یوسف ہارون نے میری منظوری سے ہی جنرل موٹرز کو خریدا۔

جنرل حبیب اللہ اور گوہر ایوب جنرل موٹرز کی تصویر میں اس وقت داخل ہوئے جب یوسف ہارون لین دین کے ابتدائی مراحل مکمل کر چکے تھے۔ اقتدار کے اہرام کی چوٹی کے بڑا ڈاور منشا کے مطابق تمام وزیر اور وزارتیں یکے بعد دیگرے جنرل حبیب اللہ اور گوہر ایوب کی پیش کردہ تجاویز کی حمایت کے لئے اپنی اصلی پوزیشنوں کو تبدیل کرنے پر مجبور ہو گئے صرف میں ہی تھا جس نے اپنے اور بینٹل پر پوزل کو نہیں بدلا تھا۔ جب صدر ایوب خان نے کہا کہ میں اس پر ضد نہ کروں تو میں نے ان پر یہ واضح کیا کہ میں نے یہ فیصلہ استحقاق کے تحت کیا ہے میں نے یہ بھی واضح کیا کہ یہ اچھی بات نہ ہوگی کہ ان کا بیٹا کاروبار اور صنعتی ارب پتیوں کے شعبے میں داخل ہو۔

میں نے ”ڈان“ اخبار کو اسے اہم قریبی کے غارتگر ہاتھوں سے بچانے کے لئے ہارونوں کی مدد کی۔ لیکن میرے حکومت سے ٹخنے کے بعد ہارون ٹولے نے مجھے اور میری پارٹی کو نقصان پہنچانے کی ہر کوشش کی۔ ۱۹۷۱ میں اقتدار میں آنے کے بعد میں نے کوئی بدلہ لیا نہ

جوانی کارروائی کی، محمود ہارون اب ایک وزیر ہے اور میں موت کی کونٹھری میں ہوں، اسے مجھ سے اختلاف کرنے کی آزادی ہے لیکن میں جانتا ہوں کہ اگر اس میں اپنے والد کے کیریئر کا ایک ذرہ بھی ہے تو وہ یہ سب کچھ صاف ضمیر کے ساتھ کرنے کے قابل نہ ہوتا۔

یہ مجھ کو الزام لگاتے ہوئے کہ ولی خان کی تقریروں کو ان کے متن سے توڑا پھوڑا اور مسخ کیا گیا، قرطاس ایضاً نے سپریم کورٹ کے فیصلے پر بہتان لگانے میں کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کی، ولی خان کی تقریروں سے تعلق رکھنے والے تمام نوٹس اور حرف برف نوٹس جو صوبائی اور سنٹرل اینٹیلی جنس ایجنسیز نے تیار کی تھیں، سپریم کورٹ نے انھیں کرنے سے انکار کر دیا تھا، سپریم کورٹ نے اس کی کئی ٹیپ کی ہوئی تقریریں سنیں۔ ولی خان کی آواز اونچی، کسی مداخلت اور توڑ پھوڑ کے بغیر تھی۔ میں نے اس کی پوری تقریریں سنی تھیں۔ عدالت نے گواہوں کی شہادتیں قلم بند کیں، جن میں ڈائریکٹر جنرل انٹر سروسز اینٹیلی جنس جو موجودہ سیکرٹری دفاع ہیں بھی شامل تھے۔ سپریم کورٹ نے اس کا ایک گہرا اور جامع قانونی جائزہ لیا تھا۔ ایک جمہوری اور دستوری ملک میں سب سے بڑی عدالت ایسے امور میں سرسری طریقے سے کام نہیں کرتی۔

دوسرے عجوبہ الزاموں میں ایک الزام قرطاس ایضاً نے یہ کہہ کر لکھا ہے کہ، اپوزیشن پارٹیوں اور لیڈروں کی ذلت و رسوائی حکومت کا سسٹم بنا کر مستحکم کی گئی۔ یہ وہ نظام ہے جسے مسٹر بھٹو نے اس ملک میں متعارف کروایا، اسکے ساتھ ساتھ قرطاس ایضاً کہتا ہے ”کسی بھی اپوزیشن پارٹی اور قابل ذکر لیڈر کو بھی نہ بخشا گیا“ خاص مثالیں دیتے ہوئے قرطاس ایضاً بتاتا ہے کہ کالعدم نیشنل عوامی پارٹی ۱۹۷۲ سے ۱۹۷۵ تک، متعدد مواقع پر مسلسل حملوں کا نشانہ بنی رہی، حتیٰ کہ اس پر پابندی لگا دی گئی۔ یہ حملہ اس وقت شروع ہوا جب مسٹر ولی خان اور اس کا خاندان، جس میں ان کے والد خان عبدالغفار خان کو جراحانہ پروپیگنڈہ کا بڑا نشانہ بنایا گیا غور طلب نقطہ یہ ہے کہ وہ کون تھے اور کیوں عبدالغفار خان کو جراحانہ پروپیگنڈہ کا بڑا نشانہ بنایا تھا قائد اعظم کے اس کے بارے میں کیا نظریات تھے؟

پاکستان کے پہلے وزیر اعظم مرحوم لیاقت علی خان نے ۱۹۴۸ کو عبدالغفار خان کی واحد اور آخری تقریر کے بعد دستور ساز اسمبلی سے خطاب کرتے ہوئے کہا تھا؟ ”ہم نے کسی کو مجبور نہیں کیا کہ وہ مسلم لیگ میں شامل ہو جائے۔ ہر شخص کو یہ آزادی حاصل ہے کہ وہ ایسی جس تنظیم کو پسند کرتا ہے اس میں شمولیت کرے۔ جو پاکستان کے مفادات کے منافی عوام نہ رکھتی ہو۔ مسلمانوں نے پاکستان طویل جدوجہد اور ان گنت جانوں کی قربانی دے کر حاصل کیا ہے، ہم سمجھتے ہیں کہ ہر ایسی تحریک کو جو پاکستان کی بنیادی مقصد رکھتی ہو اسے پھیلنے سے دریغ کر کے ہم فرض میں ناکام ہوں گے۔ میں اپنی تقریر صرف ایک شعر پر ختم کرتا ہوں۔

خدا کرے یہ غلط ثابت ہو

نہ وہ بدلے نہ دل بدلا نہ دلکی آرزو پہلی
میں کیسے اعتبارِ انقلاب (آج کل)

(دستور ساز اسمبلی پاکستان - مباحث: جلد اول - ۲۳ فروری ۱۹۷۳ء تا ۲۶ مارچ ۱۹۷۳ء صفحہ ۲۸۳)
مسٹر عبد الغفار خان کے خلاف ”جارحانہ پروپیگنڈہ“ جنہیں اب ”پاکستان کا ایک عظیم عجب وطن“ قرار دیا جا رہا ہے، پاکستان کے صرف آخری وزیر اعظم نے ہی شروع نہیں کیا تھا بلکہ پاکستان کے پہلے وزیر اعظم نے اس کا آغاز کیا تھا۔ آخر دسمبر ۱۹۷۱ء میں میرے اقتدار سے پہلے کئی پاکستان حکومتوں نے عبد الولی خان کو طویل برسوں تک کیوں جیل میں رکھا؟
”پاکستان کے پہلے وزیر اعظم نے اس کے والد کے بارے میں جو کہا تھا اس کی وجہ سے انہیں کبھی معاف نہ کیا گیا۔ جب وہ ۱۷ نومبر ۱۹۷۳ء کو ٹونک میں اپنی تقریر میں مجھے دھمکیاں دے رہے تھے، ولی خان نے کہا تھا۔ ”میں مسٹر بھٹو سے کہتا ہوں کہ تمہارا سر بھی گوشت سے بنا ہوا ہے، گولی کی آنکھ نہیں ہوتی اگر یہ۔۔۔۔۔ ایک لمحے کے سر کو لگتی ہے تو یہ وزیر اعظم کے سر کو بھی لگ سکتی ہے۔ اگر صدر کینڈی اور لیاقت علی خان قتل کئے جاسکتے ہیں تو تم کون ہو کہ زندہ چھوڑ دیئے جاؤ۔ ہم طورخم کی زنجیر وہاں سے اتار کر، مرگھ اور چمن سے بیسکب آباد تک لگا دیں گے۔“

اس تقریر کی ٹیپ ریکارڈنگ اور اس کا تحریری مسودہ، سپریم کورٹ کے سامنے نیشنل عوامی پائی کے توڑنے کے ریفرنس میں آر۔ اے ڈبلیو ۱۹ دسمبر ۱۹۷۳ء میں عیسیٰ خان ڈبٹی ڈائریکٹر اینٹیلی جینس بیورو نے شہادت کے صفحہ ۴۹۱ پر پیش کیا تھا۔

قرطاس امتیض کے مصنفین کو چاہئے کہ وہ ولی خان کے ایسے اشتعال انگیز اور زہریلے بیانات اور تقریروں کے مقابلے میں میرا ایک بیان یا ایک تقریر ہی پیش کرے۔ یہ بات بھی طے شدہ ہے کہ یہ عبد الولی خان تھا جس نے میرے خلاف رسوائی کی مہم اس وقت شروع کی جب میر نے نیپ کے گورنروں اور نیپ کی حکومتوں کو صوبہ سرحد اور بلوچستان میں قائم کیا تھا۔

ولی خان کی موجودہ مارشل لا حکومت کے ساتھ اعانت، جو اگرچہ مختصر رہی کی وضاحت ان کے اس انٹرویو کے حوالے سے ہو سکتی ہے جو انہوں نے پیپلز فرنٹ لنڈن کو دیا۔ (جسے پاکستان ٹائمز لاہور نے ۲۸ دسمبر ۱۹۷۳ء کو نقل کیا تھا) جس میں انہوں نے کہا تھا۔ اگر میں کسی طرح بھٹو سے چھٹکارا حاصل کر سکوں اور کوئی مدد کے لئے تیار ہو اور میری مدد کرے تو خواہ وہ خود شیطان ہی کیوں نہ ہو، میں اس کے ساتھ ہاتھ ملاؤں گا (ضمیمہ ای۔ ۳۷۔ تیسرا حصہ۔ صفحہ ۲۳۰)

نیپ ریفرنس۔ سپریم کورٹ)

قرطاس امتیض مزید یہ الزام لگاتا ہے کہ مسٹر بھٹو نے جعلی تقریر تیار کر کے اسے مسٹر عبد

الولی خان کے نام منسوب کیا، مثال کے طور، قرطاس امتیض میں کہا گیا ہے۔
”حتیٰ کہ جعلی رپورٹیں تیار کر کے اس کے نام سے منسوب کی گئیں۔ وہ بیان جس میں مسٹر ولی خان نے اگر پاکستان کی مزید توڑ پھوڑ ہوئی تو ”ہم ہارنے اور گنوائے والوں میں نہیں ہوں گے ایسی صورت میں ہم سرحد کو طورخم سے ایک پل تک تبدیل و منتقل کر دیں گے۔ ایک ایسا ہی جھوٹا اور بنایا ہوا بیان تھا۔ مسٹر ولی خان کے بارے میں ”رپورٹ“ دی گئی تھی کہ انہوں نے ۱۹ اکتوبر ۱۹۷۳ء کو چوک یادگار پشاور کے جلسے میں اپنی تقریر میں یہ بیان دیا تھا ”نیوز ایجنسیاں اسے پنی پی پی اور پی پی آئی، جن کے بارے میں مفروضہ ہے کہ آزادانہ کام کرتی تھیں، دونوں نے اس خبر کو بے حد مشابہ اور یکساں زبان میں جاری کیا اور قومی پریس نے اسے سرکاری ایڈوائس کے تحت اگلے دن شائع کیا۔ واحد استثنا تو اسے وقت کا ہے جو مسٹر ولی خان کا پھر وہ نہیں ہے۔ جس نے اپنے غایتند سے کی رپورٹ شائع کی۔ نوائے وقت کی خبر میں سرحد کی منتقلی اور تبدیلی کا کوئی ذکر نہیں ملتا۔ ۲۵ اکتوبر کو خود مسٹر ولی خان نے اس کی تردید یہ کہتے ہوئے کی کہ انہوں نے ایسا کوئی بیان نہیں دیا۔ لیکن اس تردید کو دبا اور قتل کر دیا گیا۔ پھر شاید نوائے وقت ہی تھا جس نے یہ تردید شائع کی تھی۔“

”اسی مہینے مسٹر ولی خان کو ایک بار پھر ایک دوسرے من گھڑت جھوٹ کا نشانہ بنایا گیا۔ یہ کہانی پہلی بار ۱۰ اکتوبر کے روزنامہ مشرق، پشاور میں شائع کی گئی، جس میں یہ کہا گیا کہ ولی خان نے چار سہ مہینے عید کے موقع پر کہا ”ایک نیا ملک جو صوبہ سرحد، بلوچستان اور افغانستان پر مشتمل ہو بجا معرض وجود میں آئے گا۔ اور بارڈر لائن طورخم سے ایک کے پل تک منتقل نہیں کی جائے گی بلکہ مرگھ نزد راولپنڈی سے شروع ہوگی۔ بعد میں اس رپورٹ پر مشتمل ایک خبر پی پی آئی کے ذریعے قومی پریس میں اشاعت کے لئے جاری کی گئی۔“

”یہ من گھڑت جعل سازیاں دراصل مسٹر بھٹو کے اس جارحانہ پروپیگنڈے کا حصہ تھیں جو وسط ۱۹۷۳ء میں مسٹر بھٹو کی ہدایت پر اس لئے شروع کیا گیا تھا کہ رائے عامہ کو مسٹر ولی خان اور ملک کے دوسرے رہنماؤں کی گرفتاری کے لئے ہموار کیا جائے، مسٹر بھٹو نے مسٹر ولی خان کے ”۱۹ اکتوبر“ بیان پر مشتمل ایک طویل نوٹ لکھا جس میں انہوں نے نیپ کی قیادت کو پاکستان اور ریاست دشمن، بنا کر پیش کیا اور وزارت اطلاعات کو ہدایت جاری کی کہ ”مسٹر ولی خان، ارباب سکندر خان اور افضل خان کی گرفتاری

ٹرانسکریپٹ کے مطابق (ایگزٹ آر - ایس ڈیلیو ۱۰/۱) جسے متعلقہ اتھارٹی کے گواہ نمبر ۱۰ جلیل الرحمن نے تیار کیا تھا، یہ بیان کیا گیا ہے کہ خان نے کہا ”ایک نیاملک جو صوبہ سرحد، بلوچستان اور افغانستان پر مشتمل ہو گا، معرض وجود میں آئے گا اور اس کی بارڈر لائن طور خم سے انک کے پل پر منتقل نہیں کی جائے گی بلکہ یہ مرگھ پہاڑیوں کے آس پاس، راولپنڈی کے نزدیک ہوگی۔ مزید برآں اس نے پختون زلمہ - نیپ کے ساتھ منسلک عسکری تنظیم کو اپنی تقریر میں یہ مشورہ دیا کہ وہ اپنے آپ کو اب مزید گرفتاروں کے لئے پیش نہ کریں۔ اور اس پر اضافہ کیا ”اب ہم زیادہ دیر تک محب وطن ہونے کے دلائل اور ثبوت پیش نہیں کریں گے۔ ہم گزشتہ پچیس برسوں سے زائد عرصے میں ثبوت پیش کرتے رہے ہیں“

اس سے بھی پہلے ۱۴ اکتوبر ۱۹۷۳ کو نوشہرہ میں تقریر، (بحوالہ ٹرانسکریپٹ ایگزٹ آر - ایس ڈیلیو ۱۹/۲) کرتے ہوئے انہوں نے کہا تھا ”اگر پاکستان تباہ ہوتا ہے تو ہم تباہ نہیں ہوں گے، ہم چین سے زنجیر بنا کر سندھ کی سرحدوں اور طور خم سے مارگلہ تک لے جائیں گے اس جگہ انہوں نے اپنے سامعین کو یہ بھی بتایا ”اب سیاست ختم ہو چکی ہے، اور لوگوں کو بھڑکایا کہ ”سیاسی امور کے تصفیے کے لئے ہتھیار اٹھائیں“ اپنی اس دھمکی کو کہ زنجیر کو چین سے جیکب آباد اور طور خم سے مارگلہ تک لے جائیں گے، انہوں نے اپنی ۱۷ ستمبر ۱۹۷۳ کو ٹونک کی تقریر میں بھی دہرایا (بحوالہ ٹرانسکریپٹ ایگزٹ آر ایس ڈیلیو ۱۹/۱۵) اور پھر چوک یادگار مورخہ ۷-۱۰-۱۹ (ٹرانسکریپٹ ایگزٹ آر ایس ڈیلیو ۱۹/۴) اور نیپ ریکارڈ ایگزٹ ۱-۱۹/۱۹) اور پھر چوک یادگار مورخہ ۷-۱۰-۱۹ (ٹرانسکریپٹ ایگزٹ آر ایس ڈیلیو ۱۹/۵) اور نیپ ایگزٹ آر ایس ڈیلیو ۱۹/۲ (۳) اور مسجد غازی گل بابا چار سہ سورہ ۲۸ اکتوبر ۱۹۷۳ (ایگزٹ آر ایس ڈیلیو ۲۸/۲) میں بھی وی خان نے یہ کہا کہ اگر بلوچستان اور شمال مغربی سرحدی صوبے کے لوگوں اور عوام کو ان کے حقوق نہ دئے گئے تو وہ پاکستان کے ٹکڑے ٹکڑے ہونے کے ذمے دار نہ ہوں گے۔

یہ تقریر جو یکم نومبر ۱۹۷۳ کے نوائے وقت میں بھی شائع ہوئی ہے اس میں مسٹر وی خان کا یہ بیان بھی شامل ہے - ”اب پختون اور بلوچ اپنے حقوق کا تحفظ طاقت استعمال کر کے کریں گے“ ایسے امور میں وی خان کا دفاع کرتے ہوئے قرطاس ایض اس کے دفاع کی کوشش کر رہا ہے جس کا دفاع نہیں کیا جاسکتا۔ مزید برآں اگر انتہائی اہمیت کا مسئلہ ہے کہ یہ پوزیشن اختیار کرتے ہوئے موجودہ فوجی حکومت سرکاری طور پر چار قومیتوں کے نظریے کی حمایت کرنے لگی ہے - میں نے جعلی اور من گھڑت بیان کیا رکھنے کی بجائے انہیں وی خان سے منسوب کیا اس کا یہ

کے لئے انفارمیشن میڈیا کے ذریعے ”مضبوط اور ہموار زمین تیار کریں“

”فروری ۱۹۷۵ میں مسٹر حیات محمد خان شیر پاؤ کے قتل کے بعد نیپ کی قیادت کے خلاف یہ مہم اپنے عروج پر پہنچ گئی۔ مسٹر وی خان اور نیپ کے دوسرے رہنما گرفتار کر لئے گئے اور نیشنل عوامی پارٹی کو غیر قانونی قرار دے کر اس پر پابندی لگا دی گئی، اس قتل کی ”پروویکشن“ افغان حکومت اور نیپ کی ملی جھگڑ اور سازش بنا کر کی گئی کہ اس طرح صوبہ سرحد میں سب سے اہم اور طاقتور حریف کو اپنے دائرے سے ہٹا دیا جائے۔ اس پابندی پر ایک ریفرنس سپریم کورٹ میں پیش کیا گیا۔ جسے مسٹر وی خان اور نیپ کے باقی ماندہ رہنماؤں کے خلاف میڈیا کے ذریعے ایک زبردست مہم چلایا گیا۔“

”جب سپریم کورٹ نے اس پابندی کو بحال رکھنے کا فیصلہ دیا تو پابندی کے اعلان کے ساتھ ہی وزارت اطلاعات نے خصوصی دستاویزات و وسیع تر تقسیم کے لئے شائع کیوں۔“

تصعب سے اندھے اور میرے خلاف کیئے اور عناد کی نہ بچنے والی پیاس رکھنے والے قرطاس ایض کے مصنفوں نے ان پانچ نیپوں کی شہادت اور ثبوت کو دیا ہے جو پختونوں میں وی خان کی تقریروں پر مبنی تھیں۔ یہ پانچوں نیپیں سپریم کورٹ میں چلائی اور سنی گئی تھیں۔ ان نیپوں کے ٹرانسکریپٹس ان گواہوں نے پیش کئے تھے - جنہوں نے یہ تقریریں سنیں اور ریکارڈ کی تھیں، جن میں وی خان نے یہ کہا تھا کہ زنجیر طور خم سے انک کے پل مرگھا اور چین سے جیکب آباد منتقل کر دی جائے گی۔

اپنے اس فیصلے میں سپریم کورٹ (پی ایل ڈی ۱۹۷۶ - سی ایس ۵۷) نے کہا تھا -

”جہاں تک مسٹر عبد الولی خان کا تعلق ہے، فاضل اتارنی جنرل نے ہمارے سامنے اس تقریر کا ٹرانسکریپٹ پیش کیا جو انہوں نے ۲۱ ستمبر ۱۹۷۳ کو کی تھی۔ (ایگزٹ آر - ایس ڈیلیو ۱۹/۱۶) یہ ثابت کرنے کے لئے پیش کیا کہ جب وی خان سے یہ کہا گیا کہ وہ بعض افغان وزیروں نے جو بیانات پاکستان کے خلاف دئے ہیں، اس سے اختلاف کریں تو انہوں نے یہ بات نظر انداز کر دی۔ حقیقت میں یہ کہا جاتا ہے کہ مختلف اوقات میں انہوں نے اپنے تحریری بیانات میں، ڈیورنڈ لائن کے بارے میں افغان حکومت کے پاکستان کے خلاف بیانات کی حمایت کی اور افغان حکومت کے اس دعوے کی بھی حمایت کی جس میں انہوں نے صوبہ سرحد اور حتیٰ کہ پنجاب کے حصوں پر بھی مشتمل

علاقوں کو افغانستان کا ایک لازمی جزو قرار دیا تھا“

اس کے بعد صفحہ ۱۲۲ پر اس فیصلے میں کہا گیا ہے - -

”۲۸ اکتوبر ۱۹۷۳ کو، عید کے ایک اجتماع سے چار سہ میں خطاب کرتے ہوئے،

نام نہاد پبلٹی میری بیوی کو دی گئی وہ اسکے لائق نہیں تھی، ٹھیک ہے اگر اس طرح آپکو مسرت ہوتی ہے تو میری بیٹی آکسفورڈ یونین کا صدر منتخب ہو کر پاکستان کے لئے اعزاز کا سبب نہ بنی تھی۔

میرے عہدیدار اور عمال بھی چاہتے تو وہ نیوزویک، سے ایک کور سنوری پاکستان کے لئے لکھوا سکتے تھے۔ لیکن یہ بات اپنی جگہ بہت اہمیت رکھتی ہے کہ پاکستان پر کور سنوری لکھنے کی ہند رنج رضامندی کے باوجود، مارچ ۱۹۷۷ء کے انتخابات کے بعد نیوزویک نے اپنا ذہن آخری لمحے تبدیل کر کے کسی بھی ظاہر واری کی وضاحت کے بغیر ۵ جولائی ۱۹۷۷ء کی فوجی بغاوت کے فوراً بعد اسی میگزین نے جنرل ضیاء الحق کو اپنے سرورق پر رکھ دیا۔

دوسرے قراطیس ایٹش کے مطابق میں اپنے انج کو تعمیر کرنے کے واسطے میں مبتلا تھا کہ میں ایک ”غیر ممتاز“ بے مثل اور اپنے ملک کا عظیم ترین رہنما بلکہ ایشیا اور اس کے بعد لازماً تیسری دنیا کا سب سے بڑا رہنما ہوں۔ اس تہمت کا جواب دینے کا سزاوار نہیں ہوں، اس کے برعکس یہ حکومت وحشی جنگجوؤں کی طرح نہ صرف میری انج کو تباہ کرنے کی کوشش کر رہی ہے اور پاکستان کے عوام کے علاوہ پوری دنیا میں ایک وہیلن کی حیثیت سے پیش کر رہی ہے۔ میں نے اپنا بہترین کام کیا اور اس حکومت نے اپنی بدترین کوشش کی اور ایک برس سے زیادہ میرے نام کو رسوا اور داغدار کرنے کی ناقابل بیان جفاکشی کا مظاہرہ کرنے کے بعد کیا اس فوجی حکومت یہ حوصلہ کرے گی کہ ایک ریفرنڈم میرے اور اپنے اوپر کرائے۔ سینرز یا بروئرس؟ آئیے لوگوں کو فیصلہ کرنے دیں کہ مقدس کائنات کون ہے؟

نتیجہ

۱۱ اگست ۱۹۷۷ء کی جب آدھی رات کا بھر بجا تو برصغرو حصوں میں تقسیم ہو گیا ایک ہندوستان جو ایک بھارتی اور دوسرا پاکستان۔ بھارت نے ۱۹۵۱ء میں اپنے وفاق کے دائمی اتحاد اور پائیدار مقصد کے لئے اپنے لئے سب سے افضل و برتر قانون وضع کیا یعنی بھارت کا آئین۔ اس کے پانچ سال بعد پاکستان نے ۱۹۷۳ء کے ہندوستان کی آزادی کے ایکٹ کی جگہ اپنا آئین نافذ کیا۔ اور ۱۹۷۵ء کے ترمیم شدہ گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کو پاکستان کے اتحاد و سلامتی کے لحاظ سے طور پاکستان کا بنیادی قانون بنایا۔

مارشل لا نافذ کر کے ۱۹۷۱ء کا آئین منسوخ کیا گیا تو اس سے پاکستان کے اتحاد کی بنیادیں بل گئیں۔ ۱۹۶۲ء کا آئین ایک دوسرے ملا شمل لائے گئے فریجے ۱۹۶۹ء میں منسوخ ہوا تو اس کے دو سالوں کے اندر اندر پاکستان دو تخت ہو گیا۔ نہ ہی ۱۹۵۶ء اور نہ ہی ۱۹۶۲ء کے آئین ملک کے حقیقی

بیان کہ ایک نیا ملک معرض وجود میں آ رہا ہے۔ (عظیم تر افغانستان جس میں پاکستان کے حصے بھی شامل ہوں گے) قانون شہادت کے مطابق سپریم کورٹ کے سامنے ثابت ہو گیا تھا۔ آکسفورڈ کے میگزین ”راؤنڈ ٹیبل“ ۱۹۷۱ء میں لکھا گیا، مطبوعہ ۱۹۷۲ء میں بھی ثابت ہو گیا تھا اور ولی خان نے بھی اس کی تردید نہیں کی۔ اس مضمون میں مشرولی خان نے ہنگامہ دیش کی علیحدگی کے بعد پاکستان کی بہت طریقوں سے توڑ پھوڑ کی پیش گوئی کی تھی۔ سپریم کورٹ نے متذکرہ فیصلے کے صفحہ ۱۳۸ پر مندرجہ بالا مضمون کے حوالے سے کہا تھا۔

”اس مضمون کے مصنف، جسے سپریم کورٹ وزارت اطلاعات و نشریات حکومت پاکستان مشر نسیم احمد (آر اے ۱۵ یو ۱۵) کی زبانی کوای اور تحریری تصدیق جو اس رسالے کے ایڈیٹر نے کی، سے بلاشبک وشبہ ثابت ہو گیا ہے کہ مشر ولی خان مصنف تھے۔ اس مضمون میں انہوں نے یہ نظریہ پیش کیا کہ ہندوستان کو تقسیم کر کے برطانیہ نے غلطی کا ارتکاب کیا ہے۔ کیونکہ اس طرح انہوں نے وہ تمام اچھے کام تباہ و برباد کر دیئے جو انہوں نے ایمپائر کے معماروں کی حیثیت سے دو سو سال سے بھی زیادہ عرصہ میں کئے تھے۔ مشر ولی خان نے یہ رسالے بھی دی کہ اسے (تقسیم) ختم کر کے پچھانوں (پختون پاشتون) کو دوبارہ متحد کر کے ایک عظیم تر افغان حکومت وجود میں آ رہی ہے۔ اس حوالے کی اہمیت اس نکتہ پر اصرار ہے ”تقسیم ختم کر کے“ اور جس کے نتیجے میں ”ایک عظیم تر افغان حکومت“ کا ظہور۔۔۔ کیا یہی پختونستان، کاموقف نہیں ہے؟“

سپریم کورٹ کا فیصلہ اب بھی قائم ہے اور ابھی اس پر نظر ثانی نہیں کی گئی۔ اسی لئے موجودہ حکومت اس کی پابند ہے، اور اسی حوالے سے قراطیس ایٹش کے مصنفین یا کوئی اور شخص اگر محض اور اسی طرح قراطیس ایٹش کا ہر حصہ جھوٹے حاسد اور سپریم کورٹ میں اپیل کے خلاف تعصب پیدا کرنے والے ثابت کئے جاسکتے ہیں، عصر رواں کی تاریخ میں کسی حکومت نے سرکاری ذرائع ابلاغ کو ایسی بے رحمی اور شدت سے استعمال نہیں کیا، جیسے پاکستان کی موجودہ فوجی حکومت اسے اپنے واحد سیاسی ہدف ذوالفقار علی بھٹو اور اس کی کردار کشی کے لئے استعمال کر رہی ہے۔ اور کسی حکومت کو اس بری طرح اپنے مقصد کے حصول میں ایسی ناکامی نہیں ہوتی جیسی اس فوجی حکومت کو ہوئی ہے۔

اس قراطیس ایٹش کے مصنف اور ان کے پیچھے افراد ہیں جنہوں نے بھدی اور گندی ذہنیت کا اظہار، انتہائی فطری اور بے ضرور واقعات اور حالات کو گمراہ کن انداز میں مسخ اور توڑ مروڑ کر کے کیا ہے، اس کے مرتبین نے جو نتائج نکالے ہیں وہ انتہائی صدمہ پہنچانے والے اور بعید از قیاس ہیں، اسی کے بعض حصوں میں ان کا زہر نہ صرف میری ذات بلکہ میرے خاندان کے خلاف بھی انتہائی بدبودار اور غلیظ ہو گیا ہے، ٹھیک ہے اگر آپ اسی طرح خوش ہوتے ہیں تو جو

اور کامل معیار کے نامائندہ آئین تھے۔ کیونکہ ان میں سے کسی ایک کو بھی خود مختار اور نامائندہ اسمبلیوں نے تشکیل نہیں کیا تھا۔ اس لئے یہ مشکل ظاہر آئین تھے تاہم ان کی منسوخی نقصان دہ ہونے کے باوجود مکمل تباہی کے جراثیم سے خالی تھی۔

صرف ۱۹۷۳ کا آئین ہی یہ نمایاں وصف رکھتا ہے کہ وہ جائز انٹیلی اور کامل نمونے کا تھا۔ اسے خود مختار اور نامائندہ اسمبلی نے متفقہ طور تشکیل دیا تھا۔ اپنی اسی بدیہی وجہ سے، جبکہ اس سے پہلے کہ دونوں آئین مارشل لاء نے منسوخ کر دئے تھے۔ مارشل لاء ۱۹۷۳ کے آئین کو منسوخ نہیں کر سکا۔ یہ ایک دوسرا موضوع ہے کہ ایک قانونی تغیر کے مارشل لاء کا نفاذ خود بخود آئین کو منسوخ کر دیتا ہے کیونکہ دونوں ایک ساتھ زندہ نہیں رہ سکتے۔ سو فطائیت کی اس متحہ سے یہ دھوکہ دے کر یہ دونوں باہمی طور پر زندہ رہ سکتے ہیں، تو اسے ان بار بار دہرائی جانے والی خلاف ورزیوں نے، ان شرائط کو باطل کر دیا ہے جو سیکم نصرت بھٹو کیس میں سپریم کورٹ نے عائد کی تھیں۔ معترض قسم کے شہادت کو اگر وہ کسی قسم کے تھے تو انہیں ۱۳ ستمبر ۱۹۷۸ کے اعلان نے ختم کر دیا ہے جو تعلق پاکستان کے ٹھیک تیس برس اور ایک ماہ بعد کیا گیا ہے۔ اس اعلان میں بتایا گیا ہے کہ چیف آف آرمی سٹاف ۱۶ نومبر ۱۹۷۸ کو صدر پاکستان کا لبادہ پہن لے گا۔ آئین رہنما اس نے یہ غابت کرنے کا عزم کر رکھا تھا کہ چیف آف آرمی سٹاف کی کرسی پاکستان میں سب سے زیادہ مضبوط ہوتی ہے۔ شاندار بات! لیکن اب کون ایسی بے باکی سے کہہ سکے گا کہ ۱۹۷۳ کے آئین میں اب بھی کچھ سرائس باقی رہے ہو دیے گئے ہیں۔

پاکستان کو ایک ”جانورستان“ (اینیمل فارم) بنا دیا گیا ہے اور اس کے بدبخت اور خدا ترس انسانوں کو گندے جانوروں کی حالت تک پہنچا دیا گیا ہے۔ خواہ کچھ ہو جب گندے جانوروں میں بھی یہ احساس پیدا ہو جائے کہ وہ کہاں کھڑے ہیں تو ان میں حوصلہ اور جرأت پیدا ہو جاتی ہے۔ افغانستان کا عظیم کھیل ۲۸ اپریل ۱۹۷۸ کو ختم ہو گیا تھا تاہم یہ غفلت کی بات ہوئی کہ ابھی سے کھیل کے بارے میں کوئی تاریخی فیصلہ دیا جاسکے کہ یہ کھیل عظیم ہے یا پست، جو ۱۶ ستمبر ۱۹۷۸ کو ختم ہونے والا ہے۔ اور ”آخری چوکی“ کی کھینچا تانی پر یہ دن بکل بجائے گا وہ ہے۔

اس سے پیچھے مڑ کر یہ بھی دیکھا جائے گا کہ ۱۹۷۷ کی جبری فوجی بغاوت ایک عظیم جارحیت تھی۔ لیکن تاریخ کی ایف آئی آر میں ۱۹۷۳ کے آئین کی تدفین کو بہت بڑی جارحیت کی حیثیت سے رجسٹر کیا جائے گا۔ ستمبر ۱۹۷۸ کا سولہواں دن، ۱۰ مئی ۱۸۵۷ اور ۴ اگست ۱۹۴۷ سے کم تر اہمیت کا نہیں ہو گا۔ بلاشبہ، اپنی بد نصالی کے ساتھ ظالم تاریخ کے کٹھن سے میں ہڑا ہو گا۔ ”انسانی تاریخ میں ایک چیز استقامت کی طرح ہوتی ہے۔ اور اسی تاریخی استقامت کا یہ اصول ہے کہ اسکا شکار بیشہ ظالم ہی ہوتے ہیں۔ مظلوم نہیں“